

اگست 2018

ماہنامہ
کرین

ماہنامہ

کرین ماہنامہ



اگست کا مہینہ ہمارے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس ماہ ۱۴ اگست کو ہمارا وطن عزیز مغربی دور

اس وطن کے قیام میں ہمارے بزرگوں کی لازوال قربانیوں کی داستانیں رقم ہیں۔ ہماری آزادی کا ہر باب

قرون سے لگے ہے۔ آزادی قربانی کا نام ہے۔ حصول پاکستان کے لیے جس قدر محنت اور جدوجہد کی گئی پاکستان

کے قیام کے بعد ہمیں لاکھوں لوگ اپنی جان کا نذرانہ دے چکے ہیں۔

لوگ آزادی، جدوجہد و قہر کا دن کہیں اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عطا کی اس کی حفاظت کریں۔ اس کی توجہ دینی

کے لیے محنت اور کوشش کریں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے گئے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اس مقدس

امانت کو امن اور خوشیوں کا گہوارہ بنائیں۔ ہر طرح کے تعقیبات سے بالاتر ہو کر باہمی رواداری اور جذباتی فحشیت

تحت سے پاکستانی نہیں۔ یہی ترقی اور ترقی میں مافی کا راستہ ہے۔

اگست کے پہلے میں عبداللہ علی کا دل ہے۔ عبداللہ علی قربانی کے ایک عظیم ترین واقعہ کی یاد میں منائے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنے عزیز ترین بیٹے کو قربانی کے

لیے پیش کر دیا۔ یہ فطرتِ قربانی کا سب سے بڑا سبق ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ سب سے افضل ہے۔

اگست ۱۹۴۷ء اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اسی چند دنوں پہلے ہم ایک جمہوری عمل سے گزرے ہیں

اور اپنی نئی قیادت منتخب کی ہے۔ عوام ہی کسی مذہب معاشرہ کی قوت ہوتے ہیں۔ جو کسی سوچ فکر کے تحت

دور کی طاقت سے متقبل کے فیصلے کرتے ہیں۔ جمہوری عمل کا فلسفہ یہی قوموں کو مرد و دہا ہے۔

محمود خاوری کی برسی

کچھ لوگ دل پر ایسے نقش چھوڑ جاتے ہیں جیسا پر وقت کسی اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ محمود خاوری بھی ایسی ہی شخصیت

کے ایک تھے۔ لوگوں کو ہمیشہ ان کی برسی یاد کرتے۔ مگر وہ آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہیں۔ ۲۵ اگست

کو ان کی برسی کے موقع پر تارکین سے ڈھلے مغز کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں

- ۱۔ نذرانہ عقیدت مقام عالم ۱۴ اگست کے حوالے سے شاہین رشید کا خصوصی سروے،
- ۲۔ اداکار شائل خان سے شاہین رشید کی ملاقات،
- ۳۔ فن کار عالم محمود، کہتے ہیں "میری بھی شہرہ"،
- ۴۔ اس ماہ صائمہ، کے مقابلے میں آج،
- ۵۔ شبِ فم کی سحر خیز، جی ہدیٰ کا نیا سلسلہ وار ناول،
- ۶۔ ہوائیں برف بدل گئیں، گلست عبداللہ کا سلسلہ وار ناول،
- ۷۔ اذیت، عشتیٰ صائمہ قریح کا ناول،
- ۸۔ گنجینہ سلیب کا ناول، "آزادی فتح"،
- ۹۔ منشاخص علی کا ناول، "میں تارا اور ایک نئی کرب"،
- ۱۰۔ تنہا راجن کا ناول "عزیزے یا غریبے تیرے"،
- ۱۱۔ "میں واری جاؤں" دہخا کا ناول،
- ۱۲۔ "میں واری جاؤں" دہخا کا ناول،
- ۱۳۔ "میں واری جاؤں" دہخا کا ناول،
- ۱۴۔ "میں واری جاؤں" دہخا کا ناول،
- ۱۵۔ "میں واری جاؤں" دہخا کا ناول،
- ۱۶۔ "میں واری جاؤں" دہخا کا ناول،
- ۱۷۔ "میں واری جاؤں" دہخا کا ناول،
- ۱۸۔ "میں واری جاؤں" دہخا کا ناول،
- ۱۹۔ "میں واری جاؤں" دہخا کا ناول،
- ۲۰۔ "میں واری جاؤں" دہخا کا ناول،

محفل

گرمی کا دتر خان، کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت مامل کریں۔



یارب نفس نفس میں ہے پنہاں تریاں
دنیا کا ذرہ ذرہ کرے دو ترا نام

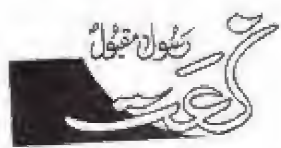
تیرے ہی نور سے ہیں فروزاں مہ و نجوم
روشن ہے آفتاب ہے درخشاں مہ تمام

سیراب سب ہوئے تیرے زمزم کے فیض سے
نوٹا نہیں ہے در سے کوئی تشہ کام

مل جائے مجھ کو ایک سجدہ نصیب سے
گھر میں ترے جہاں ہے ابراہیم کا مقام

کر لے قبول ساری دعائیں جو دل میں ہیں
نینال یہاں سے جائے گی برگزینہ تشہ کام

فرزانہ نینال



آئینہ در آئینہ ہے سلسلہ در سلسلہ
نور حق جلوہ نما ہے سلسلہ در سلسلہ

ہر کتاب آسمانی اور صحیفوں میں شہا
آپ ہی کا تذکرہ ہے سلسلہ در سلسلہ

اس کی ضو میں منعکس ہے تو ختم المرسلین
جو دیا اب تک جلا ہے سلسلہ در سلسلہ

جز تمہارے اے شہد دنیا و دیں کو نہیں
کون محبوبِ خدا ہے سلسلہ در سلسلہ

کیوں نہ ہو باد صبا کی ہنر خوش خیال
جب درودوں کی صدائے سلسلہ در سلسلہ

احمد خیال

14 اگست، آزادی کے خوب صورت احساس کے ساتھ اس دن کا آغاز ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے اس دن کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا ان کے لیے یہ دن کتنا اہم ہوگا۔ مگر جن لوگوں نے اس کی تاریخ پڑھی ہے یا ہماری نوجوان نسل جنہوں نے اپنے بزرگوں سے اس دن کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوگا انہیں یہ دن منانا کیسا لگتا ہے..... کیا بہت اچھا یا شرمندہ شرمندہ سا کہ ہم نے ان 70 سالوں میں کیا حاصل کیا، بہت کچھ پایا..... یا بہت کچھ کھوایا.....؟

سوال یہ ہے کہ

(1) ”آپ 14 اگست کو کس طرح سلیپر یت کرتے ہیں؟“

(2) ”کیا اس دن اپنے ملک کا موازنہ دوسرے ملک سے کرتے ہیں۔“ ہاں ”تو کیا احساسات ہوتے ہیں اور ”نہیں“ تو کیوں نہیں؟“

تذاتہ عقیدت اور مقامِ عالم

شایین رشید

بہار ہو، اور شاعری کی شکل میں کچھ اشعار لکھ کر پاک وطن کو خراج تحسین پیش کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ بچے گھر کو جھنڈیوں سے سجاتے ہیں اور کوشش ہوتی ہے کہ اپنے لفظوں سے اپنے ملک سے اظہارِ محبت کریں..... اپنے بچوں کو ان عظیم قربانیوں سے روشناس کرائیں جن کو پھیل کے اس وطن عظیم کو حاصل کیا ہے۔

(2) کبھی خاموش بیٹھے تیرائی میں اپنے ملک کا موازنہ دوسرے ممالک سے کرتی ہوں تو کبھی سوچتی بھی ہوں کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ میں الحمد للہ اپنی فیملی کے ساتھ کافی ممالک کی سیر کر چکی ہوں..... کچھ واقعات نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ہم مسلمانوں کی تعلیمات پر دوسرے مذہب کے لوگ زیادہ اچھے طریقے سے عمل پیرا ہیں..... خاص طور پر سچ بولنا، ایمانداری کے ساتھ کام کرنا، اپنے وطن سے محبت کرنا، ملاوٹ نہ کرنا، قوانین کی اور وقت کی پابندی کرنا..... اپنے وطن سے محبت ہونا ایک فطری



فاطمہ نجیب:- شاعر، گیت کار، ہم ٹی وی

(1) 14 اگست ہماری زندگی کا اہم اور خوب صورت دن ہے..... اس دن پاک وطن کی سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ ہر طرف ایک گرین اور سفید سج دینے کی کوشش کرتی ہوں۔ خود بھی سبز رنگ کا لباس پہنتی ہوں اور دل کرتا ہے کہ ہر طرف ہزرے کی

عمل ہے اور اس محبت کے تحت کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ ہمارا ملک بھی تیزی سے ترقی کرے اور ترقی یافتہ ممالک کی صف میں عزت و وقار سے شامل ہو جائے..... اس کے لیے دعاؤں کے ساتھ ساتھ عملی اقدامات کرنے کی بھی اشد ضرورت ہے۔ اللہ پاک ہمارے وطن کو دائم آباد رکھے۔ (آمین)

تیری دیواروں سے تیرے در سے ہم کو پیار ہے تجھ سے نسبت جس کو ہے اس ہر بشر سے پیار ہے پاک سرزمین دائم شاد ہو آباد ہو محزون فہم و فراست شاد ہو آباد ہو



ڈاکٹر عمر فاروق ای این ٹی + کو لکسر ای پی لائٹ

اسپیٹلٹ

(1) بچپن سے لے کر آج تک 14 اگست کا دن ہمیشہ یادگار رہتا ہے، جب ہم اسکول میں تھے پوائنٹ اسکاؤٹ میں تھے، اور میکینک روڈ جو کہ اب مولوی تمیز الدین روڈ ہے، اس کے قریب ایک ریلوے اسٹیشن پر..... ہو سکتا ہے کہ بہت سے لوگ اس سے واقف نہ ہوں..... وہاں 14 اگست کو باقاعدہ اسکاؤٹ کی ریلی ہوا کرتی تھی اور اتفاق دیکھیں کہ بارش ضرور ہوتی تھی..... خیر آج بھی ہم اس دن اپنے گھر میں جھنڈا ضرور لگاتے ہیں۔ جھنڈیاں بھی



فیصل قریشی:- (آرٹسٹ۔)

لگاتے ہیں۔ لیکن چونکہ اب جدید دور ہے تو اب برقی قلموں سے گرین اور وائٹ جھنڈا بناتے ہیں اسے ملک کا..... اور اب گھر کو سجانے اور جھنڈا بنانے کی ذمہ داری میرے چھوٹے بیٹے اور بیٹی نے لے لی ہے..... اور اس انداز میں ہم 14 اگست مناتے ہیں۔

(2) جی بالکل موازنہ نہ کرتا ہوں..... اور بہت دکھ ہوتا ہے اور اپنے گزرے دور کا موازنہ ہم آج کے دور سے کریں تو ہم بہت ہی با تہذیب اور ترقی یافتہ قوم میں سے تھے..... اور علم و ادب کا، تہذیب کا، ہر چیز کا بہت بول بالا تھا..... اب آہستہ آہستہ تہذیب بدلتی جا رہی ہے۔ لوگوں کو اپنے آباؤ اجداد کی تاریخ بھولتی جا رہی ہے کہ کس طرح قربانیاں دے کر یہ ملک حاصل کیا گیا تھا اور اب کس طرح اس کا حال برا کیا جا رہا ہے..... دکھ ہوتا ہے یہ دیکھ کر جو ملک ہم سے بہت پیچھے تھے وہ ہم سے بہت آگے نکل گئے ہیں..... جو ہمیں دیکھنے آتے تھے کہ ترقی کیسے ہوتی ہے آج ہم انہیں دیکھنے جاتے ہیں۔ ان کے پاس جاتے ہیں قرضہ لینے کے لیے اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے..... کس کس ملک کا نام لوں آپ سب جانتی ہیں..... تو موازنہ ضرور کرتا ہوں اور بہت دکھ ہوتا ہے۔

الوب کھوسہ :- (آرٹسٹ)

(1) 14 اگست ایک ایسا دن ہے جس کی جتنی قدر کریں کم ہے اور جو بھی آزاد قومیں ہیں ان کے لیے یہ آزادی دن بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اس دن لوگ اپنا احتساب کرتے ہیں کہ ہم نے اپنے ملک کے لیے کیا کیا..... میں اس دن آزادی کے حوالے سے جو پروگرام ہوتے ہیں ان میں شریک ہوتا ہوں، جو مجھے بلاتے ہیں میں ان کا مہمان ہوتا ہوں اور مجھے آزادی کے حوالے سے پروگراموں میں شرکت کر کے بہت اچھا لگتا ہے۔

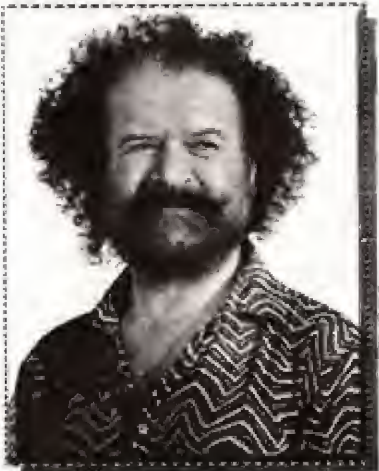
(2) ہاں موازنہ ضرور کرتا ہوں..... اور یہ دیکھتا ہوں کہ ہم خود کہاں پہ کھڑے ہیں۔ یہ حیثیت ایک قوم، یہ حیثیت ایک حکمران کے..... اور ہم سے کیا کیا غلطیاں کیا کیا کوتاہیاں ہوئی ہیں اور ہمیں اس کو کس طرح دور کرنا ہے..... اور میرا جیسا بندہ جس نے شوز میں کافی ٹائم گزارا اور جس سے لوگوں نے بے انتہا پیار کیا ہو، محبت دی چاہت دی..... تو میں یہ سوچتا ہوں کہ جو محبتیں مجھے ملی ہیں اے عوام سے۔ ان کو میں کس طرح لوٹا سکتا ہوں..... تو آگر میں انکیشن میں کامیاب ہو جاتا ہوں..... تو یقیناً یقیناً میں اپنی الگ سے ایک سوچ اور ایک زبان رکھتا ہوں



محمود اسلم :- (آرٹسٹ)

(1) پاکستان کے جو حالات ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔ آپ بتائیں ہمیں چودہ اگست منانا چاہیے؟..... یا 14 اگست منانا بننا ہے؟ ملک کی حالت دیکھیں کیا ہو رہی ہے۔ غریب کی حالت دیکھیں کیا ہو رہی ہے..... ہم کس منہ سے 14 اگست منائیں گے؟ بہت برے حالات ہیں ملک کے دوسرے ممالک دیکھیں کہاں سے کہاں پہنچ چکے ہیں اور ہم اپنے لوگوں کو نہ پالی دے سکے ہیں، نہ بجلی..... کوئی بنیادی سہولت ہم نہیں دے سکے ہیں، آپ اسپتالوں کی حالت دیکھیں۔ گاؤں دیہات میں غریبوں کی حالت دیکھیں۔ دو چار شہروں میں دو چار سڑکیں اور پل بنوا کے آپ سمجھتے ہیں کہ ہم نے حق ادا کر دیا..... ہمارے لیڈروں نے قوم نہیں بنائی۔ آپ طبیب پریشکال کی طرف دیکھیں آپ مہاترہ کی طرف دیکھیں جنہیں نے قومیں بنائی ہیں، جنہوں نے ملک بنائے ہیں۔ ہمارے پاس کیا ہے منائے کو؟

(2) یہی میرا موازنہ ہے اور ”آزادی“ آزاد لوگ مناتے ہیں ہم تو ابھی تک محکوم ہیں، غلام ہیں، ڈری ہوئی قوم ہیں، ہم نے کیا منانا ہے۔



(1) 14 اگست بھر پور طریقے سے مناتا ہوں۔ اس دن میرا شو بھی ہوتا ہے..... اور خوش گووار احساس ہوتا ہے کہ آج آزادی کا دن ہے اور آزادی بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کروڑ بار شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں ملک، پاکستان عطا کیا اور ان قربانیوں کو یاد کرنا چاہیے جو ہمارے بزرگوں نے دیں اور جن کی وجہ سے ہم ایک آزاد ملک میں سانس لے رہے ہیں۔ اس سال 14 اگست ان شاء اللہ لندن میں اپنے پاکستانی بہن بھائیوں کے ساتھ سلیمریٹ کروں گا۔

(2) موازنہ کرتا ہوں اور موازنہ کرتے وقت مجھے اپنے ملک میں ایسی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی کہ جس کے لیے میں کہوں کہ میرے ملک میں یہ اچھا نہیں ہے..... اللہ کا بڑا شکر ہے کہ سب کچھ اچھا ہے..... ہاں تھوڑی سی اصلاح کی ضرورت ہے اور اس کی ضرورت ہماری عوام کو ہے..... جب ہم بچے کو ”مادر پور“ آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ اسے تہذیب و تمدن نہیں سکھاتے، پھنسا بیٹھا نہیں سیکھاتا تو ظاہر ہے کہ..... دنیا بھر میں جس چیز پر سختی ہوتی ہے وہ ٹریفک کے نظام پر ہوتی ہے..... مگر ہمارے ملک میں پنجاب میں ٹریفک کا نظام کچھ اور ہے، اسلام آباد کا کچھ اور ہے دیگر شہروں کا الگ ہے..... تھوڑی سی اوپیریشن کی ضرورت ہے، تھوڑی سی چیزیں سکھانے کی ضرورت ہے۔ سیکھنے کے ہم شوقین ہیں بہت جلد اچھی عادتیں سیکھ لیتے ہیں..... اللہ کرے کہ کوئی ایسا انسان آئے جو لوگوں کو یہ سمجھائے کہ پورے ملک کا نظام ایک ہونا چاہیے۔ چاہے وہ تعلیمی نظام ہو، یا ٹریفک کے حوالے سے ہو، چاہے وہ صحت کے حوالے سے ہو، اور پھر نظام نظر آنا چاہیے..... صوبوں میں نہیں باڈنٹا چاہیے۔

بینش راجہ :- (آرٹسٹ)

(1) 14 اگست اسی طرح منائی ہوں جس طرح ہم سب پاکستانی مناتے ہیں۔ گرین کپڑے پہن لے، گھر سجایا، کہیں گھونٹے پھرنے نکل گئے،

جھنڈیاں لگالیں قومی نغمے سن لیے، دیے جلا لیے، یعنی جوش و خروش کے ساتھ منائی ہوں، کہ یہ دن ہمارا ہوتا ہے۔ آزادی کا احساس ہوتا ہے۔ گرین پاپیورٹ پر فخر ہوتا ہے۔

(2) جہاں تک موازنے کی بات ہے تو اپنے ملک کا موازنہ میں بھی کسی دوسرے ملک سے نہیں کروں گی، کیونکہ میری پہچان میرا ملک ہے اور میں کسی اور کی پہچان کو اپنی پہچان کے ساتھ کپیئر نہیں کر سکتی۔ ہاں لوگوں کے اخلاقی کا موازنہ ضرور کروں گی..... ہم اکثر اپنے حکمرانوں کو باتیں کرتے ہیں، لیکن درحقیقت ہم اخلاقی طور پر بہت گری ہوئی قوم ہیں..... ہمیں جہاں موقع ملتا ہے ہم غن کر رہے ہیں، فراڈ کرتے ہیں۔ چھوٹے طبقے سے لے کر بڑے طبقے تک سب ایک جیسے ہیں۔ شریف صرف وہ ہے جسے موقع نہیں ملا۔ جس کو کسی موقع ملا اس نے دوسرے کی ٹانگ ضرور ٹھینچی ہے۔ اگر ہم میں اخلاقیات کی کمی نہ ہوتی تو آج ہم ترقی پذیر نہیں بلکہ ترقی یافتہ کہلاتے..... اور موازنہ ملک کا اس لیے نہیں کروں گی کہ جو گھر مجھے تحفظ دے رہا ہے عزت دے رہا ہے وہ کوئی اور نہیں دے سکتا۔

جس کو میں ضرور استعمال کروں گا..... اور جو خدمت کا بیڑا میں نے اٹھایا ہے اسے ضرور پورا کروں گا۔



عمرانہ مقصود:- (رائٹر)

فیض احمد فیض کیا خوب کہہ گئے ہیں.....
وہ انتظار تھا جس کا
پہ وہ سحر تو نہیں

کہ 14 اگست 1947ء کو یہ بات فیض صاحب نے کی تھی۔ ہمیشہ 14 اگست کو اس سحر کا ہی انتظار ہوتا ہے کہ شاید کبھی ایسا ہو کہ ہم اپنے ملک کو آزاد مانیں اور آزاد محبتیں، کاش کہ ایسا ہو جائے، لیکن جو کچھ بھی ہے۔ ملک ہمارا ہے، اس کے لیے دعائیں ہماری ہیں..... اور ہم اس کے لیے کام کرتے رہیں گے، جس کے بس میں جو کچھ ہے وہ کرے..... انسان بڑے بڑے کاموں سے نہیں پہچانا جاتا بلکہ روز کے چھوٹے چھوٹے اور اچھے کاموں سے پہچانا جاتا ہے۔ تو اچھے کام کرتے رہیں۔ کرتے رہیں۔ ایک دن اللہ تعالیٰ اس کا بھی اجر دے گا۔

سید مناف:- (رائٹر ڈرامہ ہند کھڑکیاں + افسانہ و ناول نگار)

(1) 14 اگست میرے لیے میری سالگرہ سے زیادہ اہم ہے، مجھے اپنے وطن سے محبت نہیں بلکہ عشق ہے، اس لیے مجھے اسے منانا بہت اچھا لگتا ہے..... جھنڈیاں لگانا، قومی نغمے لگانا، قومی لباس پہننا اور اس دن گھر والوں کو اچھے اچھے کھانے پکا کر کھلانا مجھے بہت پسند ہے۔ 14 اگست کو ہی جاوید کی سالگرہ (میاں صاحب) ہوتی ہے تو اس دن کی اہمیت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے میری نظر میں..... دن بھر بلندنگ کے بچوں کے ساتھ اپنے اپنے لکڑ کو سجانا، ان کی مدد کرنا..... بچے کہتے ہیں کہ ماں ضرورت سے زیادہ جذباتی ہیں۔ تو ہاں میں پاکستان کے لیے جذباتی ہوں۔ میں دنیا کے کسی بھی کونے میں چلی جاؤں، میرے لیے میرا



پاکستان سب سے اہم ہے..... 2015ء میں میں شکاگو میں تھی وہاں کے پاکستانی یہ دن بہت جوش و خروش کے ساتھ مناتے ہیں۔ پورے شکاگو میں ریلیاں نکالتے ہیں۔ جھنڈے، قومی لباس، قومی نغمے..... یہ دل دیکھ کر دل خوش ہو گیا تھا..... اور یقین کریں میں نے ان سب کے ساتھ مل کر اتنے نعرے

لگائے کہ زندگی بھر نہ لگائے ہوں گے۔

(2) اس دن مجھے اس بات کا بہت دکھ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں خزانوں سے بھرا ہوا اسلامی ملک دیا ہے اور ہم نے اس کی قدر نہیں کی، میرے ابا کا پورا خاندان پارٹیشن میں ختم ہو گیا تھا..... اور بھی پتا نہیں کتنے خاندانوں نے اپنی جان و مال، عزت و آبرو کی قربانیاں دیں، مگر چھوڑے، رشتوں کو گنوا یا، صرف اس لیے کہ ہم ایک آزاد ملک میں سانس لے سکیں..... لیکن ہم قائد اعظم اور ان کے ساتھیوں کی جدوجہد کو کتنی آسانی سے بھول گئے ہیں..... ہمارے سیاست دانوں نے ہمارے ملک کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے..... اور ہم پھر بھی بار بار انہی کو منتخب کر کے لے آتے ہیں..... مگر میں پھر بھی پر امید ہوں کہ ایک دن ہم ایسی قوم بن کے ابھریں گے کہ لوگ ہم پر رشک کریں گے..... ان شاء اللہ۔



شہود علوی:- آرٹسٹ، پروڈیوسر ڈائریکٹر

(1) 14 اگست چونکہ ہماری آزادی کا دن ہے۔ یہ کہنا کہ آج 14 اگست ہے اور آزادی کا دن منایا نہ بڑا آسان ہے..... تو درحقیقت ایسا نہیں ہے۔

یہ دن جن قربانیوں اور جدوجہد کے بعد ہمیں ملا تھا اگر اس دن کے بارے میں سب کو پتا ہو تو یہ بڑا تکلیف دہ دن ہے 14 اگست کا دن دیکھنے کے لیے اس قوم نے جو قربانیاں دیں، اگر ان کو یاد رکھا جائے، تو 14 اگست کا دن خوشی اور تہواروں کے انداز میں منانے کی بجائے۔ لوگوں کو مسجدوں میں منانا چاہیے، اللہ کا شکر ادا کر کے منانا چاہیے، رورو کر گڑ گڑانا چاہیے۔ اور اپنے بزرگوں کا وہ تکلیف دہ وقت یاد رکھنا چاہیے کہ کتنی قربانیاں دی تھیں اور پھر 14 اگست کا دن دیکھنا نصیب ہوا..... تو اگر ایک طرف میں اس دن خوش ہوتا ہوں تو دیکھی بھی بہت ہوتا ہوں..... اور میں کوشش کرتا ہوں کہ اس دن تمام شہیدوں کے لیے دعائیں مغفرت کروں کہ جنہوں نے اس ملک کو بنانے کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ دیا..... اس دن انہی فیملی کے ساتھ وقت گزارتا ہوں اور اگر کسی کی وی پروگرام میں بلایا جاتا ہے تو پھر وہاں اس دن کے حوالے سے بات کرتا ہوں۔

(2) ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ..... ”اپنے سے اوپر دیکھنے کے بجائے اپنے سے نیچے دیکھو گے تو تمہارے اندر شکر کی عادت پیدا ہوگی اور شکر کرنے والے اللہ کے بہت قریب اور عزیز ہوتے ہیں۔“ تو اگر میں اپنے ملک کا موازنہ کسی یورپی ملک سے کروں یا کسی اور ملک سے کروں تو مجھے اوپر دیکھنے کی عادت پڑ جائے گی..... اور وہ میں دیکھنا نہیں چاہتا، تو میں اپنے ملک کا موازنہ ان ملکوں سے ضرور کرتا ہوں، جہاں کے لوگ بہت تکلیف میں ہیں۔ تو اس طرح سے اپنے ملک سے پیار بھی بہت ہوتا ہے اور آگے بڑھنے کی جدوجہد بھی جنم لیتی ہے..... اور اگر آزادی کا موازنہ کریں تو جو آزادی ہمیں ہمارے ملک میں ہے وہ دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں نہیں ہے۔ تو اس چیز کا بھی موازنہ کریں تو اپنا ملک زیادہ اچھا لگے گا..... مجھے اپنے ملک کا ہر موسم

شامل خان سے ملاقات

شاہین مرشد



شامل خان فلم اور ٹی وی کے معروف فنکار ہیں اور ان کے کریڈٹ میں کئی معروف فلمیں اور ڈرامہ سیریل ہیں۔ یہ گزشتہ دنوں ان سے بات چیت ہوئی تو ہم نے ان سے پوچھا۔

☆ ”کیسے ہیں آپ؟“

☆ ”جی اللہ کا شکر ہے۔“

☆ ”آج کل ہر طرف سیاست کا زور ہے۔

آپ کے انٹرویو آنے تک نئی حکومت بھی آچکی ہوگی، کچھ نہیں گے اس بارے میں؟“

☆ ”سچ پوچھیں تو مجھے سیاست سے کوئی لگاؤ

نہیں ہے۔۔۔۔۔ کیونکہ ہماری توقعات پہ تو کوئی بھی پورا نہیں کرتا پھر فائدہ کسی کی حمایت کرنے کا یا دوث دینے کا۔“

☆ ”کبھی صدر یا وزیراعظم کے عہدے کا

ایکشن لڑنا ہرے تو؟“

☆ ”تو آسانی سے لڑوں گا۔۔۔۔۔ کون سا

مشکل کام ہے اور سب کی سیاست دیکھ دیجھے کراتی سیاست تو نہیں بھی آگئی ہے۔“ تہجہ۔

☆ ”آپ نے ڈراموں میں بہت کام کیا اور

فلموں میں بھی۔ کیا سمجھتے ہیں کہ آپ کو شہرت کس میڈیا نے دی؟“

☆ ”مجھے میرے کام نے شہرت دی۔۔۔۔۔ میں

نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ مجھے ڈرامہ شہرت دے رہا ہے یا فلم۔۔۔۔۔ لوگ جب میرے پاس آکر کہتے ہیں کہ

آپ کو فلاں ڈرامے میں دیکھا تو لگتا ہے کہ ڈرامہ نے شہرت دی اور جب کوئی میری فلم کی تعریف کرتا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ میں فلم کی وجہ سے مشہور ہوا ہوں۔

نہیں ہوتا۔ مہمان اگر کبھی ڈھنگ کے بلا بھی لیے جائیں تو ان سے لایعنی گفتگو کی جاتی ہے۔ گزشتہ سال کا 14 اگست بہت اچھا گزرا، میں اپنی کزنز کے ساتھ ”سی و پو“ گئی اور یہ وہ دن تھا جب کسی کے پاس بھی کسی پارٹی کا جھنڈا نہیں تھا بلکہ سبز ہلالی پرچم لہرا رہے تھے۔۔۔۔۔ اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے۔

(2) میرا بھی تک پاکستان سے باہر جانے کا

اتفاق نہیں ہوا۔ لیکن جو سنا ہے اس پر موازنہ تو کیا ہی

جاتا ہے اور ایسے موقع پر مجھے حکمرانوں سے زیادہ

اپنے عوام پر غصہ آ رہا ہوتا ہے کہ وہ ایسے حکمران ہی

کیوں منتخب کرتے ہیں۔۔۔۔۔ اور دوسری بات یہ کہ یہ ہم

ہی لوگ ہیں جو قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔۔۔۔۔ ڈرامیو کرتے وقت اکثر میں دیکھتی ہوں کہ

پڑھے لکھے لوگ بڑی بڑی گاڑیوں میں بیٹھے تو ہوتے

ہیں لیکن ان کو شعور نہیں کہ مکمل پر رکنا بھی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو جب ڈیرہ دھو کھٹنے کی فلاحیت کے بعد

دینی جاتے ہیں تو ٹیکس بدل جاتے ہیں۔۔۔۔۔ یہی وہ

لوگ ہیں جو باہر جا کر ایک منظم زندگی گزارتے ہیں، کیا ان کی کوئی ٹریننگ ہوتی ہے؟۔۔۔۔۔ نہیں بلکہ صرف

قانون کا خوف ہوتا ہے جو ان کو انسان بنادیتا ہے۔۔۔۔۔

تو انہیں تو ہمارے پاس بھی ہے مگر کاغذوں کی حد تک۔۔۔۔۔ اور اس کے ذمہ دار صرف اور صرف ہمارے

حکمران ہیں۔

☆☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کمپ کا نام	صفحہ	قیمت
میر کی موت	100	100/-
خوبصورتی	100	300/-
میر کی موت	100	200/-

اور ایک ایک آنچ زمین سے بھی پیار ہے۔ مجھے اپنی فیملی کے ساتھ دوسرے ملک سے باہر اسٹیریٹیشن لینے کا موقع ملا۔ لیکن میں نے اور میری بیوی اور بچوں نے یہی فیصلہ کیا کہ ہمیں اپنے ملک میں ہی رہنا ہے اور یہ ہماری اپنے ملک سے محبت کا اظہار تھا۔۔۔۔۔ میں اپنے ملک میں رہنا چاہتا ہوں اور اس کا موازنہ کسی دوسرے ملک سے نہیں کرنا چاہتا۔ ملک میں ترقی ہو تو یہ میرے لیے فخر کی بات ہوگی اور اگر نہ ہو تو مجھے دکھ ہو گا۔



عظمیٰ رزاق :- کانٹینٹ فیچر بول ٹی وی

(1) 14 اگست کی ساری سلیبریشن بچپن

سے جڑی ہوئی ہیں جب عید کی طرح اس دن کا انتظار

رہتا تھا۔۔۔۔۔ جھنڈیاں لگانا اور پھر بارش ہونے پر ان کے بھیک جانے پر افسوس کرنا۔۔۔۔۔ اسکول کے

پروگرامز میں حصہ لینا۔۔۔۔۔ اس صبح آٹھ بجے کے ترانے کی خوشی ہی الگ ہوتی تھی۔۔۔۔۔ اب کافی

سالوں سے بس ٹی وی دیکھ کر ہی 14 اگست منایا جا رہا ہے اور ٹی وی دیکھ کر بھی مایوسی ہی ہوتی ہے کہ ان

سوکالڈ مارٹک شو میں لوگوں کو نچوانے کے علاوہ کچھ

تو میری شہرت دونوں میڈیم کی وجہ سے ہی ہے۔

☆ ”کچھ یاد ہے کہ کتنے ڈراموں میں کام کیا؟“

☆ ”سچ میں بالکل بھی یاد نہیں۔ کیونکہ کافی ٹائم

ہو گیا ہے کام کرتے ہوئے۔۔۔۔۔ اس لیے صحیح تعداد یاد نہیں۔

☆ ”کام تو آپ کافی وقت سے کر رہے

ہیں۔۔۔۔۔ لیکن کوئی سال ایسا ہے کہ جس کے بعد کام میں برکت ہی برکت ہوگئی ہو؟“

☆ ”بہت اچھا سوال ہے اور آپ سچ کہہ رہی ہیں کہ انسان کی زندگی میں کوئی لمحہ، کوئی وقت اور کوئی

سال ایسا ضرور ہوتا ہے جب وہ یا تو بہت کامیابیاں

سمیٹا ہے یا پھر زوال کی طرف جاتا ہے۔ تو 2002ء ایسا سال ہے جب اللہ کی رحمت اور برکت سے میرے کام میں بے حد اضافہ ہوا اور بتدریج ہوتا ہی رہا۔ اور میں نے اپنے کام مکمل کرانے کے لیے دن رات کام کیا۔

☆ ”اور کیا فلمیں بھی لاتعداد ہیں؟“

☆ ”نہیں ایسا نہیں ہے۔ فلموں کی تعداد تو محدود ہی ہے۔ یہی کوئی 18، 19 فلمیں کی ہوں گی میں نے۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ میری ساری فلمیں مقبول ہوئیں۔ میری پہلی فلم ”لوکی پنجابن“ تھی اور آخری فلم ”من آف پاکستان“ تھی۔

☆ ”آخری فلم۔ کیوں کیا فلموں کو خیر باد کہہ دیا؟“

☆ ”فی الحال خیر باد اپنی مرضی سے کہا ہوا ہے میں نے۔ کیونکہ دو باتوں نے دل برداشتہ کیا۔ ایک تو یہ فلم انڈسٹری میں گروپنگ بہت ہو گئی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرانے اداکار نئے لوگوں کو کچھ نہیں سمجھتے اور نئے فنکار، پرانوں کو نہیں کچھ سمجھتے۔ عجیب سا ماحول ہو گیا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ کوئی اچھا اسکرپٹ ہی ہاتھ نہیں آیا۔ وہی پرانے گھسے بے موضوعات کو اپنایا جا رہا ہے۔“

☆ ”فلموں میں بھی ڈراموں کے ہی اداکار نظر آ رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ نیا ٹیلنٹ سامنے نہیں آ رہا؟“

☆ ”نیا ٹیلنٹ تو بہت آ رہا ہے مگر نئے ٹیلنٹ میں محنت کا جذبہ نہیں ہے۔ نیا ٹیلنٹ سمجھتا ہے کہ بس کام مل رہا ہے بہت کافی ہے، مگر ایسا نہیں ہے۔“

☆ آپ اچھا ریٹائمنٹ نہیں دو گے تو کب تک چلو گے، ہم جس دور میں آئے تھے بہت محنت اور پاؤں پٹیلے کے بعد۔ بہت محنت کی تھی، تب کہیں جا کر اپنے آپ کو منوانے لگے۔“

☆ ”پہلے زمانے میں فنکار کو اپنا آپ منوانے کے لیے بہت محنت و دود کرنی پڑتی تھی۔ شاید جینٹل ایک تھا؟“

☆ ”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ایک ہی جینٹل تھا۔ نہ ایف۔ ٹی، نہ سوشل میڈیا، نہ انٹراگرام۔ تو صرف اپنی اداکاری کی وجہ سے ہی اپنا آپ منواتا تھا۔ اب تو کوئی ایک ڈرامہ میں بھی کام کرتا ہے تو سوشل میڈیا کے ذریعے اتنی زیادہ پکٹنی ہو جاتی ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ایک ڈرامہ میں نہیں بلکہ کئی ڈراموں میں کام کیا ہو۔ آج کا ٹیلنٹ تو راتوں رات شہرت کی بلندیوں پہنچ جاتا ہے۔“

☆ ”آپ کے ٹیلنٹ کو کس نے دریافت کیا؟“

☆ ”یہ بڑی بات ہے کہ کسی میں پوشیدہ ٹیلنٹ کو دریافت کیا جائے۔ مجھے تو خود علم نہیں تھا کہ مجھ میں اداکاری کے جراثیم موجود ہیں۔ میں تو اپنی مگر بچپن کے بعد بینک میں جاب کر رہا تھا، اور بینک کی جاب سے پہلے میں نے ایک سپر مارکیٹ میں بھی جاب کی۔ مگر مجھے مزا نہیں آیا۔ بات یہی ہو جائے گی آپ نے ٹیلنٹ کے بارے میں پوچھا کہ کس نے دریافت کیا۔ تو مجھے سید نور نے دریافت کیا۔“

☆ ”آپ نے کہا کہ بات یہی ہو جائے گی تو آپ اپنی بات مکمل کریں۔ اور پھر یہ بھی بتائیں کہ سید نور نے آپ کو کس طرح دریافت کیا؟“

☆ ”میں اپنی جاب کے بارے میں بتا رہا تھا کہ پہلی جاب سپر مارکیٹ میں کی، کوئی چھ ماہ تک۔ پھر بینک میں 10 ماہ تک، پھر ایک آئل کمپنی میں جاب کی اور یہ جاب بھی تھی تقریباً چار سال۔ اگر مجھے اداکاری کا شوق ہوتا تو میں ادھر ادھر جاب نہ کرتا اس طرف آ جاتا، پھر اتفاق یہ ہوا (شاید قدرت کو یہی منظور تھا) میں اسلام آباد سے لاہور ہجرت منانے آیا۔ تو وہاں سید نور سے ملاقات ہوئی۔ تو وہ بے ساختہ بولے کہ ”تم فلم میں کام کرو گے“ اور میں نے بھی فوراً حامی بھری، بس پھر کیا تھا انہوں نے کہا کہ تم اپنی تصاویر مجھے بھیج دینا۔ میں نے گھر آ کر اپنے والد صاحب سے ذکر کیا اور کہا کہ میں کام کرنے کے لیے ”یس“ کر دیا ہے۔ تو کہنے لگے اگر

تمہیں شوق ہے تو میں تمہیں ”آفاق صاحب کے پاس بھیج دیتا ہوں۔“ پھر میں آفاق صاحب سے ملا، دوبارہ سید نور صاحب سے ملا۔ اور یوں فلم کے ذریعے میری انٹری ہوئی شوہز میں۔ اور پھر راستے کھلتے چلے گئے۔“

☆ ”والد صاحب کی طرف سے بھی تو آپ میں جراثیم موجود تھے؟“

☆ ”جی۔ جی۔ بالکل موجود تھے لیکن کسی نے اس جانب توجہ ہی نہیں دلائی تھی۔ بہر حال میرے نصیب میں یہی فیڈ بک تھی اس لیے اس فیڈ میں آ گیا۔ بس قدرت ہی ہے کہ وہ انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دے۔“

☆ ”گو کہ آپ نے سترہ اٹھارہ فلمیں کیں، مختلف ہیروینوں کے ساتھ۔ پھر بھی سب سے زیادہ کس کے ساتھ کام کیا۔ اور سیکھنے کا موقع کس کی صحبت میں ملا؟“

☆ ”میں نے زیادہ تر بلکہ پانچ یا چھ فلمیں ”صائمہ“ جی کے ساتھ کیں۔ ہمارا ریمپر پسند کیا گیا۔ جب ہی نہیں اپنی فلمیں میں۔ اور سیکھا تو میں نے سب ہی سے ہے۔“

☆ ”صائمہ کیسی فنکارہ ہیں؟“

☆ ”صائمہ بہت اچھی فنکارہ ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے اور وہ خود بھی سکھاتی ہیں۔ غلطیوں کی نشان دہی بھی کرتی ہیں۔“

☆ ”آپ نے تو شاید بھارت میں بھی جاکر ان کی فلموں میں کام کیا ہے۔ کچھ بتائیں گے ان کے بارے میں؟“

☆ ”جی۔ جی۔ میں نے انڈیا جا کر انڈیا

کی فلم میں بھی کام کیا ہے اور اس فلم کا نام ”بھگی پیار نہ کرتا“ تھا اور یہ فلم 2007ء میں بنی تھی اور اس کی ساری ریکارڈنگ ممبئی میں ہوئی تھی۔ اور اسکرپٹ بھی اور جینٹل تھا۔“



☆ ”کیا بات ہے کہ انڈیا کی فلمیں زیادہ کامیاب ہوتی ہیں؟“

☆ ”میں بھی یہی کہتا ہوں کہ ہر فلم میں ہیرو ہیروین، ولن، مارڈھاڑ، لو، گانے سب کچھ ہوتا ہے مگر بس پیش کرنے کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ اچھی چیز بیسماقتی ہے۔“

☆ ”سید نور کو یہ حیثیت ایک ڈائریکٹر کے کیسا پایا؟“

☆ ”سید نور کی تو کیا ہی بات ہے، بہترین ڈائریکٹر بھی ہیں اور بہترین انسان بھی ہیں۔ فلم انڈسٹری کے لیے ان کی بڑی قربانیاں ہیں۔“

☆ ”اب ماشاء اللہ آپ سینئر فنکار ہیں۔ کبھی خیال آیا کہ میں خود بھی ایک فلم بناؤں؟“

☆ ”میں نے یہ حیثیت اسٹنٹ ڈائریکٹر کے سید نور کے ساتھ تقریباً پندرہ سال کام کیا ہے اور میں فلم میکنگ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں لیکن

پری بھی سینے

عاصم محمود

شاہین رشید



(10) "لاماؤنٹ تھا؟"

"صرف 7 ہزار تھا۔"

(11) "میری مادری زبان؟"

"پنجابی..... بہت میٹھی زبان ہے۔"

(12) "موسم پسند ہے؟"

"گریموں میں سردی اور سردیوں میں گرمی۔"

ہا ہا..... مگر ایسا ناممکن ہے..... مگر مجھے سردیوں کی دھوپ بہت اچھی لگتی ہے۔"

(13) "کھانے میں نخرے؟"

"نہیں جی..... ہر گز نہیں۔ بھوک لگے اور گھر پر نہیں ہوں تو کچھ نہ کچھ کھا کر جنوک مٹا لیتا ہوں۔"

(1) "میرا نام؟"

"عاصم محمود۔"

(2) "پیارے بلا تے ہیں؟"

"عاصم ہی بلا تے ہیں کسی نے نام بگاڑا نہیں۔"

(3) "پیدا ہوا؟"

"16 جنوری 1988ء۔"

(4) "شہر/قد؟"

"سیالکوٹ/5 فٹ 9 انچ..... اللہ کا شکر ہے کہ قد اچھا ہے۔"

(5) "تعلیم؟"

"ایم بی اے۔"

(6) "میرا خواب تھا؟"

"کہ میں آری میں جاؤں یا پھر اپنا بزنس کروں اور یہ دونوں خواب پورے نہیں ہوئے اور میں اس فیلڈ میں آ گیا۔"

(7) "شو بزنس آیا؟"

"اپنی صلاحیت کے بل بوتے پر۔ آپ کو پتا ہے جب تک صلاحیت نہ ہو تب تک کوئی لفٹ نہیں کراتا۔"

(8) "میں مشہور ہوا؟"

"ڈرامہ سیریل 'علی کی امی' اور ڈرامہ سیریل 'جنت' سے۔"

(9) "پہلی کمائی کسے دی؟"

"اپنی ماں کو۔ گوکہ زیادہ نہیں تھی مگر خوشی بہت تھی۔"

اپنے پروڈکشن ہاؤس بنالے ہیں لہذا مارکیٹنگ کرنا اور اپنی چیز بیچنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اس لیے میں اپنے کام کو فوقیت دیتا ہوں اپنے کام پہ فوکس رہتا ہوں۔"

☆ "کسی چینل کو جوائن کرنے کا خیال آیا؟"

☆ "مجھے تو خیال آتا ہے..... اگر کوئی اچھی پیش کش ہوئی تو ضرور کسی چینل کو جوائن کروں گا..... اور چینل جوائن کرنے کے بعد ہی کام کر کے دکھانے کا موقع ملے گا۔"

☆ "ڈرامے تو آپ نے لا تعداد کیے، مگر جو بہت زیادہ مقبول ہوئے، ان کے نام یاد ہوں تو بتائیے؟"

☆ "اللہ کا شکر ہے کہ میرے تقریباً سب ہی ڈرامے مقبول ہوئے ہیں لیکن پھر بھی آپ کو بتاؤں کہ 'صدقے تمہارے' وہ ایک ٹل۔ تھوڑی سی دفا۔ پھر وہی محبت۔ لاہور جکشن۔ فاصلے۔ بدگمان۔ کوئی عشق نہ جانے۔ آنگن میں دیوار۔ مانا کا گھر اند۔ کتنی گرہیں باقی ہیں" کے کئی ڈرامے اور "یقین کا سفر" نے تو مقبولیت کے ریکارڈ توڑے۔ جبکہ آج کل آن ایئر ڈرامہ سوپ "میرا حق" بھی بہت مقبول ہو رہا ہے اور عتق رب آپ "گڈی" کے نام سے جیو سے ایک سیریل بھی دیکھ چکے ہیں گے۔"

☆ "اور فلمیں؟"

☆ "فلموں میں 'لوکی پنجابن۔ سن آف پاکستان۔ جسم۔ بستی۔ بھی پیار نہ کرنا۔ گلابو۔ سونا بار۔ ہم ایک ہیں' اور 'ریونج آف دی درجہ لیس' کافی مقبول ہوئیں۔ چلیں جی بہت شکریہ "شامل خان" صاحب آپ کا کافی ٹائم لیا۔"

☆ ☆



میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک اکیلے بندے کا کام نہیں ہے اس کے لیے پوری ٹیم چاہیے ہوتی ہے..... آج کل کے آرٹسٹ کام کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ پروڈیوسر پیسا لگاتے ہیں تو ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کو پورا پروڈکٹ دیا جائے..... ایسا کہاں ہوتا ہے..... بس اس لیے سوچتا ہوں اور پھر ارادہ بدل دیتا ہوں۔"

☆ "فلم پہ بہت باتیں ہوئیں..... اپنی ڈرامہ انڈسٹری کے بارے میں کیا کہیں گے؟"

☆ "ماشاء اللہ تر تری کر رہی ہے۔ اور بطور اداکار میری تو پوری کوشش ہوتی ہے کہ میں اپنا کام ایمان داری اور جانفشانی کے ساتھ کروں، کیونکہ یہی ہماری جاب ہے اور جاب کے ساتھ نا انصافی نہیں کر سکتا۔ اس فیلڈ سے ہمارا رزق بندھا ہوا ہے تو ہمیں تو اچھا اچھا کام کرنا ہے۔"

☆ "ڈرامہ پروڈکشن کی طرف آنے کا سوچا؟"

☆ "نہیں، کیونکہ اب بڑے بڑے چینل نے



(19) ”وہ وقت اچھا لگتا ہے؟“

”جب ہاتھ میں چمک آتا ہے۔۔۔۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔۔۔۔ یا پھر جب اپنی فیملی کے ساتھ سیالکوٹ میں ہوتا ہوں۔“

(20) ”غصے میں رد عمل؟“

”جس پہ غصہ آتا ہے اس سے کچھ عرصے کے لیے بات چیت چھوڑ دیتا ہوں۔“

(21) ”کس قسم کی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں؟“

”خوب صورت لڑکیاں اچھی لگتی ہے۔“

(22) ”والد صاحب کا تحفہ جو آج بھی محفوظ ہے؟“

”میرے خیال میں جب ساتویں آٹھویں کلاس میں تھا تو میرے ابو نے مجھے ایک ”ہیٹ“ لاکر دیا تھا۔۔۔۔۔۔ جو مجھے بہت پسند آیا تھا۔۔۔۔۔۔ اسے میں نے سنبھال کر رکھ لیا۔۔۔۔۔۔ اور آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔“

(23) ”کھانا دہی سے طریقے سے کھاتا ہوں یا انگریزی طریقے سے؟“

”جیسا ماحول ہوتا ہے اسی حساب کھانا کام غلط بھی ہو جاتے ہیں۔“

(14) ”صبح کی روٹین؟“

”جس دن شوٹ پہ جانا ہو۔ صبح جلدی اٹھ جاتا ہوں، برش کرنا، نہانا۔۔۔۔۔۔ پھر جم جانا اور پھر کچھ کھانا ہوں۔ اور صبح کی یہی روٹین ہے پھر شوٹ پہ چلا جاتا ہوں۔“

(15) ”ناشتے میں پسند ہے؟“

”عموماً دلچسپی کھاتا ہوں۔ خود ہی ناشتا بھی بنا لیتا ہوں۔۔۔۔۔۔ کسی کو تکلیف نہیں دیتا۔“

(16) ”مجھے اچھا لگتا ہے؟“

”جب لوگ میرے والدین سے میری اداکاری کی تعریف کرتے ہیں۔“

(17) ”یادگار لمحہ؟“

”لمحہ نہیں، وہ وقت جب کئی ہزار لوگوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کے بعد میں نے ”ہیرو“ بننے کی ”ٹرینک“ ایوارڈ جیتا تھا اور یہی ایوارڈ میرے لیے لگی ثابت ہوا کہ مجھے آفرز آنا شروع ہو گئیں۔“

(18) ”اپنی ناپسندیدہ عادت؟“

”جذبہ بانی بہت ہوں اور جذبات میں آ کر کئی کام غلط بھی ہو جاتے ہیں۔“

PakiBooks.Site

کھاتا ہوں۔ ویسے زیادہ تر ہاتھ سے کھانا اچھا لگتا ہے۔“

(24) ”بچپن کی ایک مار جو ابھی تک یاد ہے؟“

”دادی اماں کی ایک پٹی پلائی ”مرغی“ میرے ہاتھوں سے مر گئی تھی جب دادی نے بہت مارا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ مار ابھی تک یاد ہے۔“

(25) ”شائنگ میں پہلی ترجیح؟“

”اپنے کپڑے خریدنا۔“

(26) ”کوئی لڑکی بدتمیزی کرے تو؟“

”تو مجھے وہ میری کتاب سے خارج ہے۔“

(27) ”میرے غصے کے علاوہ کس کا غصہ گھر میں تیز ہے؟“

”میرے والد محترم کا۔“

(28) ”ماضی کا پسندیدہ فنکار؟“

”سلطان راہی اور منور ظریف مرحوم۔“

(29) ”خوف زدہ ہو جاتا ہوں؟“

”جب بھی اونچائی سے نیچے دیکھتا ہوں

ٹانگوں سے جان نکلنے لگتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ۔۔۔۔۔۔ کہ بچپن میں میں ایک بار چھت سے گر پڑا تھا۔“

(30) ”کھانا اچھا کون پکاتا ہے، مرد یا عورت؟“

”میرے خیال میں مرد۔۔۔۔۔۔ کیونکہ میں خود بہہ اچھا کھانا پکالیتا ہوں۔“

(31) ”گھر سے نکلنے وقت نہیں بھولتا؟“

”اہم چیزوں کو لینا، مثلاً موبائل فون، آ

ڈی کارڈ، والٹ اور لائسنس وغیرہ۔“

(32) ”زیادہ اچھی رائے کون دیتا ہے دل

دماغ؟“

”دونوں کو آ زمانے کے بعد اندازہ ہوا کہ دماغ



WITH
COLOR LOCK
TECHNOLOGY™

BLACK ROSE

Color Supreme

PERMANENT
HAIR COLOR
DEEP NOURISHING EFFECTS

AVAILABLE IN 10 DIFFERENT SHADES



س ”حقیقی خوشی کب ہوتی ہے؟“
ج ”جب میری ماما مجھ سے بہت خوش ہوتی
ہیں۔ (اور ایسا بہت کم ہوتا ہے) کیونکہ میں ہر کام
بہت سلو کرنے کی عادی ہوں اور اسی پہ ماما سے ڈانٹ
پڑتی رہتی ہے۔“

س ”ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟“
ج ”بالکل بھی نہیں۔ صرف اللہ پر یقین رکھتی
ہوں اور اپنی دعاؤں پر.....!!!“
س ”مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ، جس پر عمل
کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟“
ج ”کوئی خاص پلاننگ میں نہیں کرتی۔ کیونکہ جو
وہ چاہتا ہے وہی ہونا ہوتا ہے۔ بس اس سال اپنی ماما کے
ساتھ عمرہ کرنے کی دعا کر رہی ہوں اور تیار ہی ہوں۔“
س ”کوئی ایسی بات جو ہمیشہ ذہن میں رہتی
ہو؟“

ج ”کہ میں بہت گناہ گار ہو..... اور ایک یہی
بات مجھے نیکی کی طرف مزید راغب کرتی ہے۔“
س ”زندگی سے کیا سیکھا؟“
ج ”غیب و فراز، اتار چڑھا اور دکھ یہ سب
زندگی کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ طرح آگھیں
بندر کے نہیں، بلکہ شیر کی طرح ان کا مقابلہ کریں تو
زندگی بہت آسان ہو جاتی ہے۔“

س ”اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے؟“
ج ”پہلے اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی تھی، مگر
اب اپنے کام کی تعریف سن کر زیادہ خوشی ہوتی ہے۔
جب کوئی نئی کہانیوں، میری شاعری کی تعریف
کرے، پسند کرے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ دل
چاہتا ہے اس کا منہ چوم لوں۔“
س ”ڈرامے دیکھتی ہیں؟“
ج ”بہت کم.....! بہت چوز کر کے دیکھتی ہوں
جو حقیقت کے بہت قریب ہو۔“

فجر کا ٹائم۔ میں ان دو وقت میں اس ذات کو اپنے
بہت قریب پاتی ہوں۔“

س ”تکن لوگوں کی احسان مند ہیں؟“
ج ”لوگوں کا پوچھا ہے تو یہی کہوں گی کہ ہم پہ
اگر کوئی احسان کرتا بھی ہے تو وہ درحقیقت اسی ذات کا
ہم پر احسان ہوتا ہے۔ سو میں بس اپنے اللہ کی احسان
مند ہوں۔ جس نے ایک بہت اچھے انسان کو میری
زندگی بدلنے کا وسیلہ بنایا۔“
س ”آپ کی نظر میں محبت؟“
ج ”اللہ کی دین..... اس ذات کا عطا کردہ
ایک انعام..... ایک نعمت..... ایک ایسا احساس جو ہر
پل..... ہر لمحہ..... ہر وقت ہمارے دل کو اپنے حصار
میں رکھتا ہے۔ ہمیں وہ خوشی وہ سکون اور وہ اطمینان
عطا کرتا ہے جس کا کوئی بھی نعم البدل نہیں ہوتا۔“
س ”بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟“

ج ”بھوت، بھوتوں سے کیا ڈرے گا؟ بابا ہا میں
بالکل نہیں ڈرتی بھوتوں سے۔ اللہ پر یقین رکھنے
والے میرا نہیں خیال کہ بھوتوں سے ڈرتے ہیں۔“
س ”وہ کون سے کام ہیں جن کو کرتے وقت
خیال آتا ہے کہ دنیا کیا کہے گی؟“
ج ”میں نے کبھی بھی کوئی بھی کام کرتے وقت
یہ نہیں سوچا کہ دنیا کیا کہے گی۔ وہ کسی شاعر نے کہا ہے
نہ۔“

”دنیا کب چپ رہتی ہے، کہنے دے جو کہتی
ہے۔“
س ”آپ کسی سنسان راستے سے گزر رہی ہو
اور کتنا پیچھے لگ جائے تو؟“
ج ”تو میں دوڑ میں کتے کو ہرا دوں گی۔ یعنی وہ
میرے پیچھے رہ جائے گا۔“
س ”پچھلے سال کی کوئی کامیابی، جس نے آپ
کو سرور و مطمئن کر دیا ہو؟“
ج ”کچھ خاص نہیں بس ایم۔ اے انگلش میں
ڈگری لی۔“

رخ چوہدری

سپتیمی

لندن کے انتہائی سرد موسم میں بڑھیا نائٹ کلب کی غمارت کے نیچے بیٹھی ہر آتے جاتے بندے کے آگے ہیٹ کر کے اپنے پیار شوہر کی دوا اور کھانے کے لیے پیسے مانگ رہی تھی کہ اچانک ٹی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ وہاں سے گزرتے ہوئے بڑھیا کی جمع شدہ رقم لے کر بھاگ جاتی ہے۔

”سلیم منزل“ کے اکلوتے چشم و چراغ سلیم الدین جن کی والدہ حمیدہ خاتون ان کی شادی اپنی برادری یعنی نوابی رسم و رواج والی لڑکی سے کرنا چاہتی ہیں اور ان کے شوہر نواب علیم الدین اپنے دیرینہ دوست ملک غیاث کی بہن شگفتہ کو بطور بہو پسند کر آتے ہیں اور اس پسند میں سلیم الدین اور دونوں بہنوں کی پسند شامل ہوتی ہے مگر حمیدہ خاتون مختلف زبان، مختلف ثقافت اور کم تعلیم یافتہ بہو کو دل سے قبول نہیں کرتیں اور دن رات کڑھا کرتیں۔

ظہیر احمد ایک سرکاری افسر ہیں مزاجاً انتہائی مزاج، اکھڑ، بات بات پر بیوی کی بے عزتی اور اس پر ہاتھ اٹھانا اپنی شان سمجھتے ہیں۔ ظہیر احمد اور رقیہ کے دو بیٹے، دو بیٹیاں ہیں اسما، ثمنین، فکیل اور جمیل۔ ظہیر احمد کے بڑے بھائی کبیر احمد سخت ضرور تھے مگر بیوی پر ہاتھ اٹھانے کو مرد کی بزدلی اور کمزوری سمجھتے ہیں۔ ان کے دو بیٹے عابد اور ساجد جو اسما اور ثمنین کے سنگت میں ہیں اور تین بیٹیاں جن میں دو فکیل اور جمیل کی سنگت میں ہیں اور ایک کسی کزن بھانجے کے ساتھ بیاہی جاتی ہے۔ اب آگے بڑھیں۔

پانچویں قسط



طلاق ایسا لفظ ہے اگر کبھی زندگی میں عورت خود بھی طلاق کا قہقاہہ کرے اور شوہر اس کے حسب فضا طلاق دے۔ دے تو مل بھر کو وہ بھی سنانے میں آ جاتی ہے۔ لہجہ بھر کے لیے سب کچھ الٹ پلٹ ہو جاتا ہے، یہاں تو ایک لفظ — طلاق کا کہہ کر لفظ ذہن ایک ایسی بیوی کو بھٹایا گیا جو شوہر کو بچپن سے ٹوٹ کر چاہتی تھی جس کی سانس ہر وقت اکڑی رہتی تھی اس کا کیا حال ہو سکتا تھا۔ حسب توقع شہینہ کی سانسیں اکڑ گئیں۔

”طلاق..... طلاق.....“ زبان تالو سے چپک کر رہ گئی۔ خشکی کے باوجود بھی شہینہ بہنے لگا، سانس کی تالی کو۔ گویا ساجد نے منہ می میں اتنا ٹکس کر چھوڑ رکھا تھا کہ سانس آنا مشکل تھا اور وہ ستم گرا سے اگلے لاوے میں دھکیل کر تماشائے لب جاں دیکھ کر نجانے اپنی کس انتہائی حس کی نشانی کر رہا تھا۔

”میں..... میں..... مر جاؤں گی۔ سا..... ساجد اللہ کے واسطے..... ایسا نہ کریں۔ پا..... پا..... پانی.....“

سینے پر ہاتھ رکھے بند پر گرتے ہوئے شہینہ نے التجا کی تو ساجد نے غصے سے گلاس میں ڈھکا پانی اٹھا کر اس طرف اٹے کیا کہ پانی اچھل کر شہینہ پر گرا۔

”لے لے پانی، مگر یوں سانس روک لینے سے اس طرح مرنے کی ایکٹنگ کرنے سے حقائق بدلیں گے نہیں شہینہ بیگم! انجی تو اس بند لگانے میں طلاق نامہ نہیں ہے اور آپ کا یہ حال ہے اگر واقعی ہوا تو.....“

”جی..... جی..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں اس میں.....“

”جی، ہاں دیکھیے لفظ ہے۔“

پھر ساجد نے باقاعدہ لفظ کھول کر شہینہ کو دکھایا تو..... شہینہ کی پھنسی سانس بحال ہو گئی۔ اسے لگا سکتے انگاروں پر گویا پانی ڈال دیا گیا ہو۔ وہ سینے میں اٹھتی تیسوں کو دبائے یہ بھی نہ کہہ سکی کہ.....

”یہ، کیسا جان لیوا مذاق تھا کہ ابھی دم رخصت ہو جاتا۔“

مگر ساجد کو اتنا تو علم تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے اور یہ بھی وہ وقت تھا جب وہ اپنی بات منوا سکتا تھا۔

”کسی گمان میں نہ رہنا شہینہ بیگم! آج یہ لفظ دانستہ طور پر خالی رکھا گیا ہے لیکن اگر بات نہ مانی گئی تو.....“

ساجد نے لفظ اس کے سامنے لہرایا۔ اس ”تو“ کے پیچھے کون سی قیامت اس کی زندگی کے در پر دستک دے رہی ہے، وہ نہیں جانتی تھی۔ اس لیے تو چپ چاپ مختار نامے پر سائن کر دے کہ صاحب ہماری زندگی کی کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے جو چاہے آپ اس کے ساتھ سلوک روا رکھیے۔

”آ..... آپ..... کیا کہنا چاہتے ہیں ساجد!“

☆☆☆

”یہ زاہدہ بیٹی کو کیا ہوا؟“ رقیہ بیگم ابھی تک زاہدہ کے رویے کو سمجھ نہیں پاتی تھیں۔ شایدہ نے ان کو پیار سے صوفے پر بٹھایا۔

”فکر کی کوئی بات نہیں چچی جان! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ زاہدہ ذرا شوخ سی ہے۔ پھر بھی اگر اس نے دانستہ طور پر یہ مذاق یا بدتمیزی کی ہے تو اسے معافی مانگی پڑے گی۔“ شایدہ کو واقعی افسوس ہو رہا تھا زاہدہ کے رویے پر۔

”ارے چھوڑو بیٹی! اب تو تلخ اور سخت رویوں کی عادت سی ہو گئی ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا، اب کسی بات سے.....“

رقیہ بیگم نے صوفے کی پشت سے سر لگایا تو کئی آنسو بوڑھے رخساروں کی جھریوں میں جا چھے۔

”آپ یہ تو مجھ پر چھوڑ دیں چچی جان! ہمارے خاندان کے مرد باپ ہیں، بیٹے ہیں یا بھائی، سب ایسے ہی ہیں

پہل کو جو تے کی نوک پر رکھنے والے مگر ہمیں تو ایک دوسرے کی عزت نفس کا خیال رکھنا چاہیے۔ ہمیں اپنے سرسراں میں اپنی ماؤں کی تربیت کی لاج رکھنی ہے تاکہ والدہ حضرات..... خیر آپ فکر نہ کریں اس گھر میں اسماء اور یہاں میں ان شاء اللہ ماحول کو کنٹرول میں رکھیں گے۔ آپ فکر نہ کریں بس ٹھیک رہیں، آپ میری ہمت ہیں یہاں پر۔“

شایدہ سانس کا ہاتھ تھا، کتنی دیر سہلا، سہلا کر تسلی دیتی رہی۔ انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر پیار کیا۔

”اسماء اور تمہاری جیسی بیٹیاں ہی رحمت ہوتی ہیں۔ ماؤں کی ڈھال ہوتی ہیں۔ خوش رہو، دودھوں نہاؤ ہاتھوں پہلو۔“

☆☆☆

اب ایسا بھی نہیں تھا کہ زاہدہ نے جو کہا تھا وہی اس کا مطلب تھا اور ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ شایدہ کی طرح ٹیک پر مین سیم کی فرماں بردار ہو گئی۔ بس اپنی ایک سوچ تھی اس کی، مزاج میں سختی، والد کی طرف سے آئی تھی تاہم بڑی بہن کے کہانے پر اس نے باقاعدہ سانس سے معذرت تو کر لی تھی اندازہ ہی اکھڑا تھا۔

”معافی چاہتی ہوں چچی جان! میرا مطلب وہ تو نہیں تھا لیکن چونکہ آپ نے نکال لیا ہے تو معذرت چاہتی ہوں۔“

”ارے ارے زاہدہ! میری گزرا۔ تم اور شہینہ میرے لیے ایک حیثیت رکھتی ہو۔ اب چھوڑو، بھول جاؤ اس بات کو۔ ہاں شہینہ سے بات ہوئی تم لوگوں کی۔“ رقیہ بیگم نہیں چاہتی تھیں کہ وہ اس بات کو ظاہر کریں جو وہ زاہدہ کے اندازہ دے میں محسوس کر رہی تھیں، بات بدل دی۔

”نہیں چچی جان! شہینہ سے ابھی تک تو بات نہیں ہوئی۔ اسماء کا قانون آیا تھا، ماشاء اللہ سب ٹھیک ہیں۔“

”جانتی ہوں بیٹا! جو ٹھیک ہیں اللہ ان کو خوش رکھے، مجھے صرف شہینہ کا بتاؤ۔“ اس بات پر زاہدہ کا موڈ بگڑ گیا۔

”چچی جان! یہ جو آپ کی بیٹی شہینہ ہے ناں، ساجد بھیا کو بہت تنگ کرتی ہے۔ ہر وقت تو بیمار رہتی ہے، سب بھیا بے چارے شادی کو انجوائے ہی نہیں کر سکے۔ سہاگ رات ہی انہوں نے اس کی وجہ سے ہاسپٹل میں گزاری۔“

زاہدہ نے اپنی ساڑھی استری کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے کہا تو شایدہ نے اسے گھورا، اس نے بھی گھور کر اپنی بات کو درست قرار دیا مگر رقیہ بیگم کا دل بھی میں آ گیا۔ وہ چپکے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئیں۔

”یا اللہ! کیا ہوگا میری بچی کی شادی کا انجام۔ بات تو زاہدہ کی بھی ٹھیک ہے مگر..... مگر کیا کروں، کیا نہ کروں۔“

ادھر متا سلتی رہی، ادھر شہینہ نے اپنے محبوب شوہر کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

”مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے ساجد!..... آپ دوسری شادی کر سکتے ہیں۔“

ادھر شہینہ نے اپنی رقیہ کے حق میں فیصلہ دے کر قلم توڑ ڈالا کیوں کہ اس کے ستم کر کا قہقاہہ تھا۔

جینا ہے تو نوک خنجر چھینچھینچ جاتا
ہم سے تمہاری سانسوں کے ناز اٹھائے نہیں جاتے

معادے پر دستخط کر کے سینے کی دھن میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”ایک بات اور میری منیبہ سے شادی اس وقت تک راز رہے گی جب تک میں چاہوں گا۔“ وہ اپنی سفاکی میں اس کی اذیت کو نظر انداز کر رہا تھا، جو اس کو قلمی اور روحانی طور پر بہرہ دیتی تھی۔

”جی، جی..... ساجد..... آ..... آپ کہیں تو یہ راز قبر میں لے جاؤں گی۔“ شمیر نے بامشکل سانس لیا۔
 ”ہوں، ایسا ہی ہونا چاہیے ورنہ اس لٹکانے میں طلاق ڈال دی جائے گی خواہ عمر کا کوئی بھی پہرہ ہو۔“
 ”ایسا کبھی نہیں ہوگا ساجد! آپ مطمئن رہیے۔ مگر پلیز..... پلیز میرے وجود کی اس ذہنی عمارت پر اپنے نام کی ختی لگی رہنے دیجیے گا بس، اتنا سا تقاضا ہے۔“
 ”اپنی بات پر قائم رہو گی تو ایسا ہی ہوگا۔“
 اور پھر یوں ہوا کہ زرتی شب کے لمحوں نے شمیر کی تباہی دیکھی اور چپ چاپ کھمک گئے۔

☆☆☆

”بس باس!“ راہی جواب تک اس پاکستانی شخص کو دیکھ رہے تھے، ملازم لڑکے کی آواز پر چونکے۔
 ”ہوں، ہاں..... کیا کیوں آئے ہو، کیا پوچھ رہے ہو۔“ راہی کا دھیان اس آدمی ہی کی طرف تھا، لڑکا حیران ہوا۔

”سر! آپ نے اشارے سے مجھے بلایا ہے۔ میں کسٹر چھوڑ کر آیا ہوں۔“ راہی نے لڑکے کو دیکھا اور کاؤنٹر سے اٹھے۔

”ہاں..... آگئے ہو تو اچھی سی کافی دو کپ بنا کر، وہ صاحب جو پاکستانی لگ رہے ہیں، ان کے سامنے لاکر رکھو۔ میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔“

”اوکے سر!“ اور پھر لڑکا حکم بجالانے چلا گیا اور خود راہی اس پاکستانی نظر آنے والے شخص کی طرف بڑھے۔

”السلام علیکم!“ راہی نے سلام کے لیے ہاتھ بڑھایا، آدمی کھڑا ہو کر ان کی طرف بڑھا۔
 ”وعلیکم السلام! آپ.....“ آدمی ان کے پہنچاؤ اور سرخ و سفید رنگت کی وجہ سے شک میں پڑا، کہیں

انگریز نہ ہو۔
 ”جی، اس ناچیز کو راہی کہتے ہیں۔“ اردو بولنے پر وہ شخص گرم جوشی سے راہی کے گلے لگا۔

”اوہ، تو یہ بزنس شی آپ کا ہے؟“
 اس شخص نے طائرانہ نگاہ راہی کے جزل اسٹور پلیس کافی ہاؤس پر ڈالی تو راہی خوش دلی سے مسکرا دیے۔

اکسپریس سے سر جھکایا۔
 ”الحمد للہ! تشریف رکھیے۔ اس میں اب کوئی شک نہیں کہ آپ میرے مسلمان پاکستانی بھائی ہیں۔ بس نام بتا دیجیے۔“ راہی کو عجیب سی خوشی اور طمانیت کا احساس ہو رہا تھا، ایسے تاثرات اس شخص کے بھیجے تھے۔

”جی، مجھے انور خان کہتے ہیں۔ خوشی ہو رہی ہے، یہ سب دیکھ کر کہ میرا پاکستانی بھائی انگلینڈ جیسے ملک میں.....“

”ارے چھوڑیے صاحب! تشریف رکھیے اور جلدی سے بتائیے کہ کافی کے ساتھ کیا لیں گے؟“
 ”کافی کا تو میں نے ابھی آرڈر دیا ہی نہیں۔“ انور کو حیرت ہوئی۔

”تو نہ دیا ہو، صاحب! آج ہمارے مہمان ہیں۔ آپ بتائیے آپ کافی کے ساتھ کوئی اسٹیک لینا چاہیں گے تو..... بتائیں۔“

”ارے مجھے ہمارے میزبان کی مرضی جو کھلا دیں کھالیں گے۔ مگر ہمارے میزبان نے جو ہمیں عزت دی ہے، اس کا بدلہ نہ شکر ہے۔“

اور پھر جی ہی نہیں چلا کہ سرد موسم میں گرم کافی پیتے ہوئے، انور خان اور راہی کب صدیوں پرانے دوست

ہیں گئے۔

”تو یہ بات۔ انور! ایسا کرو، آج ڈنر میرے ساتھ میرے گھر پر کرو۔“ اجنبیت اور تکلف کی دیوار جانے کب گر چکی تھی کافی کا آخری سب لے کر انور نے گک میز پر رکھا۔

”اگر، ہم نے ایک ساتھ ہی ڈنر کرنا ہے تو، یہ ڈنر میرے گھر ہوگا۔“
 ”اچھا، ایسا ہے تو ایسا ہی سمجھو۔“ بھابھی کھانا بنا رہی ہیں، کیا؟“ ایک دھندلا سا یہ انور کے چہرے کو چھوٹا کر گیا۔

”ہاں، بہت اچھا۔ تم آنا ناں بھابھی کو لے کر۔ اپنی بیٹی کو لے کر، اس دیار غیر میں مل بیٹھیں گے تو..... شاید ہم ایک دوسرے کے دکھ بانٹ سکیں۔“ انور نے اپنی ٹوپی سر پر چھائی اور کھڑے ہو گئے۔

”ہاں کیوں نہیں۔“ بیگم کو لے آؤں گا، مگر بیٹی کی اپنی دنیا ہے یا یوں کہہ لو کہ ہماری بیٹی ہماری نہیں اس آزاد ماحول کی بیٹی ہے۔“ مٹی کے ذکر پر راہی سنجیدہ ہو گئے۔

”اچھا اچھا، سمجھا۔ چلو پھر ملیں گے ڈنر پر۔“

☆☆☆

”دیکھا تم نے منیر! شہلا ہمیں کس طرح انور کر رہی ہیں۔“
 ”ہاں دیکھا اور تمہاری تکلیف کو بھی سمجھ رہا ہوں۔ انسان کے لیے، اس انسان کی بے رخی جسے وہ ٹوٹ کر

چاہتا ہو برداشت سے باہر ہوتی ہے۔ مگر وہ بھی آج کل بہت بریشر میں ہے، والد اپنے بھائی کے بیٹے سے اس کی شادی کرنا چاہ رہے ہیں اور وہ بھی بہت جلدی تو سوچو ذرا وہ لڑکی اپنے نام کے ساتھ کسی اور کا نام لگانا نہیں چاہتی

”واہ تمہارے تو.....“ شمیر نے سموسوں کی ادا نگینی کرتے ہوئے لٹافہ تھا، دونوں یونیورسٹی سے باہر جانے والی روڈ پر آ گئے۔

”کھانا.....“ شمیر نے لٹافہ اس کے سامنے کیا۔ اس نے بے رخی سے پکڑ لیا مگر دل اتنا پریشان تھا کہ کھانے کو نہ چاہا، واپس رکھ دیا۔

”تو..... تو منیر! بتاؤ میں کیا کروں۔ میرے گھر کا روایتی ماحول شہلا کو پسند نہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ میں سب

چھوڑ دوں۔“ شمیر نے سخت کوفت کا شکار تھا۔ روڈ کے کنارے بڑے سے سیم کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا منیر! کیا کروں؟“
 ”دیکھو، تو باقی بن جاؤ اور چھوڑ دو سب کو اور اپنا اپنی محبت کو یا..... شہلا سے دست بردار ہو جاؤ۔“

”نہیں..... نہیں..... میں ان دونوں میں سے کچھ نہیں کر سکتا۔ ہرگز نہیں، کوئی درمیان کا راستہ بتاؤ کہ شہلا میرے گھر میں سب کے ساتھ رہے جیسے اس گھر کی دوسری بہنیں رہتی ہیں۔“ شمیر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اسے

گندہ بڑھکتا ہوا۔
 ”اوکے، دیکھو پھر! میں ایک آخری کوشش کروں گا، اب آگے تمہاری قسمت۔ شہلا تو تمہارے گھر میں یا

اپنے چچا کے گھر۔“ اور پھر منیر کی ٹھٹھکی دھڑکی لائی، شہلانے زیر کو، اس کے گھر والوں کو، مشروط طور پر قبول کر لیا تھا۔ اپنے حراج کی تمام تر تنگ مزاحیوں کے ہمراہ آنے والی برہم باز شہلا کے لیے بھتیوں کی کھکشاں سجادی گئی تھی۔

”ماں صدتے..... میرے زیر پتہ زدی پسندتے سب نوں زیادہ خوب صورت اے۔ ہے ناں سلیم جی!“ بھولی بھالی ساس کی محبت بھری تشریف شہلا کو تو متاثر نہ کر سکی، البتہ دوسری، بھڑوں کو ناراض کر گئی۔

”دیکھا ناں، آپ نے غصہ صاحب! ایسا کرنا.....“

خاندان بھری حسین خاتون ہیں، یکے میں بھی اور سسرال میں بھی۔ مگر ہماری ساسو ماں کو میرے جڑے نظر آئے تو شہلا بیگم میں۔“

اب ہوتا تو یہ چاہیے تھا شہلا اتنی ملنے والی عزت اور محبت کو کسی اعزاز کی طرح یا تو میڈل سمجھ کر گلے میں سجالتیں یا ایورڈ جان کر دل اور نظر کے شوکیس میں سجالتیں۔ انہوں نے تو ان اعزازات کو پاؤں کی زنجیر سمجھ لیا، جس کو تڑوانے کی ہر وقت منصوبے بنایا کرتیں۔

☆☆☆

”اباجی! یہ جو ریفہ ہے ناں بڑا کم چور ہو گیا ہے آپ اس کو کھوتے کا پتر بنائیں۔“ چھ سالہ غزین نے آکر گھر کے کلام کی شکایت کی تو..... چار پالی پر بیٹھ کر حقہ پیتے اباجی ہنستے ہنستے دہرے ہو گئے اور ساتھ غزین کو ساتھ لگالیا۔

”او پتر جی! ریفہ کم چور ہے، تو اسے بندے کا پتر بنانا چاہیے کہ کھوتے کا پتر..... اد میرا بھولا شاہ..... پتر۔“

”کیا بات ہے۔ ملک جی پتر پر بڑا پیارا رہا ہے۔“

”او آپ۔ پتر جی نے گلن ای ایسی کی ہے کہ خیرہ زہیر کا خون آیا ہے، کھد ہا تھا آپاسے ملنے کو دل چاہتا ہے۔“

”ہائے، تو آبا صدقے داری جائے۔ اس کو کہنا تھا ناں کہ اپنی دوٹی کو لے کر آئے۔ جب سے شادی ہوئی ہے اک واری وی نہیں آ یا زہیر شہلا کو لے کر۔ میں اباجی اور اماں ہوراس سے زہیر کی شکایت کروں گی۔“ مزیدہ نے حقہ کی ٹوٹی اتار اور چور بنے ریفے کی طرف بڑھائی۔

”لے، ریفے جھپٹی نال بنا کے لے آ۔“

”او بیگم صاحبہ! شکایت کی ضرورت نہیں، وہ زہیر کھد ہا تھا کہ اس نے شہلا کو گاؤں دیکھنے کے لیے مجبور کر لیا ہے، اس لیے آپ لوگ ذرا چار بندے لگوا کے خولی کی صفائی کروادیں۔“

”ہائے، میں صدقے..... ویسے اکبر جی آپ بھی چالاک ہیں۔ اصل بات بتائی ہی نہیں، آپ فون کرو اس سے پروگرام پوچھو۔ میں خولی کو دوٹی کی طرح سجادوں کی، آ خر میرا سب چھوٹا دیو آ رہا ہے۔“

اور پھر شہلا گاؤں بھی آئی اور ساتھ قیامت بھی لائی۔ مزیدہ اور اس کی بیٹیاں شاداب، نایاب ماں سمیت اس کے ارد گرد گھومتی رہیں۔ اکبر بھی بچھ بچھ گیا، مگر شہلا نے زہیر کا جینا حرام کر دیا۔ گویا..... گاؤں کا دورہ تابوت میں آخری کیل کی حیثیت اختیار کر گیا۔ شہلا کو ہر چیز سے کھن اور بد یو آئی تھی، ہند کا قدم قدم پر بچھ جانا، صدقہ اتارا، سب دقیا توڑی باتیں لگیں اور مزیدہ کا یہ کہنا تو گویا قیامت ہی ڈھا گیا۔

”زہیر! یاد رکھیں اس بات جی بیٹی پیدا ہوئی تو..... وہ میرے غزین کی دہن بنے گی۔ یاد رکھیں، یہ بات میں گھر آ کے سب کے سامنے کروں گی تاکہ سب کو پتا چل جائے۔“

مزیدہ، شگفتہ کی طرح معصوم اور سادہ لوح خاتون تھیں وہ شہلا کی ان نظروں کا مطلب بھی نہ سمجھ سکیں جس سے وہ زہیر کو کچھ رہی تھی۔ مزیدہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ شہلا ان معصوم بھٹیوں کو بچھنے کے بجائے، زہیر کو سب سے چھین کر الگ ہو جائیں گی۔

☆☆☆

”زہیر!“ شہلا زور سے چلائی۔

”زہیر میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی تمہارے گھر والے ابھی تک دور جہالت میں جی رہے ہیں۔ حد ہو گئی وہ وہ وجود جو ابھی..... آ ابھی..... انا کا رشتہ اس گھر سے ہے لڑے..... اف! بہت ہو گئی زہیر! میرا اور تمہارا رشتہ اسی صورت

آ کے باہر ملتا ہے کہ تم یہ سب چھوڑ دو، ورنہ ہائے ہائے۔ میرا کزن ابھی بھی میرا انتظار کر رہا ہے، یہ تو میں ہی پاگل تھی کہ تمہاری محبت میں اس جہالت گھر میں آ بی۔“

”او کے شہلا! سوچتے ہیں۔“

”سوچ کا ہر موزنم پیچھے چھوڑ آئے ہیں، مجھے اس دقیا نوی دنیا میں اب نہیں رہنا، نہ ہی میں آنے والے فیصلہ کرو..... میں یا گھر والے۔“

زندگی ابھی ایسے موز پر بھی لا کر کھڑی کر دے گی کہ اسے شہلا اور گھر والوں میں سے کسی ایک کو چننا ہوگا تو وہ کیا فیصلہ کرے گا۔ نہ ہی محبت کرتے وقت اس نے سوچا تھا کہ شہلا جیسی روشن خیال پڑھی لکھی اور کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی سے محبت کرنا اتنا مشکل بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سوچا ہوتا تو شاید محبت ہی نہ کرتا غراب تو اس کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔

گھر بھر کے افراد کھڑے تھے، شگفتہ خاتون کا رورہ کر برا حال تھا۔ بیٹیں الگ سبک رہی تھیں، بھائیوں نے شاندار کرسمس کے لیے کہا مگر زہیر تو اپنی محبت، اپنی شہلا کو کچھ رہا تھا جو سر پر دو بتار کے بغیر روایت شکن کی تصویر بنی، تن کر کھڑی شوہر کو کچھ رہی تھی۔ وہ کسی رشتے سے متاثر نظر نہیں آ رہی تھی۔ کسی قسم کا سمجھوتہ نہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ تب سلیم صاحب نے چپکی بار شکستہ دل کے ساتھ فیصلے کی تلوار پر لٹکے بیٹے کو دیکھا۔ پھر ملکتی شگفتہ کا ہاتھ

ٹھام لیا۔

”شگفتہ خاتون! آپ زہیر کی والدہ ہیں، شاید آپ ہمارا فیصلہ سن نہ پائیں، بہتر ہوگا آپ اپنے کمرے میں جا بی۔ بشری بیٹی اپنی والدہ کو لے جائے۔“

”جی اباجان! آ بی ای جان۔“ بشری نے آچل سے اپنا چہرہ صاف کیا، شاکی نظروں سے زہیر اور شہلا کو دیکھا اور شگفتہ کو زبردستی لے گئیں۔

”زہیر میاں! ہم دیکھ رہے ہیں آپ فیصلہ نہیں کر پارے۔ آپ بہت مشکل، دکھ اور اذیت کا شکار ہیں۔ ہم آپ کو جانے ہیں، آپ بچپن ہی سے نازک رہے ہیں، فیصلہ کرنے کی صلاحیت شاید آپ میں ہے نہیں۔ خیر اتنا ہم جان گئے ہیں کہ آپ شہلا بیٹی کو نہیں چھوڑ سکتے اور نہ ہم ایسا چاہتے ہیں۔ ہم تو چاہتے تھے رشتوں کا یہ قافلہ پرانے اور نئے رشتوں کے ساتھ منزل کی طرف بڑھتا رہے لیکن شہلا بیٹی رشتوں کی اس مالا کو توڑنا چاہتی ہیں تو.....“ بولنے بولتے سلیم میاں کے سینے میں اک ٹیس سی ٹی ٹی، سلیم اور بیگم آگے بڑھے۔

”اباجان.....“ زہیر نے تو زہیر بھی گروہ جانتے تھے محبوب بیگم کی کڑی نگاہ ان پر ہے، لہذا وہیں جے کھڑے رہے۔ شہلا کی بات پارشتے سے متاثر ہوئے بغیر دعوت سے ہونٹ کیڑے، دیکھ لا رہی تھیں۔

”اباجان اپانی لیجیے۔“ غصی نے آگے بڑھ کر باپ کو پانی پلایا۔ لٹائی سکوت نے سب کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔

”زہیر میاں! آپ کو کچھ احساس ہو رہا ہے کہ اباجان دکھ کے کس خادوار جنگل سے گزر رہے ہیں۔“ بشری بولیں کو کچھ سے میں چھوڑ کر واپس آئی تھیں، باپ کی محبت میں ہمت کر کے زہیر کے قریب آئیں، گی تو انہوں نے سر کو ٹی ٹی گروہ سر گوشی زہیر سے پہلے شہلا کے کانوں سے جا مل گئی۔

”صد ہے، یعنی کہ حد ہے زہیر! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آج کے ماڈرن اور ایجوکیٹڈ ماحول میں ابھی اندھی، بہری بھٹیوں کا واسطہ دے کر، دوسروں کو اپنی بات منوانے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔“

بشری خاتون کی سرگوشی کا جواب شہلا بیگم نے کچھ اتنی آواز میں دیا کہ سب اس کو دیکھ کر رہ گئے۔

”صلی، چھوٹی بھابھی شہلا خاتون ہم نے مان لیا کہ ہم تو نہ اتنے بڑے تھے، نہ روشن خیال، نہ ماڈرن.....“

اس لیے ایسا کر رہے ہیں لیکن آپ تو بہت بڑھی اور روشن سوچ کی حامل خاتون ہیں۔ آپ بھی تو محبت کو تادان کی صورت استعمال کر رہی ہیں، زیر کوا زما رہی ہیں۔“

”بشری خاتون! آپ سے کس نے بولنے کو کہا تھا؟“

سلیم صاحب کو بچی اور بیوہ میں گھراڑ مٹھی پسند نہیں آئی۔ ان کی تیز آواز سے ماحول پر پھر سکوت چھا گیا۔

”خاتون..... خاتون، ہونہ! نہ جانے کس دور جہالت میں جی رہے ہیں یہ لوگ۔ میری مٹھی کئی کدیر کی محبت میں آ کر گھٹائے کا سودا کر چکی۔ آپ انجیم اگر آپ کو لگتا ہے کہ میں غلط کر رہی ہوں تو اپنے بھائی سے پوچھ بیچئے، انہوں انگریز سنٹ سائن کیا تھا کہ میں کچھ عرصہ یہاں رہوں گی پھر ہم الگ گھر میں رہیں گے اور میں نے انعام صرف جو یہاں پر گزارا ہے ایک طرح جو اسٹیکل سسٹم کو ٹیسٹ کیا تھا، وہ بھی زیر کے کہنے پر۔“

شہلا کی نفرت، ان چاہنے والوں کی اچانکیت اور محبت کو روندنی آگے بڑھ گئی۔ زیر نے شدت کرب سے آنکھیں موند لیں۔ کتنا جی چاہا تھا، اپنے اسنے پیارے اور معزز رشتوں کو پامال کرنے والی شہلا کے منہ پر اپنی انگلیوں کو چھاپ دیں مگر وہ ایسا نہ کر سکے۔ ایسا کرنا اس کی تربیت کا حصہ نہیں تھا جہاں ہمیشہ عورت کی عزت کرنی سکھائی گئی تھی اور وعدہ کر کے وعدہ خلافی ان کی مراد تھی تو چن چکی۔ لہذا وہ غلطی میں بھی اپنے اندر اترتے پسینے کے قطرہوں کو محسوس کرتے رہے۔ مگر لب کشائی کی ہمت بھی نہ ہی برأت۔ انہوں نے کھلی آنکھ سے والد کو دیکھنا، بے ادبی سمجھا، ذرا کی ذرا پلٹک اٹھائی۔ کتنے عجیب اور مختلف لگ رہے تھا اباجان، ان کا نوابی جاہ و جلال کہاں چلا گیا تھا۔ شاید ایسی گستاخ اولادوں کے والدین کی عزت یوں ہی دھندلا جایا کرتی ہے اور وہ ڈسے جاتے ہیں۔

”دیکھیے شہلا بیٹی! آپ کے اور ہمارے صاحب زاوے کے درمیان جو بھی معاہدہ ہوا ہے، رشتوں کی سوداگری ہوتی ہے، ہمیں اس سے انکار نہیں۔ آپ اور زیر میاں ہماری طرف سے آزاد ہیں۔ آج ہم ان کو اپنی حقوق یا نامتقولہ جاکماد سے عاق تو نہیں کرتے البتہ اپنی محبت، اپنی شفقت اور قرابت سے عاق ضرور کرتے ہیں۔ آپ دونوں جہاں چاہیں جائیں، رہیں..... لیکن بیٹی! ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے گا، رشتے نبھانے کے لیے ہوتے ہیں، ٹیسٹ کرنے کے لیے نہیں۔ زیر میاں آپ کو اجازت ہے، جائے۔ اپنی دنیا آباد کیجیے، جائے۔“

چھڑی پر سلیم صاحب کی گرفت کمزور پڑ رہی تھی یا وہ خود لرز رہے تھے۔

”ابا جان! ہمیں..... ہمیں معاف کر دیجیے۔ ابا جان اللہ کے واسطے ہمیں معاف کر دیجیے۔ کاش..... کاش ہمیں معلوم ہوتا۔ شہلا انجیم کی محبت کا عفریت ہمیں لوٹ لے گا، ہماری محبتوں کو رشتوں کو مار ڈالے گا تو..... تو ہم گھٹائے کا یہ سودا نہ کرتے، لیکن..... ہم آپ کی اولاد ہیں۔ کچھ وعدوں کے اسیر ضرور ہیں لیکن ہم اپنی بیگم شہلا کو آپ سب کے سامنے متا دینا چاہتے ہیں کہ ان کو یہ سب پسند نہیں تو ہم اپنے وعدے کے مطابق ان کے ساتھ ضرور جارہے ہیں مگر صرف ہمارا جسم ان کے ساتھ جارہا ہے۔ ہمارا دل ہماری روح ہمیں ابا جان کے قدموں میں پڑی رہے گی۔ زندگی بھر جب تک ابا جان ہمیں معاف نہ کر دیں، پھر سے اپنی پیدائش شفقت کی آغوش میں نہ لے لیں۔ چلیے شہلا بیگم! دل اور روح کے بغیر ہمارے اس ڈھانچے کو۔ جہاں چاہیں لے جائیں۔“

☆☆☆

”اتنی معصوم مت، بیوہ بیگم، گویا کچھ نہ جانتی ہو۔ یہ فارم ہے، دوسری شادی کا اجازت نامہ ہے۔“ ساجد نے دانت پیش کر کہا۔

”وو..... دوسری شادی.....“ بیل پھر کے لیے ٹھینک کو اپنے جان جسم سے نکلنے محسوس ہوئی۔ دم گھٹتا ہوا محسوس کیا تھا، وہ مرغ بھل کی طرح تڑپ رہی تھی۔ مانی بے آب کی مانند اور دم گرم، چند ہی قدموں کے فاصلے پر کھڑا تھا شاہ کبہر تھا۔ کمر، قدر زلت آمیز جان، لیوا احساس تھا کہ وہ جس شخص کو بچپن سے جانتی تھی، جس سے

منسوب ہونے کے بے شمار خواب اس کی پلکوں تلے روشن تھے۔ وہ شخص کسی اور کی محبت کا دم بھر رہا تھا۔ اپنی زندگی کو ان محبت کے حصول سے شروع کر رہا تھا، کچھ بھی تھا فیصلہ تو اس کو اس قسم کر کے حق میں کرنا تھا۔ اب چاہے سچے میں دم کھٹ جاتا یا خواب لہو لہو ہو کر آنکھوں سے نکلتے۔

”کیوں، کیا ہوا..... میں تو تمہیں سائن کرنے پر مجبور نہیں کروں گا۔ یہ فاطمی اخلاقی قدر نبھانے کے لیے اور دوسرا اپنی اور تمہاری طرف کے بے وقوف لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے پوری کرنا چاہتا ہوں۔ سائن کرنی ہو یا

وہ جلا دو خنجر پر خنجر چلائے جا رہا تھا جبکہ وہ تو ایک ہی ادار میں فنا ہو چکی تھی۔ بولنے کے لیے ہمت جوڑ رہی تھی۔

”آپ..... آپ تو اپنی مرضی کے بادشاہ ہیں، ساجد میری اجازت کی اگر آپ کو اسی لیے ضرورت ہے سچا آپ نے بتایا تو..... تو بیچئے میں یہ آپ کی اخلاقی مجبوری بھی ختم کرتی ہوں۔ آ..... آ..... آپ منیب سے شادی کر سکتے ہیں۔“ لرزتے ہاتھوں نے اجازت نامے پر سائن کر کے اپنی زندگی میں اپنی سوگن کے لیے دروازے کھول دیے۔

”اب اگر آپ اس انتظار میں ہیں کہ سائن کرنے پر میں آپ کا احسان مند ہو کر شکر یہ ادا کروں گا تو بھول نہ آئی۔ تمہیں میرا احسان مند ہونا چاہیے کہ باقاعدہ اجازت لے کر یہ کام کر رہا ہوں ورنہ.....“ وہ اس کے لڑتے وجود کو سنبھالنے کے بجائے پیپر لیے باہر نکل گیا اور وہ سینے میں اٹھتی ٹیبلٹس کو دہانی۔ پھنسی سانسوں کو سنبھالنے کی لپٹ بیڈروم پر گر گئی۔

☆☆☆

”دیکھو منیب! میں نے ٹھینک سے اجازت لے لی، میں تمہارے لیے یہ سب کر رہا ہوں اور تم کہہ رہی ہو..... یہ یاد آتی ہے۔ تمہارے بھائی نہیں مانیں گے۔“

”ساجد آپ سرور ہیں، سمجھ نہیں سکتے۔ ایک تو یہ کہ ٹھینک کو پریشا ناز کر کے آپ نے اجازت تو لے لی مگر میرے بھائی بھانجی اور..... اور..... دوسرے رشتہ دار۔“

منیب تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ساجد محبت میں یہ بھی کر گزرے گا اس کی ٹھینک کے ساتھ شادی کے بعد تو منیب نے محبت کو نامرادی کی قبر میں اتار کر مہر بھی کر لیا تھا کہ ساجد حد سے گزر گیا۔ نئی نو ٹی دلہن سے دوسری شادی کا اجازت نامہ بھی سائن کر دالا۔ یاد آ کر گزری ہوگی ٹھینک کے دل پر، وہ..... وہ تو اسے بچپن سے جانتی تھی۔ ساجد نے کیا ظلم کر دیا تھا، ہمیشہ عورت ٹھینک کے دکھ کو کچھ سکتی تھی، ہر چند کہ وہ ساجد کو بے حد چاہتی تھی مگر ایک عورت کے شوہر کو بابت کر وہ خوشی حاصل نہیں کر سکتی تھی، اسی لیے اس نے صاف منع کر دیا تو ساجد آپ سے باہر ہو گیا۔

”اوکے، تو تم اس صورت میں بھی مجھ سے نکاح پر تیار نہیں ہو۔ میرے مقابلے میں اب تمہیں اپنے بھائی بھانجی اور رشتے یاد آ گئے ہیں۔ عورت پن یاد آ گیا ہے، لیکن یاد رکھو تم اس طرح انکار کر کے ٹھینک سے کوئی اچھائی نہیں کر رہی ہو۔ تم نے میرے ساتھ نکاح نہ کیا تو کھر جاتے ہی ٹھینک کو طلاق دے دوگا۔“ ساجد شدت۔ ہدایت اور فتنے میں آ پے سے باہر ہو رہا تھا، منیب کا دل کھٹکی میں آ گیا۔

”ساجد! یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”صرف یہ نہیں رہا، کر کے دکھا دو! گا اور اس کے بعد تم، نہ وہ! امیری زندگی میں کوئی عورت نہیں ہوگی۔“

منیب جانتی تھی ساجد جو کہہ رہا ہے کر گزرے گا۔ وہ بری طرح پھنسن گئی تھی۔ بات صرف اس کی حد تک ہوتی تو انکار کر دیتی مگر اب تو ساجد نے ٹھینک کو طلاق دینے کی دھمکی دے دی تھی اور وہ جانتی تھی یہ صرف دھمکی نہیں ہے۔ وہ ایسا کر گزروں گا اور منیب بھی اچھی لڑکی ایک ایسے عرصے میں لڑکی کا تعلق اور ماں کا سہرا نہیں

چاہتی تھی۔

”ٹھیک ہے، ساجد جیسا آپ چاہتے ہیں، میرے بھائیوں سے بات کر لیجیے اگر وہ مان جائیں تو..... مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ کا عمر بھر کا ساتھ ہی میری خوشی ہے۔“

بعض اوقات ہمیں خوشیاں اس طرح مل رہی ہوتی ہیں کہ ہم ان کو اپنا تے ہوئے بھی خوف زدہ ہو رہے ہوتے ہیں۔ ساجد، منیہ کی پہلی محبت بھی اور اس کو پانے کے لیے اس نے اللہ سے کتنی دعا مانگی تھی مگر اس کا ساتھ مل بھی رہا تھا تو اس طرح کہ وہ نہ خوش ہو پارہی تھی نہ رو پارہی تھی۔ یہ اللہ کی مصلحت ہی تو تھی، اس جواب پر ساجد کچھ دیر اسے خاموش نظروں سے دیکھتا رہا پھر چپ چاپ چلا گیا۔

☆☆☆

”بس بھی کریں امی جی۔ رورو کے آپ نے اپنا حال برا کر لیا ہے۔ وہی ہوتا ہے ناں جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ اب ہمت کریں، حوصلہ کریں امی جی! اپنے آپ کو سنبھالیں، میں ابا جان کو دیکھتی ہوں۔“ بشری خاتون نے گھٹتے خاتون کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

زیر کا گھر سے چلے جانا کوئی معمولی حادثہ یا واقعہ نہیں تھا کہ کچھ دیر بعد ہی سب معمول پر آ جاتا۔ گھر کا سب سے چھوٹا، سب سے لاڈلا بیٹا ہمیشہ کے لیے چلا گیا تھا یا نکال دیا گیا تھا۔ وہ تو یہ جانتی تھی زیر چلا گیا تھا، ممتا کے آنگن میں سناٹا ہو گیا تھا اور اب ان کو تا عمر یا نجانے کب تک ان سناٹوں کو لینا کررہنا تھا۔ اب دوسری بہنیں یا بیٹے جتنا بھی ان کا درد ہائے کوشش کرتے، گھٹتے کو لگتا درد بردھتا جارہا تھا۔ ان کے مزاج کی گھٹتے زیر کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی تھی۔ سلیم منزل میں ایک عجیب سوگ کی فضا تھی ہر کوئی دھمی دھمی اور دیران دل لیے ایک دوسرے سے آنسو چھپاتا پھر رہا تھا۔

”ابا جان! اٹھو! سا کھانا کھا لیجیے، آپ کی دوا کا وقت ہو رہا ہے۔“ بشری خاتون نے پہلے اپنے آنسو صاف کیے اور پھر نور الد والد کے منہ کی طرف بڑھایا جو انہوں نے ہاتھ سے پیچھے ہٹا دیا تو زندگی میں پہلی بار بشری، والد کے شانے سے سر لگا کر شدت سے رو پڑیں ورنہ تو وہ گھر بھر میں سنگ دل مشہور تھیں۔ سب کو یہی اعتراض تھا کہ کچھ بھی ہو جائے بشری خاتون کی پلک نہیں جھپکتی۔ آج بھائی کی جدائی اور ماں باپ کی حالت نے ان کا دل خون جگر میں ڈبو دیا تھا۔

”اللہ کرے شہلا خاتون آپ بھی تمام عمر سکون قلب کو ترسیں۔ آپ نے ہمارے والدین کو اولاد کی جدائی اور گستاخی کا صدمہ دیا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو بھی ایسے ہی صدمے سے دو چار فرمائے۔“ ہم انسان ایسے ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور مصلحتوں کو نہیں جانتے سمجھتے، بس کسی سے تکلیف پہنچے تو بددعا دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اب ہمارے مقروض کو بھی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی اپنے اعمال کی، مگر ہمارا رب وہ کرتا ہے جو ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔

☆☆☆

”تو میرے بھائی راہی یہ تھی۔ میری کٹھا کہانی، کبھی کبھی ہم بہت گھانے کا سودا کر بیٹھتے ہیں۔ ایک محبت کے عوض محبتوں کا خزانہ ہی لٹا دیتے ہیں اور میں نے بھی ایسا ہی فیصلہ کیا اور ایک محبت پانے کے لیے محبتوں کا خزانہ ہی لٹا دیا اور آج نتائج بھگت رہا ہوں۔ سیرا بھرانہ خاندان ماں باپ، بہن بھائی..... میں نے سب کچھ گنوا دیا، اس ایک عورت کی خاطر اور اس عورت نے مجھے یہ زندگی دی، دنوں کا سکون، مندرات کا آرام۔

تین بیٹیاں اس ماحول کی پیداوار، اسی ماحول کا حصہ۔ ایک بد مزہ گستاخ، نام ہوائے۔ یہی بیٹا، جس کے عورت اور مرد ہونے کی شناخت بھی مشکل ہوئی۔ لڑکیاں لڑکے اور لڑکا لڑکی بنا پھر رہا ہے۔“ انور خان نے اپنا زخم

نور الد والد کھول کر اپنے نئے دوست راہی کے سامنے رکھ دیا تھا اور پھر ساڑھ نیمبل پر رکھے کئی ٹشو نکال کر چہرہ صاف کیا، راہی نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا۔

”ہمت سے کام لو یا ر! تم تو بالکل ڈھکے گئے ہو، دیکھو۔“

”ہمت..... کیسے کروں ہمت یا ر! راہی میں نے محبت کے میدان میں بڑے گھانے کے سودے کیے ہیں۔ ایک محبت کو پایا ہے، پھر محبتوں کو گنوا دیا ہے۔ کتنا خوب صورت تھا میرا گھر جہاں ابا جان کی خاموش محبت تھی، والدہ کی دعاؤں کا مہتاب بھرا سا رہا تھا۔ سب کچھ گنوا دیا میں نے اس عورت کی خاطر اور یہ مجھے گھر کا سکون دے پائی، نہ بچوں کی دینی اخلاقی تربیت کر سکی۔ خود بھی مغربی رنگ میں رنگ گئی اور بچوں کو بھی اس گندے ہوائے کر دیا۔ میری مثال تو اس بھگتے ہوئے مسافر کی سی ہے، آگے کا راستہ معلوم نہیں پیچھے کے راستوں پر خود اپنے غار بچھا دیے ہیں کہ.....“

اور جانے کب تک انور پچھتاوے کی قبر میں بیٹھے لوح خوانی کرتے رہے اور ان کے سامنے چپ چاپ بٹھے راہی کو بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کن الفاظ انہیں تسلی دیں۔ شش بہت ہو گئی تھی، راہی جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”راہی بھائی! آپ آتے جاتے رہے گا۔ مجھے رویکا کی صورت میں ایک اچھی دوست مل گئی ہے اور میں دیکھ رہی ہوں، انور بھی آپ کے ساتھ بہت خوش ہے۔ ورنہ تو یہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔“ نجمہ نے شوہر کو دیکھا، طنز پر لپکتے نظر۔ انور نے اسے صرف گھورنے پر اکتفا کیا اور راہی کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھے۔ راہی مرد ہونے لگی۔ جی بھائی! ان شاء اللہ اب ہم ملتے رہیں گے اور انور میں تو نہ جانے کیا بات ہے کہ میں کچھ چلا گیا تھا اس کی طرف۔“

راہی نے انور کو دیکھا، جو اب بھی ماضی کی تلخی یادوں کے کرب میں ڈوبا لگ رہا تھا، رویکا زور سے ہنسی۔ ”پلو! نجمہ! اب کم از کم ہمیں ملنے سے روکا نہیں جائے گا۔ اب تم لوگ میرے گھر اور بچوں کو ضرور لانا۔“ اپنی کرپٹ اور دستا نے چڑھاتے ہوئے رویکا نے نجمہ کو دیکھا۔

”ارے بھئی، بچوں کی اپنی لائف ہے ان کا تو نہیں کہہ سکتی البتہ خود ضرور آیا کروں گی۔“

”اوہ کے پھر چلتے ہیں، برف باری شروع ہو گئی تو کلنا مشکل ہو جائے گا۔“

وہ چاروں باہر نکلے تو موسم شدید سرد تھا۔ سب اپنی اپنی جگہ سکر رہے تھے، وہاں سے نکلے ہی تھے کہ برف کی ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔

”اچھا! آن کر دو، راہی کہاں گم ہو۔“ اسکرین پر برف کی پھوار پڑنے لگی تھی، راہی واقعی گم سم سے تھے۔

”ہاں۔“ ”واپس چلا کر راہی نے بیڑا آن کر دیا۔“

”کسی لگس نہیں بھائی!“ راہی نے سادہ سے لہجے میں کہا تو رویکا نے انتہائی طنزیہ شکل بنائی اور باہر چلی گئی۔

”جہاں تھینا دیکھیں نہیں ہے، جیسی تصویر انور بھائی نے تمہیں دکھائی ہوگی۔ تم مرد تو بس خود کو ہی درست سمجھتے ہو۔“

☆☆☆

اور پھر موسم آتے جاتے رہے، رتیں بدلنے لگیں۔ پرانے سایہ دار درخت ختم ہو چکے تھے۔ سلیم منزل میں

سے مہک اٹھا تھا۔ جس رتے پر پہلے ابا جان اور اماں جان فائز تھے اب وہاں گلغفہ بیگم اور سلیم تھے۔ اب وہ دادا اور دادی جان، نانا نانی بن چکے تھے۔ وسیم، بیگم اور غیر کے بیٹے بیٹیاں، دادا جان، دادی جان کہہ کر لپٹا کرتے تو دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرا کر زہیر کے بچوں کو تلاش کرتے۔

”میں نے کہا تسلیم جی! زہیر کے بھی خیر سے بچے تو ہوں گے ناں۔“ گلغفہ ماں تھیں خود پر اختیار نہ رکھ پائیں تو کہہ ہی اٹھیں۔

”ہوں، ہاں۔۔۔۔۔ کیوں نہیں یقیناً ہوں گے۔ بیٹے بھی بیٹیاں بھی۔ ویسے کیا مطلب ہے آپ کا گلغفہ بیگم۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ آپ کیا فضول ذکر لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ مت دل جلایا کیجیے نہ اپنا، نہ ہمارا۔“ پدرانہ شفقت کی رو میں کہہ کر سلیم ایک دم جھینپ کر بات بدل گئے تو گلغفہ نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”دل پر ہاتھ رکھ کر کہو سلیم جی، آپ کو زہیر یادیں آتا۔“ سلیم دل سے اٹھی میسوں کو تختی سے دباتے اٹھ گئے۔

”نہیں۔ اور۔۔۔۔۔ اور آئندہ ایسا سوال مت کیجیے گا۔“

”ابا جان! نماز کے لیے چلے گا یا گھر پر ادا کیجیے گا۔“ وسیم نے آگے بڑھ کر چھری ان کے ہاتھ میں تھمائی۔

”نہیں، ہم مسجد ہی جایا کریں گے جب تک ایک سانس بھی باقی ہے، چلیے اور واپسی پر والدہ کو سمجھائیے گا، میرا ب کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دیں، ورنہ۔۔۔۔۔“

”جی، ابا جان! میں اماں جان کو سمجھا دوں گا مگر آپ تو خود سمجھ دار ہیں ناں، پھر بھی آپ دونوں نے زہیر کی جدائی کو سینے سے لگا رکھا ہے اور گستاخی، معاف، سچ پوچھیے تو ہم سب بہن بھائیوں کو آپ دونوں سے شکایت ہے۔ ایک اولاد کی محبت میں آپ نے ہم پانچ بچوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مزید وہ آپ نے یہاں آنا چھوڑ دیا ہے۔ زہیر ہی آپ کا بیٹا تھا، ہم سب جو آپ کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتے ہیں، آپ دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے۔ مگر آپ صرف ایک زہیر کی محبت میں ہم سب کو بھلائے بیٹھے ہیں۔“

یہ وہ شکوہ اور خیالات و جذبات تھے، جو سب بہن بھائیوں کے تھے مگر ان کی ادا نیکی کی کسی میں جرأت نہیں تھی لیکن آج وسیم نے ہمت کر کے کہہ ہی ڈالا تو سلیم صاحب ذرا لرزے پھر سخت پر بیٹھ گئے۔

”ابا جان اور اماں جان ہمیں ہمارے بھتے مسکراتے والدہ والدہ کو لٹا دیجیے۔“ چند منٹ خاموشی سے گزر گئے پھر سلیم صاحب نے گلغفہ خاتون کو دیکھا۔

”اچھا میاں! نماز تو ادا کریں، واپسی پر سوچتے ہیں۔ کیا کرنا ہے، کس کو کیا لوٹانا ہے اور۔۔۔۔۔ ویسے آپ کی یہ والدہ تو اب بزرگ ہو گئیں ان کی شوشی گلغفہ کی تو رخصت ہو چکی، اب آپ سب کے مطالعے کے بعد ہم نے آپ کے لیے دوسری والدہ لانے کا پروگرام بنایا ہے۔ کیوں گلغفہ خاتون! اجازت ہے۔“ سلیم صاحب کے انداز سے معلوم ہو گیا تھا کہ انہوں نے وسیم میاں کی بات کو سمجھ لیا ہے اسی لیے شوشی سے گلغفہ بیگم کو دیکھا تو انہوں نے شوہر کے شوشی کے پیچھے چھپے مقصد کو سمجھتے ہوئے، ان کو گھورا۔

”وسیم! پتر اپنے ابا جی سے پوچھو اپنی ٹانگوں کے ساتھ مسجد جائیں گے یا ٹانگوں کے بغیر۔“ والدہ کی بات پر وسیم نے دونوں کی پیشانی پر پیار کیا۔

”آپ نے تو دل خوش کر دیا ہے اماں جان! اللہ تعالیٰ آپ دونوں کا سایہ ہم پر تادیر سلامت رکھے۔ چلیے ابا جان! جماعت ہونے والی ہے۔“

☆☆☆

”اپنا خیال رکھا کر وٹمینہ! دیکھو تو کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری۔“ اسماء نے وٹمینہ کے سر پر سرسوں کے تیل کی

”کیا خیال رکھوں آ پاپنا، ساری زندگی اپنا ہی تو خیال رکھا ہے۔ کبھی یہ دوائی کبھی وہ سیرپ۔ اب تو قبر میں ہی سکون آئے گا۔“ وٹمینہ نے حلق میں پھینکے آنسوؤں کے گولے کو پیچھے اتارا اور کروٹ لے کر لیٹ گئی تو اس کے لیے دودھ گرم کر کے لائی، اس کی پھلکی میں زارا نے سن لیا۔

”دیکھ لیا ناں خالہ جان! امی ہر وقت ایسی ہی ہولانے والی باتیں کیا کرتی ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچتیں کہ ہم تینوں کا کیا ہوگا۔“

زارا، سارہ سے چھوٹی اور عمارہ سے بڑی تھی اور کچھ باقی سوچ بھی رکھتی تھی۔ ماں کی زیادہ قریب بھی یہ ہی تھی۔ باپ کے رویے کی وجہ سے اسے اپنے باپ ساجد سے کبھی وہ محبت محسوس نہیں ہوتی تھی جو ہونی چاہیے تھی۔ زارا کی آواز پر وٹمینہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی کیونکہ زارا کی جان پر یمن جانی تھی اگر وہ ذرا بھی بیمار ہوتی۔

”وٹمینہ! کیا کرتی ہو، ہم بیٹیوں کی ماں ہو، اپنا خیال رکھا کرو۔ چلو اٹھو، دودھ پی لو۔“

”ارے بھئی، آپ خالہ بھائی تو میری جان کو آ جاتی ہیں۔ لاؤ۔۔۔۔۔ لاؤ زارا! اور وہ دوا بھی دے دو، کھا کر ایک ساتھ ہی لیٹوں گی۔“ زارا نے دودھ میز پر رکھا اور ماں کو دوا نکال کر دینے لگی، اسی وقت فہد، کرکٹ کا شوقین ہاتھ میں بلا کچڑے، سلام کرنا آ گیا۔

”السلام علیکم گرزا! کیا حال ہے اور سالٹی کیسی ہو؟“ فہد نے شوشی سے پہلے اسماء کو پیار کیا پھر لیٹی ہوئی وٹمینہ کی پیشانی پر پیار، دونوں کی دعائیں پیشیں۔

”جیتے رہو۔ فہد بیٹا! اللہ تعالیٰ تمہاری زندگی دے، بے شمار کامیا بیاں دے۔“ وٹمینہ نے محبت سے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر پیار کیا۔ ماں کے سر کے نیچے تکیہ برابر کرتے ہوئے زارا نے شوشی سے فہد کو دیکھا۔

”بھولی ماں! کامیابی اس کو ملتی ہے جو محنت کرتا ہے اور یہ موصوف جس ٹیم میں ہوتے ہیں اس کو ہر دار کر بیٹیاں بجاتے آ جاتے ہیں۔ سارا دن کچھ کرکڑے ہو کر تنگ کر کے بور کرتے ہیں۔ پھر جب کھڑے کھڑے ٹھک جاتے ہیں تو کسی بھی فیلڈر کو آسان کچھ تھا کر بلا لہراتے آتے ہیں، گویا ڈبل پتھری بنائی ہو۔“ اس بات پر فہد گہری نظروں سے زارا کو دیکھا، اس کے قریب آیا۔

”میڈم! بھڑکی، ی گمان میں نہ رہنا، ایک دن تمہیں کچھ کر لوں گا۔“

”اور پھر ڈراپ کر دوں گا، ہے ناں۔“ زارا مسخرا نہ انداز میں ہنسی تو اسماء اور وٹمینہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

”ان کو منع کریں آ پاپا! ابھی مذاق مذاق میں یہ دونوں سنجیدہ ہو کر لڑنے لگیں گے اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔“ وٹمینہ کی سانس اب بھی زارا نے فوراً ماں کو دیکھا، فہد ہنسنے لگا۔

”تم بھی ناں یار سالٹی! ابویں میرس ہو جانی ہو اور یہ جو تمہاری جھگڑا لوبیٹی ہے ناں، ایک دن۔۔۔۔۔“

”اچھا، اچھا۔۔۔۔۔ میں جھگڑا لوبوں با تم خوش فہم۔“

”اف تو ہے، لگتا ہے تم دونوں کی تو زندگی لڑتے جھگڑتے ہی گزرے گی۔ ہر وقت لڑائی لڑائی۔۔۔۔۔“

”والدہ مجھے گھور کر اپنی آنکھوں کو دیکھی نہ کریں، اپنی اس تنگ چڑی بھائی کو سمجھائیں، جودن بہ دن تیز کر بیڑیوں سے نیچے آ رہی ہے۔“

”بکومت، میری زارا تو سب سے زیادہ تمیز دار، سمجھ دار اور سب سے حسین بیٹی ہے۔“

”ماں پلیز، بس کر دو، بس۔۔۔۔۔ یہ کیا ہو گیا ہے ماں آپ کو، ایک ساتھ اتنے بڑے بڑے بول بول ڈالے آپ نے۔ اف۔۔۔۔۔ اف۔۔۔۔۔ تمیز دار، سمجھ دار، حسین۔۔۔۔۔ اف۔۔۔۔۔ میں سر کیوں نہ گیا ماں آپ کے اتنے بڑے

زین اور داؤد خوش ہو کر دیکھ رہے تھے۔

”ای! میں ذرا سرحد کی طرف جا رہا ہوں۔“

”ہاں، بیٹے چلے جاؤ، مگر دیکھو تو اپنی بہنوں کو۔“

”ای! پلیز! مجھے مت دکھائیں۔ میں ان لوگوں کو اپنی بہن نہیں مانتا۔ جن کے پاس ہم جا نہیں سکتے، وہ آ نہیں سکتیں۔ ہم ہی ان کو جانتے ہیں، وہ ہمیں نہیں جانتیں۔ ابانے ابھی تک شادی اتاؤنس نہیں کی، آپ کو اپنے گھر اور معاشرے میں اپنی بیگم کے حوالے سے متعارف نہیں کر دیا۔ آپ.....“ وہ تو جانے کب تک اپنے دل کی بھڑاس نکالتا رہتا کہ منیبہ نے درمیان میں ٹوک دیا۔

”ارمغان! حد ادب کر اس مت کرو۔ تمہارے ابا جب مناسب سمجھیں گے، ہمیں اس گھر میں لے جائیں گے۔ اپنے گھر والوں سے متعارف کر دایں گے اور پھر تم لوگ اگر ان بچیوں کو بہن تسلیم نہیں بھی کرتے تو ان کو تمہارے ابا کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سمجھے.....! فضول باتوں سے پرہیز کرو۔ بتا ہے ناں باپ کے غصہ کا۔“

”ہونہ، باپ کو غصہ دکھانے کی علاوہ آتا کیا ہے۔“

”ارمغان!“ منیبہ غصے سے کھڑی ہوئی ارمغان نے میز پر پڑی گلاڑی کی چابی اٹھائی اور باہر نکل گیا۔

”ای جان! بھائی ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ جب وہ سب مل کر رہ رہے ہیں، سب کزنز کتنا ہلکا مزا کرتے ہوں گے اور..... اور ہم لوگ اچھوت کی طرح الگ رہتے ہیں۔ بس آپ ابا سے کہیے ہمیں بھی دادا ہاؤس لے کر چلیں، ہم بھی وہاں رہنا چاہتے ہیں، اپنی بہنوں کے ساتھ، کزنز کے ساتھ۔“

داؤد سب سے چھوٹا تھا مگر عمارہ سے بڑا تھا اس کا اکثر دل چاہتا کہ وہ اپنی بہنوں اور کزنز کے ساتھ رہے۔

”میں جانتی ہوں بیٹا! میں بھی ایسا ہی چاہتی ہوں مگر تمہارے ابا جب مناسب سمجھیں گے ہمیں وہاں لے جائیں گے۔“

”اور ابا کب مناسب سمجھیں گے ای!“

منیبہ اسی طرح لڑکوں کے سوالوں میں الجھ جاتیں تو فیصلہ کرتیں، اس بار وہ ساجد سے گھر جانے کا تقاضا کریں گی۔ وہ گھر جو ان کا سرال تھا۔ بچوں کا دھیال تھا، مگر ہر بار یا تو ساجد گھورنے پر اکٹھا کرتے یا ڈپٹ کر بٹھا دیتے۔

”ان لوگوں کو ہم سے غرض ہونی چاہیے اس گھر یا گھر والوں سے نہیں۔“

”مگر ساجد! اب بیٹے بڑے ہو گئے ہیں، سوال کرتے ہیں؟“

”کیسے..... کیسے سوال کرتے ہیں؟ کیا انہیں ہمارے بارے میں کوئی شک ہے۔ کیا ان کو معلوم نہیں کہ ہم نے باقاعدہ شادی کی ہے اور ایک ساتھ نہیں رہتے تو ہیں کچھ میری مجبوریاں.....“

”اور یہ مجبوریاں کب ختم ہوں گی ساجد! کب..... کب ہمیں بھی شناخت ملے گی۔ کب میں بھی اپنے سرال میں ساجد احمد کی بیوی کی حیثیت سے داخل ہوں گی کب؟ میرے بیٹے اپنے دادا کے گھر اپنی حیثیت کے ساتھ جائیں گے، کب.....؟ ساجد کب..... میں بھی اپنے سرال میں اپنے رشتے کے استحقاق کے ساتھ جانا چاہتی ہوں، آخر کب؟“

بیٹوں کے سوالات سے تنگ آئی منیبہ آج گویا پھٹ پڑیں مگر مقابلے پر تھا ساجد جیسا خود غرض، خود پرست شوہر تھا۔

”بند کرو اپنی یہ کب کب کی رٹ..... میں نہ تمہارا بھرم ہوں، نہ ہی تمہارے بیٹوں کا..... سمجھیں! کہ جواب دینا پھروں، وضائیں کروں اور پھر چھمیں کون سی حیثیت، کون سی شناخت چاہیے۔ معاشرے میں میری بیوی کی

مٹی سے بنی رہی ہو۔ بچوں کی ولدیت کے خانے میں میرا نام ہے..... اور کیا چاہیے تمہیں یا ان کو۔“

”اپنے دادا کے گھر میں بچپان اور رشتے چاہئیں ان کو، وہ اپنی بہنوں سے ملنا چاہتے ہیں، ان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، اپنے کزنز کی چٹی انجوائے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں ساجد، میرے بیٹے اور یہ چاہت کوئی ناچار نہیں کہ میں ان کو منع کروں، روک دوں یا ان کا حق ہے۔“

آج منیبہ میں جانے اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی کہ شاید آج ایک بیوی کو نہیں متا کو تکلیف ہوئی تھی اور ایک عورت ہار سکتی ہے، بیوی ہار سکتی ہے مگر ایک ماں جتنی بھی کمزور ہو، اولاد کے حقوق کے لیے کھڑی ہو جاتی ہے اور جب انہوں نے سب کچھ برداشت کر لیا، قبول کر لیا تو وہ لوگ ان کو ان کے بچوں کو قبول نہیں کر سکتے۔

”ساجد! آخر کیا کیاجد ہے کہ آپ ہمیں وہاں لے جانا یا متعارف نہیں.....“

”بس کرو، اب یہ پلچر منیبہ! یہ تم ہو کہ اتنی باتیں سنار ہی ہو مجھے، تمہیں کی جرأت نہیں کہ.....“

”یہ تو بات ہے ساجد! بعض اوقات مظلوم چپ رہ کر ظلم سہہ کر جا رہا تو اتنا طاقتور بنا دیتا ہے کہ.....“

”منیبہ! تم نے آج حد کس کر لی ہے اور..... اور.....“

اور پھر ساجد کا ہاتھ فضا میں لہرایا اور شاید منیبہ کے چہرے پر نشان چھوڑ جاتا۔ اگر زین اپنا موبائل لینے وہاں نہ آ جاتا۔

”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

☆☆☆

سلیم منزل کی کوئٹہ بھی کھل کر پھول بن چکی تھیں۔ سب بچوں پر اپنے والدین یا دوسرے رشتوں کی چھاپ تھی، مثلاً غیر اور گلشن جہاں کے صاحب زادے اپنے نانا جان پر کھٹے تھے۔ وہی دھان پان سراپا، وہی بات اپنے بات اپنا کمزور سینہ بھلا لیتا۔ کتنی ہی دیر کھانتے رہتا، شوق بھی نانا جان کا اپنا تھا، کیڑا بازی۔ بیٹے کی ان ہی خصوصیات پر تو گلشن جہاں کو تازہ تھا، بڑا فخر یہ کہا کرتیں۔

”انشاء اللہ ہمارے سفیر میاں تو اپنے نانا مرحوم پر کھٹے ہیں، ہو بہ ہو۔ کاش ہماری دادی ساس سفیر کو دیکھیں۔ نوابی چھاپ ہے ہمارے سفیر پر، سب تو بقول ان کے، سب تیز تیز ہیں۔ نوابی خون میں ملاوٹ کر دی ہمارے سر صاحب نے، ایک دیہاتی خاتون سے شادی کر کے۔“

گلشن میں اب حمیدہ خاتون کی روح سراپت کر گئی تھی۔ وہ بالکل حمیدہ خاتون جیسی باتیں کرنا شروع ہو گئی تھیں اور اسی طرح غیر صاحب میں دادا کی سوچ گھر کر گئی تھی، ان کو بھی اب پسندیدہ بیگم کی ہر بات بری لگتی۔

سفیر چار بہنوں کا اکلوتا بھیا جان تھا۔ چار عدد بہنیں، اپنی والدہ جیسی تیز طرار، چڑچڑ چڑچڑ چھالیہ چباتیں۔ پڑ پڑ باتیں بناتیں مگر جال ہے جو کسی کو ایک آنکھ بھاتیں۔ خف، مہک، عاتک، صبا کو والدہ کی خاص ہدایات تھیں کہ وہ بڑہ جیمن کی بیٹیوں سے زیادہ بات کر کے اپنے لیے خراب نہیں کریں گی۔ وسیم کی دو بیٹیاں عاترہ اور فائزہ، ٹھنڈے روٹیل، فیصل، جمیل تھے۔ جبکہ کلیم اور فیصلہ کے دو بیٹے ہارون، منصور، بیٹیاں ثناء اور زین تھیں۔ سب کزنز انھی بڑہ رہے تھے، کوئی کالج میں تھا، کوئی یونیورسٹی میں تھا۔ سفیر میاں نے بھی تین ہارنر میں قتل ہونے کی پیشک کے بعد چوتھی بار امتحان روائتی نمبروں سے پاس کر لیا تھا۔ اب مسلسل کہہ رہے تھے۔

”اماں جان! ہم بھی جمیل اور فیصل کی طرح یونیورسٹی جائیں گے۔“

”جانے دیجیے سفیر میاں! کیا کیجیے گا اتنا بڑہ کر، ہم نے اپنے اکلوتے سچوتے سے نوکری تو کروانی نہیں۔ آپ اپنے والد صاحب کا کاروبار سنبھالیے گا اور ویسے بھی ہم نے سنا ہے یونیورسٹی میں اکثر حالات خراب رہتے ہیں، گولہ مار دو کا استعمال بھی ہوتا ہے۔“

”ارے اماں جان! یہ..... یہ سب دیکھنے کے لیے ہی تو ہم بھی یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتے ہیں۔ بس ہم داخلہ لیں گے۔“ سفیر میاں بچوں کی طرح تھکے۔

”جیسے جیسے سفیر! یونیورسٹی ہے کوئی چیز یا گھر تو نہیں کہ آپ وہاں داخلہ لیجیے گا۔“

”دیکھیے جیل بھیا! آپ ڈھکے چھپے الفاظ میں ہمیں بند رکھ رہے ہیں۔“

”حالانکہ اس میں ڈھکی چھپی کون سی بات ہے۔ وہ میرا مطلب ہے سفیر! آپ فکر نہ کریں ہم یعنی ہم نواب ابن نواب، ابن نواب ہارون حکیم اللہ آپ کا ساتھ دیں گے۔“

”بالکل، ہمیں بھی یقین ہے، ہارون میاں آپ کا ساتھ ضرور دیں گے، آخر ایک بندو ہی دوسرے بندر کا دکھ کچھ سکتا ہے۔“ عازرہ شرارتاً میدان میں اتری تو ہارون نے کشن اس کی طرف اچھالا، جو فیصل نے سچ کر کے صوفے پر رکھا۔

”لیجیے، بی میٹڈ کی کو بھی زکام ہو۔“

”جی ہوا اور جھینکوں کا نزول بھی آپ پر ہی ہوگا“ آ..... آ..... آ چھی۔“ عازرہ نے مصنوعی چھینک شمعوں پر ماری تو شمعوں نے قریب کھڑی زیب کے دوپٹے سے چہرہ صاف کیا تو وہ چہرے مارنے لگی۔

”شمعوں کے بچے۔“ اور پھر آگے پیچھے بھاگا دوڑی ہونے لگی تو سخت پریشانیوں سے چپکے سے اپنے آنسو آچل میں سمیٹ لیے دکھ کی اک لہر اندر تک اتر گئی۔ اخبار کی اوٹ میں سلیم صاحب نے محبوب بیگم کے حسین چہرے پر اتنی شام میں زہر کا عکس دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے اخبار سمیٹ کر ایک طرف رکھا، ان کو معلوم تھا کہ اب شگفتہ ان کی وجہ سے زہر کا ذکر بھی نہیں کر سکیں گی۔

”کیا سوچ رہی ہیں شگفتہ خاتون! آپ، وہ ہی نہ جو ہم سوچ رہے ہیں۔“

”اب مجھے کیا پتا کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔“

”آپ کو پتا ہے شگفتہ خاتون کہ ان سب بچوں کو دیکھ کر ہمیں زہر کتنا یاد آتے ہیں۔ وہ کہاں ہیں، کس حال میں ہیں اور..... اور.....“

”اور اس کے کتنے بچے ہیں۔ کتنی بیٹیاں اور کتنے بیٹے ہیں سلیم جی! اگر..... اگر آپ نے اس کو نہ نکالا ہوتا تو..... تو اس کے سونے سونے منڈے کڑیاں یہیں ان سب بچوں کے ساتھ ہنسنے کھیلتے نظر آتے۔ مگر..... مگر.....“ شگفتہ کو تو شانہ چاہے تھا اور آج سلیم صاحب نے خود شانہ پیش کر دیا تھا۔

”شگفتہ خاتون! آپ تمام عمر ہمیں الزام دیتی رہیں کہ ہم نے آپ کے آئینے کا پھول تو ذکر پھینکا ہے، آپ اس بات پر غور کیوں نہیں کرتیں کہ زہر کی بیگم نے معاملہ آریا کر دیا تھا اور.....“

”داوی جان..... داوی جان!“ زیب، عاتکہ اور فیصل خوشی سے بھاگتے آگئے۔ شگفتہ نے جلدی سے آنسو صاف کیے۔

”کی ہویا پتر! قارون کا خزانہ ہتھ لگ گیا۔“

”ابج ای مجھو داوی جی اوہ..... وہ زین بھائی اور بڑی پھوپھو جان آرہے ہیں۔“

”اچھا، شکرا اسے کو بھی اپنی ماں کا خیال آیا۔“

”داوی جان! آپ پھوپھو سے کہیں تا کر شالی اور تابی کو لے آئیں، بڑا احرا تا ہے جب وہ لوگ آتی ہیں۔“

”ارے تو وہ پچیاں نہیں آرہیں۔ روگوں خود میزہ سے بات کرتا ہوں، رو جیل میاں ذرا اپنی پھوپھو جان کا نمبر تو ملائے۔“

”جی دادا جان! ابھی لیجیے لیکن موبائل اپنا دیجیے، وہ ہمارے موبائل میں کچھ گڑبڑ ہے۔“

”دادا جان! کوئی گڑبڑ نہیں ہے، بس اپنا سٹیلس پچانا چاہتے ہیں۔“

”پپ..... پپ.....“ زویل نے زیب کو گھورا۔

”ارے بھئی، کیا حرکت ہے۔ اماں جان آپ بھی ناں ہر وقت بچوں کی فضول باتوں میں شامل رہتی ہیں۔“

”سب کی سب لڑکیاں یہاں جمع ہیں، وہاں باورچی خانے میں کون ہے؟“

”کاشن جہاں گھر کے امور خاندانہ داری کے وزارت کے عہدہ پر فائز تھیں۔ گھر کی لڑکیوں کو کوکنگ سکھانے اور کھانے پکانے کی ذمہ داری تھی اس لیے وہ اس معاملے میں لڑکیوں پر کڑی نگاہ رکھتیں۔“

”ارے چچی جان! اکیلا تھوڑی ہے، تین دن دو دن، دو دن دو دن، بے حساب برتن، برتنوں کی دو عدد بڑی الماریاں اور چار کرسیوں والا ڈائننگ ٹیبل بھی تو ہے کچن میں۔“ عازرہ کی شوخ بات پر کشن جہاں نے اپنی کاجل سے بھری آنکھوں سے اسے گھورا۔

”عازرہ خاتون! اگر آپ کی والدہ مدہ جبین کا تعلق اماں جان کے علاقے سے ہے تو اس کا ہرگز مطلب نہیں کہ آپ بعد ادب بھول کر گستاخی کریں۔ چلیے، باورچی خانے میں، کباب کا قہرہ میں دیجیے۔ خیال رہے قہرہ سل چھینا ہے گرائنڈر میں نہیں..... اور عازرہ آپ چچا تئوں کے لیے آٹا گوند لیجیے اور تھوڑا سا آٹل ڈالنا مت بھولے گا۔“ اسی طرح کشن جہاں نے ساس، سر کے سامنے گھر کی لڑکیوں میں تمام کام، نیاز کی طرح بانٹ دیے۔

”اور چچی جان! یہ جو چار عدد خواتین ہیں، مطلب عاتکہ آبا، صبا آبا اور شفق، مہک کیا کریں گی۔“ چچی جان کی اس بے انصافی پر زیب غصہ ہوئی۔

”ارے لڑکیوں! تم بھی ناں کمال کرتی ہو، یہ چار عدد خواتین فارغ تھوڑی بیٹھیں گی۔ ارے بھئی ان کا کام تو کم لوگوں سے زیادہ مشکل ہوگا، کیوں شمعوں بھیا!“

”اور نہیں تو کیا، عاتکہ آبا تم لوگوں کا بہتا ہوا پسینہ چائے گی، مطلب اپنے دوپٹوں سے صاف کریں گی، صبا آبا بہتی تاک کے نیچے ہاتھ رکھیں گی اور شفق مہک تو.....“

”شمعون!“ اس آواز پر سب مڑے۔

☆☆☆

”اوئی تمہارا نہیں خیال کہ ہمیں اپنا ایک بیٹا بنانا چاہیے اور وہ کچھ تاخیر و اج (آواز) تے بالکل کوئل درگی آ۔“ مائیکل گنار بڑا اودیا بجاندا۔

”ہوں ناٹ اسے بیٹا بیٹا، واٹ یو سے۔“ مائیکل اینڈ جی۔ ”ہر ت سگھ کی آئیڈیے پر سب سے پہلی ٹی نے پسند کی کی مہر لگا کی تو جی نے بے معنی سے شانے اچکائے، مائیکل نے انگوٹھا اکر منگوری دی۔“

”اور..... اور..... تم کیا کرو گے ہر ت سگھ۔“

”اوکڑے! آئی ایم گڈ پوسٹ، میں گانے لکھوں گا، دھن بناؤں گا۔ تمہارے ساتھ مل کے گاؤں گا وہی۔“

”وہ سب ٹھیک ہے ہر ت! یونو، مائی فادر تو کھل دیسی مین۔“ ٹی نے مائیکل کے گٹار کے تار پھیرتے ہوئے اس سے کہا تو مائیکل جو کہ ایک بار اسی سے ٹی کا ہاتھ پکڑنے کی سزا میں بری طرح پٹ چکا تھا، سخت غائب رہتا تھا۔

”ہونہ، بیک ورڈ۔“ مائیکل ایک طرف ہو کر گٹار کے تار کسے لگا۔ جی چپ چاپ باتیں سنتی، اس وقت اس کا پی ہاؤس نہیں آئے تھے، اس لیے یہ لوگ مزے ازارہے تھے۔

”اوئی تو اپنے پاپا کی کوکھی کیوں نہیں اوسن لیا کہ وہ ویسی آدی ہے، مسلمان ہے، رابرٹ کا تلو۔“

لکڑی کی دکان



سمندر میں جمال مار کے سکا (خٹک) نہیں رہ سکتا۔ خیر حمد اس بات کو، یہ بتا تم لوگ بینڈ بنار ہے ہو کہ میں کروں کوئی اور بندوبست۔“ ہر ت نے یک کا بڑا سا کھلا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔
 ”ہر ت ایک دن رک جاؤ، ہمارے ایک انگل ہیں انور خان، ان کی بیٹیاں اور بیٹا بھی ہے۔ ہم ان کو بھی اپنے گروپ میں شامل کر لیتے ہیں۔“ ٹی جو کسی گہری سوچ میں تھی، ایک دم چوٹی۔
 ”ہاں تو ٹھیک ہے، کر لیتے ہیں۔ دیت، آ یاں تو کا دی جلدی آ، کہڑی سا ڈی ٹرین چھٹ دی پئی آ۔“
 اسی دوران ٹی نے گلاس وال سے باپ کی گاڑی رکھی دیکھی اور ان سب کو اشارہ کیا اور وہ لوگ پچھلے دروازے سے نکل گئے۔

☆☆☆

”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو نجرا ہم پاکستانیوں کی بیٹیوں کے لیے رشتوں کا بڑا راہنم ہو جاتا ہے۔ میری تو ایک ہی بیٹی ہے، تمہاری تو تین بیٹیاں ہیں۔“ انور اور رانی سوچ کے ایک بیج پر تھے، اس لیے اچھی دوستی ہوئی تھی اسی طرح نجم اور روبیکا ہم خیال تھیں۔ گراب جبکہ اس ماحول میں ہل بڑھ کر نجم کی بیٹیاں بھی شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھیں تو اچھے رشتوں کے لیے پریشان تھیں۔

”اس لیے میں تو بہت پریشان ہوں، روبیکا تم ہی بتاؤ کوئی رشتہ نظر میں ہے تو، ملا کیوں کی عمر میں اب شادی والی ہو رہی ہیں۔ انور ہر وقت مجھ سے اسی بات پر لڑتا ہے کہ تم کشتیاں جلا کر آ گئی ہو ورنہ کتنے لڑکے تھے میرے خاندان میں۔ لیکن بھائیوں کے لڑکے تھے، بات تو اس کی درست ہے مگر.....“

”ہاں، تو تم نے ایسا کیوں کیا، واپسی کا راستہ کھلا چھوڑ دینا چاہیے۔“
 ”بس! مجھے وہاں کا دقیقہ تو سی ماحول پسند نہیں تھا۔ نہیں رہنا چاہتی تھی میں جو اعلیٰ فیملی سسٹم میں سب رشتے ایک جگہ، ایک گھر میں، ایک سسٹم کے پابند اور میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے بیٹے بھی اس کنوار ماحول کا حصہ بنیں، ہر وقت سانس سر کا خوف سوار رہتا۔ یہ کہتا وہ نہیں کہنا اور سب سے بڑھ کر میں انور کو ان سب رشتوں میں کسی شکر بنا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ حق تو یہ ہے کہ میں انور کی محبت اور توجہ کو کسی بھی رشتے کے ساتھ شکر نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے کڑوا گھونٹ بھر اور نکل آئی اور میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ انور پر میرا حق تھا لیکن اب انور ہر بات کے لیے مجھے قصود اور کہتا ہے۔ بچے اس ماحول کے ہو گئے، یہ بھی میرا قصور گردانتا ہے۔ تم..... تم بتاؤ اور ہم کیا کرتے ہیں۔“ نجم مسلسل بول رہی تھی، کھڑکی سے باہر ہوتی برف پھوار کو دیکھتے ہوئے روبیکا اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”ہوں، ٹھیک کہہ رہی ہو۔ ہمارے شوہر حضرات بالیے بے شمار پاکستانی لوگ بڑی جاہت سے بددوس تو آتے ہیں، بچوں کو مغربی ماحول کی گود میں ڈال کر خود اپنی زندگی میں مکانات میں بڑی ہو جاتے ہیں۔ بچوں کے بگڑنے پر یا شادیوں کا سوچ کر ایسی ہی باتیں کرتے ہیں جیسی تم کر رہی ہو۔“

”پھر..... پھر مجھے کوئی پچھتاوا تو نہیں، بس لڑکیوں کے لیے اچھے لڑکے مل جائیں۔“
 ”ارے بھی نجم! اتنی پریشانی کی بھی کوئی بات نہیں، پاکستان سے بہت سے ملو آتے ہیں۔ انگلینڈ میں سیٹ ہونے، مکانات کے لیے، ایسے لڑکے مل جائیں گے..... ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی نجم کہ تعلقات تو تمہارے سسرال والوں سے خراب ہوئے تھے ناں، اپنی فیملی میں لڑکے دیکھو ناں۔“

”ہوں، خیر چھوڑو اس بات کو۔ تمہارے اسٹور اور کافی ہاؤس میں تو بہت لڑکے آتے ہیں۔ رانی بھائی تو پاکستانیوں ہی کو پرموٹ کرتے ہیں ان میں سے دیکھنا۔“
 ”ہوں، اوکے۔“ روبیکا پر خیال انداز میں کھڑی ہوئی۔

”یہ تم اپنا جانور ہمارے بکروں کے ساتھ کس خوشی میں باندھ رہے ہو؟“ کمر پہ ہاتھ ٹکائے چاندنی نے تھانیداروں والے انداز میں سوال کیا۔

”یار وہاں اکیلا شور مچا رہا ہے۔ میں نے سوچا یہاں اپنے ساتھیوں کے پاس اطمینان سے رہے گا۔“ انمول نے دہنے کی رسی نلکے کے پاپ کے ساتھ باندھتے ہوئے کہا اور پھر اس کی پیٹھ پہ ایک چھکی مار کر واپس چلا گیا۔

دہنے نے فرش پہ پڑے پٹوں کے ڈھیر میں جھٹ منہ مارا اور مزے سے پیٹ پوجا کرنے لگا جبکہ پورچ میں چاندنی کھڑی بس ناک منہ چڑھائی رہی۔ اس کے کانوں میں اب تک انمول کے الفاظ گونج رہے تھے۔

”اللہ کا خوف کریں خالہ کون سا چکر کون سے ڈھکن، میرے اتنے برے دن نہیں آئے جو اس جنگلی مٹا سے چکر چلاؤں میں۔“

اس بات کو وقت ہی کتنا گزرا تھا۔ گوبات تو اسی وقت ختم ہو گئی تھی لیکن انمول کے کبے لفظ چاندنی کے دل پہ نقش ہو چکے تھے۔

خود تو وہ لائٹ صاحب عید کی چھٹی گزار کر واپس چلا گیا تھا اور اب کل رات ہی چلا تھا۔ صبح ہی اس نے احتشام پچا کے ساتھ جا کر قربانی کے جانور لیے تھے۔ گھر میں ایک احتشام پچا ہی تو تھے جنہیں ان سب چیزوں کا شوق بھی تھا اور تجربہ بھی، اب انمول بھی اس باران کے ساتھ چلا گیا۔ ان کے تین بکرے آئے تھے لیکن انمول نے دہنہ خرید تھا لیکن چند گھنٹوں بعد ہی وہ اپنا دنبہ ان کے بکروں کے ساتھ باندھ کر چلا گیا تھا۔

”پیلے ہی ان تینوں نے“ میں میں“ کر کے سر میں دوڑ کر دکھائے اور اس انمول کے بچے کو دیکھو اس چوتھے کوچی ہمارے سر پہ چھوڑ گیا ہے۔ وہ جل کر اپنی اپنی دو ماہ پرانی خناس نکال رہی تھی۔

گھر میں کسی کو اس متعلق علم نہیں تھا۔ اتنی شدید گرمی اور جھبی کے دنوں میں سب خواتین اپنے اپنے کمروں میں کھسی تھیں اور بچے بڑے کمرے میں لی دی میں منہ دیے بیٹھے، مخوس ڈورے مون دیکھ رہے تھے۔ جب دو بار نکل بجانے پر بھی کسی نے دروازہ نہیں کھولا تو مجبوراً اسے ہی باہر نکلا پڑا اور سامنے مل گیا انمول، جس کی آمد کی اطلاع تو اسے کل رات ہی ملی تھی البتہ ملاقات اس بختی دوپہر میں ہو رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی چاندنی کے ماتھے پہ ناگواری سے مل نمایاں ہوئے تھے لیکن دوسری طرف اس کا انداز بڑا ہی دوستانہ تھا۔ یقیناً وہ پرانی باتیں بھول گیا تھا اور چاندنی کا اس کو ”گنڈو“ کہنا بھی۔ لیکن چاندنی کے تو دل پہ نقش تھے۔ کمر پہ دونوں ہاتھ ٹکائے وہ گہری سوچ میں اب بھی وہیں کھڑی تھی۔ دماغ اس وقت سازش کا جال بن رہا تھا اور پھر اچانک دماغ کی جی جمل گئی تھی۔

”واہ کیا ہی زبردست آئیڈیا آیا ہے اس انمول سے بدلے لینے کا۔“ پلان سوچ کر اس نے دل میں چیخ کر کہا اور دونوں ہاتھ ملتی پورچ کی طرف بڑھی۔ مین گیٹ سے کچھ فاصلے پہ پورچ کی صفائی کے لیے ایک تل لگا ہوا تھا جس کے ٹوہے کے پاپ سے سب جانوروں کو باندھا گیا تھا۔ تینوں بکرے قطار میں بیٹھے جو گالی کر رہے تھے۔ انمول کا دنبہ بھی پٹوں کو منہ مار کر اب سستی سے کھڑا تھا۔ چاندنی نے آگے بڑھ کر جھٹ اس کی رسی کھول دی۔ دنبہ جو بیٹھنے کے چکر میں تھا آزادی کا احساس ہوئے ہی چو کنا ہو گیا۔ ”گھر میں تو کوئی جانتا ہی نہیں انمول اسے یہاں باندھ کر گیا ہے اور میں صاف مکر جاؤں گی۔ اب اگر یہ بھاگ گیا تو انمول کچھ بھی ثابت نہیں کر پائے گا۔“ چھوٹے دروازے کی کنڈی کھولتے وہ شیطانی انداز میں ہنسی اور پھر سامنے سے ہٹ کر دوسری طرف کھڑی ہو گئی۔ دنبہ رسی کھٹکنے کے بعد مزے سے مزگشت کر رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چاندنی کی طرف بھی منہ

اٹھا اور پھر اچانک اس نے کھلے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ ہاتھ پہ ہاتھ مارتی چاندنی نے تین منٹ کی تیار کر رہی تھی کہ دروازے کے باہر سے دروازہ پھوپھو کی چیخ سنائی دی۔

”یا اللہ یہ کس طرح باہر نکل آیا۔“ چاندنی کی دہنہ کھانے کی خوشی منٹوں میں دفن چکر ہوئی تھی۔

”انف اب یہ پھوپھو اس سڑی دوپہر میں کون دور ہے۔ نکل آئی ہیں۔“ سر پہ ہاتھ مارتے وہ دروازے کی طرف بڑھی لیکن دروازے تک پہنچنے نہیں پائی۔

باہر سے پھوپھو کی آوازیں سن کر اندر بیٹھے لوگوں نے عبادت کر دی اور چنگلی کا پروگرام کینسل کر کے لڑے ہوئے بلکے ایک نے تو بڑے ابا کی لڑائی دوسرا سیکل کو ٹکر ماری اور بائیک گرا کر گیٹ ہی ہلاک کر دیا۔ اس جارحانہ اقدام سے خوف زدہ ہو کر چاندنی وہیں کھڑی رہی البتہ باہر الگ کمرام چلا ہوا تھا۔ بلروں اور بائیک کی رکاوٹیں عبور کر کے وہ دروازے کے آگے مشکل ہی نہیں ناممکن ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اب وہاں کچھ یوں کہ ادھر کھلے دروازے سے باہر لگا اور دروازہ پھوپھو کی آمد ہوئی۔ یہ اطلاع تو ان کو بھی تھی کہ اس بار دنبہ انمول لایا ہے۔ لہذا فوراً سے پہلے منہ مل ہو گیا۔ پہلے تو شور مچایا ساتھ ہی آگے کی رسی پکڑ لی لیکن وہ برخودار بھی آزادی منا رہے تھے۔ لہذا کمزور کے چکر میں ایسا داد چلایا، رسی پھوپھو نے ہاتھ سے نکلے سو لگی جھٹکا لگتے سے، وہ وہیں جا کر اور لٹکس وادیا جانے۔

”ارے باہر نکل کر دیکھو کم بختوں دنبہ بھاگ رہا ہے۔“ کمر پہ ہاتھ پھوپھو نے پکارا۔ اچانک ہی اسے یہاں نے بھاگنے کا ارادہ ترک کیا اور پلٹ کر پھوپھو کو ٹکر ماری۔

”ہائے میں مر گئی یہ مخوس مارا تو ساڈ کی طرح

نکر کر مار رہا ہے۔ ارے کوئی ہے کہ سب مر گئے۔“ تڑپ کر پھوپھو ایک جست میں کھڑی ہوئیں۔ ساتھ ساتھ کھٹنے اور بد عاؤں کا کورس بھی جاری تھا۔

”میں آتا چاہو رہی ہوں پھوپھو لیکن یہ بکرے راستہ روک کر کھڑے ہیں۔“ اپنی گناہ گار آنکھوں سے چاندنی نے دہنے کی پھوپھو کے ساتھ ٹکر بازی دیکھی تھی لیکن افسوس وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ بکروں کی فورس راستہ ہلاک کیے جو کھڑی تھی۔ وہ تو اس بل کو کورس رہی تھی جب دنبہ کھولنے کا منصوبہ ذہن میں آیا۔ سارا کھیل الٹا ہو گیا۔ پھوپھو اس دنبہ ٹکر کے بعد تو ایک کی دس لگا کر سنائیں کی اور جو بے عزتی گھر والوں نے کرنی ہے اس کا تو شمار نہیں۔

”بکرے ہیں کہ ٹرار جو راستے روک رہیں۔ یہ کیوں نہیں کہتی مخوس پھوپھو کو مروتانا چاہتی ہے۔“ پھوپھو نے جیسے ہی تیزی دکھاتے ساڈ ماری اور دہنے کی اگلی ٹکر سے بچ کر کھڑی ہو گئیں۔ جھٹ سے کپڑے جھاڑے اور فرار کی راہ لی۔ چاہ نہیں دہنے میاں کو پھوپھو بے چاری میں کون سا قوی دشمن دکھائی دیا تھا جو بلا وجہ کی دشمنی لگالی۔ لیکن اس بار پھوپھو بھی دشمنی طور پہ تیار تھیں لہذا بھاگ کر کیاری میں ٹھس گئیں۔ دنبہ بھی ان کے پیچھے لپکا۔ کیاری میں امرود کا درخت لگا ہوا تھا۔ پھوپھو نے درخت کے سنے کو پکڑ کر اس کے گرد گول گول چکر لگانے شروع کر دیے۔ دنبہ بھی اسی چکر چکر میں چکر لگانے لگا۔

”ارے چاندنی بجا مجھے۔“ پھوپھو نے دہائی دی لیکن چاندنی باہر نکل نکلتی تو بچانی۔ اسے تو اب اپنی جان بچانے کی فکر ہو رہی تھی۔

سامنے گلی سے آتے انمول نے اپنی گناہ گار آنکھوں سے پھوپھو اور دہنے کو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دیکھا۔ وہ گھر سے پیچھے رکھے آیا تھا۔ اب یہ تو اس کی چھوٹی سی عقل سمجھنے سے قاصر رہی کہ ان دونوں میں سے کون کس کے پیچھے لگا ہوا ہے البتہ پاس آنے پہ پھوپھو کی آہ و بکا نے کچھ کچھ صورت

بار پھر شروع ہو گئے۔

”ہائے تو ہمارے محلے میں سب بھیجتے ہیں نا میرے گھر گوشت۔ ماشاء اللہ ہر سال اتنا سارا اکٹھا ہوتا ہے۔“ پھوپھو ایک دم ہی پھیل گئیں اور دونوں ہاتھ گلو میٹر کے حساب سے کھول کر انہوں نے وہ اتنا سارا گوشت بیان کرنا چاہا جو ان کے ہاں عید کے موقع پر اکٹھا ہوتا تھا۔ اس لیے چوڑے جھوٹ پتہ احتشام چچا نے واقعی سر پکڑ لیا۔

”ویسے تجھے کس چیز کی آگ ہے تجھے تو کبھی تو فتن نہیں ہوئی بہن کے گھر دو بولیاں بچھو اڑے۔“

اور اس جھوٹ پہ اب سر پکڑنے کی باری دادی کی تھی۔

”اوہ شکوے شکایتوں کی پوٹلی۔ یاد کر پھیلے سال بکرا بھیجا تھا پورا۔“ احتشام چچا بھی ان کی عادت سے واقف تھے لہذا برا منائے بغیر صرف شرم دلانے پر اکتفا کیا تھا۔

”ہاں تو کوئی احسان نہیں کیا تھا بھائی بھیجتے ہیں سب کے۔“ اب وہ پھوپھو ہی کیا جو احسان مان جائیں۔

”لو ابھی مجھے قصائی کہہ رہی تھی۔“ ہاتھ پہ ہاتھ مارتے احتشام چچا نے اس بیان بدلنے پہ تہقید لگایا۔ ایک ساتھ سب کے ہی رکے ہوئے قہقہے گونجنے لگے تھے کہ کمرے کی چست اڑنے کا خطرہ لاحق ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ دردانہ پھوپھو برا مان جاتی اور نقص امن کی صورتحال پیدا ہوتی رضیہ پھوپھو نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کر دیا تھا۔

”اچھا تم لوگ اپنی بحث بند کرو تو میں بتاؤں کہ دردانہ کو میں نے یہاں اس لیے بلوایا ہے کیونکہ ایک بہت اہم بات کرنی ہے۔“ سب ایک ساتھ پھوپھو کی طرف متوجہ ہوئے تھے جو جیسے جیسے مدعا بیان کر رہی تھیں ہر شخص کے چہرے پہ مہرند اور

نا قابل بیان تاثر دکھائی دے رہا تھا۔

☆☆☆

عید کے اگلے روز ہونے والی چاندنی اور انمول کی منگنی کی خبر نے ایک ساتھ پورے گھر پہ ہم پھوڑا تھا۔ رضیہ نے سب کی موجودگی میں چاندنی اور انمول کے رشتے کی بات کی جو عالیہ نے جھٹ جھٹ کر لی۔ دیگر اہل خانہ تو دور خود چاندنی یا انمول سے بھی کسی نے پوچھنا گوارہ نہیں کیا تھا۔ رضیہ نے فٹ فٹ منگنی کا دن بھی وہیں بیٹھے طے کیا۔ ان دونوں کو ان کی ہی منگنی ہونے کی اطلاع جیسے ملی اس سے زیادہ اہتمام سے لوگوں کو دوستوں رشتے داروں کی شادیوں کی خبر پہنچائی جاتی ہے۔ حیرت اپنی جگہ لیکن گھر میں کسی کو بھی اس رشتے سے اعتراض نہیں تھا کیونکہ سب نے ہی خوش ہو کر مبارک باد دی۔ بظاہر تو دردانہ پھوپھو بھی سب سے بڑھ چڑھ کر بلکہ اڑاڑ کر مبارک بادیں بھائی اور بہن کو دے رہی تھیں لیکن کچھ ہی دیر بعد چھوٹی چچی کے کمرے میں خفیہ میٹنگ بجائے دل کا حال لیوں پہ آگیا تھا۔

”کہا تھا میں نے اندر ہی اندر کچھوی یک رہی ہے۔ اب آگیا ناچ سب کے سامنے۔“ ہاتھ پہ ہاتھ مارتے انہوں نے رازداری سے چچی کو مخاطب کیا۔ چچی ٹھہری سدا کی چٹھوری اور موقع ملا خدا کر کے، سو گئیں چسکے لینے۔

”ہاں باجی بات تو آپ نے بالکل صحیح کی تھی۔ واقعی تو اندر خانے رشتے کی باتیں کر رہے تھے۔“ ٹھوڑی پہ ہاتھ دکائے حیرت سے بولیں۔

دھیمی آواز میں دونوں کو سر جوڑے بیٹھے گٹ پٹ کرتے احتشام چچا نے دیکھا تو کان کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے مزاج سے وہ بھی اچھی طرح باخبر تھے۔

”کون سی کچھوی؟ کیسی کچھوی ذرا ہمیں بھی

پتا چلے۔“ وہ بھی ان کے پاس ہی آکر بیٹھ گئے۔

”بھئی کہ باجی اور بھائی اپنے بچوں کا رشتہ طے کر رہے ہیں۔“ پھوپھو نے ہاتھ نچاتے کہا۔

ان کا خیال تھا شاید احتشام چچا بھی ان سے متفق ہوں گے لیکن وہ کہاں ان کے ساتھ ملتے تھے۔

”لیکن اس میں کچھوی کون سی ہے دردانہ۔“

”بات تو ابھی سب کے سامنے ہوئی۔ بلکہ باجی نے تجھے خاص طور پہ بلایا تا کہ جو بھی بات ہو تیری مدد میں ہو۔“ یہ سچ ہے رضیہ کو بہن کے اعترافات کا خوب دھیان رہتا تھا اسی لیے انہوں نے ہاتھ دھو کر بلایا تھا تا کہ پھر شکوہ نہ رہے۔

”سب ڈرامے ہیں ان کے جیسے میں جانتی نہیں نا ان دونوں کو۔ گونگلوں سے مٹی جھاڑی گئی ہے ابھی سب کے سامنے دکھاوا کر کے۔ رشتہ تو یہ کی میتوں سے پکا کر کے بیٹھے ہیں۔“ لو بھلا پھوپھو نے بھی کسی کی مانی ہے، جواب مان جاتیں۔ منہ بنائے ایک نئے الزام سے نوازا گیا تھا۔

”ہاں تو ڈرامے کرتے کالا سنسن بس حیرے پاس ہے۔“ خواہ خواہ کسی بات کو چیونٹ کی طرح ملول دیتا۔ ان کے بچے وہ جانتیں۔ ان کی مہربانی انہوں نے ہمیں شامل کیا، نہ بھی کرتے تو ہم کیا کر لیتے۔“ احتشام چچا کے نزدیک ایسی بحث بس درد سہی۔ اپنے میں مناسب انداز میں جان چھرائی۔

پھوپھو کو تو ڈرامہ والی بات ہی آگ لگا گئی تھی اور اب ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھے منہ پھیر کر بیٹھی تھیں۔

”ایسے باجی غلط نہیں کہہ رہی ہیں احتشام۔ ایک گھر ہے تو اتنا تو تارا حق بنتا ہے۔ لیکن اب اگر یہ لوگ باتیں چھپائیں گے تو کل ہم سے بھی امید نہ رہیں۔“ چچی نے بھی حسب استطاعت جڑی چھوڑی۔

”ایک چل تک تو تم ان سے چھپا کر خریدتی

ہو اور ان سے امید وہ بچوں کے رشتے تمہاری صلاح سے کریں۔ اپنی عقل کے ڈوگرے برسانا بند کرو اور جاؤ کچھ کھانے کا انتظام کرو ورنہ یہی تمہاری باجی طعنہ مارے گی بھوکا گھر بھیج دیا۔“ چچی نے ایک پل کو پہلو بدلا اور کن اکھیوں سے منہ پھلایے بیٹھی منہ کو دیکھا پر خود خاموش ہی رہیں کیونکہ میاں کے سامنے وہ ہم ہی زبان کے جوہر دکھائی تھیں البتہ چچا کی باتوں نے پھوپھو کو تو پختے لگا دیے تھے۔

”ہائے تو تو جان لے لے میری۔ ہر وقت سنا تا رہتا ہے۔“ پھوپھو نے غک کر جواب دیا۔ چچی بھاگ کر چکن میں چلی گئیں البتہ وہ دونوں بھائی بہن جانے لگتی ہی دیر تک ایک دوسرے پہ دل ہلکا کرتے رہے۔

☆☆☆

”مرتی مر جاؤں گی لیکن اس انمول گھڑی سے شادی نہیں کروں گی۔ بس کہہ دیا تو کہہ دیا۔“ ایک ادا سے ٹھوڑی اٹھائے اپنے تئیں اس نے ڈائلاگ مارا تھا لیکن سامنے بھی عالیہ تھیں۔ کمرے میں آتے ہی اس نے جو کھرام چایا تھا اس پہ تو پہلے ہی انہیں اس پہ دبا کے غصہ آ رہا تھا۔ ایک تو دسے والی حرکت کے بعد بھی، رضیہ نے اس کی شرارت کو درگزر کرتے بیٹے کا رشتہ مانگا اور یہ میڈم مزاج دکھا رہی تھی۔

”عیرا نام چاندنی اس لیے نہیں رکھا تھا کہ مجھے ایسا بھ بچن کے ڈائلاگ سنائے۔ دو ہاتھ گدی پہ دوں گی تیری بھی خوشی بھی تم نکال دوں گی بھی۔“ لو بتاؤ بھلا کس بات کی کمی ہے انمول میں۔“ عالیہ نے جل کر کہتے باقاعدہ ہاتھ دکھایا تھا۔ وہ ایک لمحے کو ڈری پر پھر زندگی موت کا معاملہ جان کر ہمت کرتے ہوئی۔

”کئی کوئی نہیں..... زیادتی ہے زیادتی۔“

بے وقوفی کی کہنے پرین کی اور..... اور..... سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یا شاید شیش میں حقل ہی ماری گئی تھی۔ اچھے اچھے انرازم زبان پر آ ہی نہیں رہے تھے۔ ”بکواس بند کر۔“ عالیہ باواں بلند بولیں تو اس نے فوراً بڑیک لگائی۔ ”جیسے خود تو کسی اسٹیٹ کی مہارانی ہے نا۔“

”مہارانی نہیں چاندنی تو ہوں اور میری شادی میری مرضی سے ہوگی۔“ وہ منمنائی۔

”بھاڑ میں گئی اس چاند کی چاندنی کی مرضی۔ یہ جوتا دیکھ رہی ہے نا گھما کے ماروں گی سارے احتجاج بھول جائے گی۔“ عالیہ نے اس بار اپنے مضبوط ہاتھ کی ایک دھپ کر پے لگائی تو وہ تڑپ ہی گئی تھی۔

”پہلے ہی ہاتھ پیر پھولے ہیں میرے۔ ایک تو عید، اس پہ منگنی کی رسم۔ سمجھ میں نہیں آ رہا شروع کہاں سے ہوگا سب اور یہ میڈم ایک نیا البیٹو نکال کر بیٹھ گئی ہے۔“ الماری کا دروازہ کھولے وہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔

”ای ایک بات میری سن لیں آپ۔ سرتی مرجاؤں گی اس ننگور سے شادی نہیں کروں گی۔“ ناخن کھرتے اس نے نروٹھے پن سے کہا۔

”ہاں تو مرجائیں شادی تو تیری انمول سے ہی ہوگی۔ اپنا والٹ ہاتھ ہی تھا اے عالیہ پائیں اور تیرے لہجے میں کہیں کمرے سے باہر نکل گئیں۔ پیچھے چاندنی سر پکڑے اپنی بد نصیبی پہ آنسو بہا رہی۔

☆☆☆

انمول کا حال بھی چاندنی سے مختلف تھا، نہ یہ خبر اس کے لیے کم تشویش کا باعث تھی۔ اس کی تو سمجھ سے باہر تھا کہ ماں نے بیٹھے بٹھائے یہ نیا فتنہ کیوں چھوڑا ہے، وہ بھی اسے بتائے بغیر۔ انکار تو وہ وہیں کر دیتا لیکن سب بڑوں کے سامنے ماں کو ایسا جواب دینا یا ماموں کی بے عزتی کرنا انتہائی

غیر مناسب تھا پھر بھی اسے ماں سے شکوہ تھا جس کا اظہار اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی کر دیا تھا۔ ”یار ایک بار مجھ سے تو پوچھ لیتیں آپ کہ میں چاندنی سے شادی کرنا چاہتا بھی ہوں یا نہیں۔“ لہجے میں بلا کی بے زاری تھی۔

”میں نے سوچا تمہیں سر پرانز دوں گی۔“ انمول نے سر پہ ہاتھ مارا۔ اب ایسی باتوں کے بھی سر پرانز ملا کریں گے۔

”بھئی واہ! اپنی میری ہی شادی کی خبر سب کے سامنے مجھے سر پرانز کی صورت دی جا رہی ہے۔ بڑے ٹھیک جا رہے ہوں جی آپ۔“ رضیہ نے صوفہ پر بیٹھتے حیرت سے بٹے کو دیکھا جو چہرے پہ بلا کی کوفت لیے انہیں بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔

”تو کیا تم نہیں کرنا چاہتے اس سے شادی۔ کسی اور کو پسند کرتے ہو کیا؟“ بڑی سنجیدگی سے سوال کیا گیا تھا۔

”اچھا اگر ہو تو پھر آپ کینسل کر دیں گی یہ منگنی؟“ انمول نے امید سے پوچھا۔

”اگر کوئی ہے تو اسے بتا دو تمہاری منگنی تمہاری کزن سے ہو رہی ہے۔“ رضیہ نے بھی اسی سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

”امی یہ زیادتی ہے۔“ وہ تڑپا۔

”اس میں زیادتی والی کون سی بات ہے۔ اتنے اچھے دوست ہو تم دونوں پھر اس سے شادی پہ کیا اعتراض۔“ ان کا اطمینان قابل تحسین تھا۔

”کون سی دوستی..... کہاں کی دوستی؟ دیکھا نہیں آپ نے آج کیا حرکت کی اس نے۔“ انمول نے فی الفور احتجاج کرتے ماں کا دھیان چاندنی کی شرارت کی طرف دلایا۔

”چھوٹی سی شرارت کی تھی۔ اس عمر میں یہ سب تو چلتا رہتا ہے۔“ رضیہ پہ چنداں اثر نہیں ہوا

”پہنائی سی شرارت۔ اگر سچ میں دنیہ بھاگ جاتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔“ وہ ڈرامائی انداز میں بولا۔ کیا پتا ہی طرح ماں کو معاملے کی سنگینی سمجھ آ جاتی۔

”بھاگ تو نہیں نا۔ بھول جاؤ سب باتوں کو اور چلو مجھے مارکیٹ لے چلو۔ وقت کم ہے اور تیار ہاں جوں کی توں۔ سوچ رہی ہوں چاندنی کے لیے انمول کے بجائے سونے کا بیٹ خرید لوں۔“ ان کے اطمینان میں ہرگز دراڑ نہیں پڑی تھی الٹا انہیں تو اب تیاریوں کی فکر لاحق تھی۔ کچھ سوچتے انہوں نے اپنا بیک کھولا اور والٹ میں رکھے پیسے کتنے لکھیں۔

”لو یہاں بیٹا راضی نہیں اور آپ تیاریوں میں لگ گئی ہیں۔“ وہ ناراضی سے بولا۔

”بیٹے کے راضی ہونے میں کون سی صدیاں لگتی ہیں۔ ان چار دنوں میں تیاری ہو جائے تو مجھے معرکہ سر ہوا۔“ پیسوں کی طرف سے تسلی مانگتے انہوں نے اپنا بیک اٹھایا اور شاہنگ پہ جانے لے لے نکل گئیں۔ انمول اپنا احتجاج بھی مناسب انداز میں قلم بند نہیں کر دیا پایا تھا فیصلہ تو پہلے ہی اس کے خلاف ہو چکا تھا۔

☆☆☆

”یار ماموں یہ آپ کی بہن نے اچھی گڑ بڑ کر دی ہے۔“ آسموں پہ ہاتھ صاف کرتے انمول نے احتشام بچا کو اپنا بدعاسنا چاہا۔ رضیہ کے مارکیٹ جانے کے بعد وہ خود وہیں چلا آیا تھا اور اب آم لہا کر اپنا نظم قلم کرتے، اس نے دوست نما ماموں کے سامنے دل کھول ہی دیا تھا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ کھٹکی چوستے احتشام پچھا۔

”میں نے سے پوچھا۔“ بھلا۔ کون سا وقت تھا اس طرح اچانک

منگنی کا اعلان کرنے کا۔ کم سے کم مجھ سے پوچھنا تو چاہیے تھا ایک بار۔“ امید کی کرن اب بھی باقی تھی سو بڑے مایوس لہجے میں اپنا مسئلہ بتایا۔

”اچھا میں باجی کو کہوں گا تم سے ایک بار پوچھ لیں۔“ احتشام پچاسر جھکائے ایک بار پھر تسلی سے کھٹکی چوستے لگے تھے۔

”وہ شاہنگ کرتی پھر رہی ہیں۔ تیاریاں کر رہی ہیں۔ اب پوچھنے کا فائدہ؟“ وہ جمل کر بولا۔

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہتاں۔ تم نے کون سا انکار کرنا ہے۔ پہلے پوچھیں یا بعد میں۔“

ارے واہ احتشام پچھا آپ کی بھی کیا کمال لا جک ہے بھائی۔“ آپ بھی ان کے ہی بھائی ہیں۔ یعنی مجھے میری ہی شادی کے لیے فیصلے کا اختیار نہیں۔“ بڑے جتاتے سے انداز میں اس نے شکایت کی تھی۔

”بیٹا تم اتنے بڑے کب سے ہو گئے کہ فیصلوں کا اختیار اپنے پاس رکھو۔ یہاں تو اس عمر میں بھی کوئی کھانا بھی ہم سے پوچھ کر نہیں پکاتا۔ جس دن شکوہ کر دیا اسی رات تمہاری نانی ٹنڈے پکوا لیتی ہیں۔“ بایں آنکھ دباتے احتشام پچھا اپنی بے بسی پہ ہنسنے۔

”نانی نے آپ سے شادی کے متعلق تو پوچھا ہی تھا۔“ انمول نے ٹھک کے سوال کیا۔

”ہاں بالکل پوچھا تھا۔ کرنی ہے تو بتا دو ورنہ اگلے دس سال تک بھول جاؤ۔“ جواب ایسا تھا کہ دوبارہ سوال کی ہمت ہی دم توڑ جائے۔

”ویسے تم بتاؤ مسئلہ کیا ہے۔ کوئی اور نظر میں ہے کیا؟“ انہوں نے نہایت رازداری سے پوچھا تھا۔

”ارے کہاں ماموں۔ اپنی ایسی قسمت کہاں۔“ انمول نے جھٹ تردید کرتے مایوسی سے کہا۔

”تو پھر شکر کرو گھر سے ہی قسمت نکل رہی ہے۔“ وہ ایسے خوش ہوئے جیسے لٹری نکل رہی ہو۔

”اس کا رویہ دیکھا ہے میرے ساتھ۔ ہمیں فوج میں دشمن سے جنگ کرنا سکھائی جاتی ہے شادی کی بات تو پہلی بار سن رہا ہوں۔“ انمول نے اس بار اصل مسئلے کی طرف توجہ مبذول کروائی تھی۔ ”تم تو خوش نصیب ہو پہلے سے باخبر ہو۔ ہمیں دیکھو بے خبری میں زندہ ہیں۔ ارے صاحب زادے سب لڑکیاں بیوی بن کر دشمنوں کی صف میں ہی آکھڑی ہوئی ہیں۔“ ایک نہایت سرد آہ بھرتے انمول چچانے چوتھے آم کی قاشیں پلیٹ میں کاٹنا شروع کی تھیں۔

☆☆☆

ماں اور ماموں دونوں سے ناامید ہو کر اب اس نے ڈائریکٹ چاندنی سے ہی بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یوں بھی وقت کم تھا۔ تین دن بعد عید تھی اور اس کے اگلے روز ان دونوں کی منگنی۔ ان حالات میں جلد از جلد اسے یہ رشتہ کینسل کروانا تھا۔ یہی سوچ کر اس نے چاندنی کے فون پر پہنچ بھیج کر اسے چھٹ پے بلا پایا۔

چاندنی کا تو دماغ ٹھوم گیا تھا یہ بلا وہ دیکھ کر ابھی چند گھنٹے ہوئے نہیں زبردستی کا رشتہ طے ہوئے اور موصوف کو عشق بازیاں سو جھ رہی ہیں۔ پہلے تو یہی سوچا انکار کر دے لیکن پھر خیال آیا چھٹ پے جا کر جوتے سے خاطر تواضع کرنی چاہیے لہذا جھٹ اور پینچی۔ چہرے پہ بلا کی سنجیدگی لیے آگے بڑھی۔ انمول سامنے ہی گھڑا تھا اسے دیکھ کر خیر سگالی انداز میں مسکرایا تو اس کا شک جیسے یقین میں بدل گیا کہ وہ نہ ہو یہ چھوڑ پن کے موڈ میں ہے۔

”چاندنی میں تم سے کچھ کہنا چاہتا

ہوں۔“ کچھ سوچتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔ احتیاطاً چاندنی ایک قدم پیچھے ہٹی لیکن اس کی اگلی بات پر نہ رہ گئی۔

”یار تم ممائی سے کہہ دو کہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتیں۔“ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ ”اتنی رات کو تم نے مجھے یہ مشورہ دینے کے لیے یہاں بلایا ہے؟“ دل میں تو اس وقت انتہائی کینٹی خوشی کا احساس تھا کیونکہ خود اس کا دل بھی یہی ڈونگرے بجا رہا تھا کہ اسے انمول سے شادی نہیں کرنی ہے۔ اب اس کی زبانی اسے دل کی بات جان کر تو جیسے نہ جانے کی خواہش ہو رہی تھی لیکن بظاہر سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے بڑے جتاتے سے انداز میں پوچھا۔

”دراصل کوئی میری بات سمجھنے کو تیار ہی نہیں۔ حالانکہ میں نے اسی کو کہا بھی ہے۔“ انمول نے صفائی دیتے اسے تفصیل بتائی۔

”اور پھر پھر نے تمہاری بات نہیں مانی اس لیے تم چاہتے ہو میں اس رشتے سے انکار کر کے اپنی اسی سے جو تیاں کھاؤں۔ تمہیں فوج میں نہیں سیاست میں ہونا چاہیے تھا۔“ ساری بات جان کر اسے شرم دلائی گئی تھی۔

”فوج ہر فن مولا ہوتی ہے بی بی۔ ہر جوشین کو پنڈل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دیکھنا نہیں آج دے کو کیسے پنڈل کیا تھا۔“ اپنی پولو شرٹ کے کارچرہااتے اس نے اپنے منہ میاں مٹھو بیٹا چاہا۔

”تم صرف بکرے ہی پنڈل کر سکتے ہو۔ اگر تم سے کچھ ہوتا تو یہاں اس وقت مجھ سے مدد مانگنے کے بجائے پھر پھر کو راہنی کر رہے ہوتے۔“ اس کی ساری آکر ایک ہی جملے سے اکھاڑ پھینکی گئی تھی۔

”ایک تو تم سے بات کرنا ہی فضول ہے۔

”تم ہی مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی ہوگی اسی لیے یہ بات کی لیکن تم کبھی مشکل میں کام آ جاؤ گی تو وہ ہی نہیں سکتا۔“ الٹا بلائے ناگہانی بن کر انمول میری جان پہ چڑنے والی ہو۔“ انمول بیٹا سے جملے تھے۔

”زیادہ نہیں تو چلو بھریانی میں ہی ڈوب مرو اور اشرم نہیں آتی جھوٹ بولتے وہ بھی تم سے سامنے کھڑے ہو کر۔ تمہارا وہ پچھلا والا مسئلہ میری وجہ سے ہی حل ہوا تھا، جس پہ تم دن رات روتی صورت بنائے گھومتے تھے۔ اور بلا تو مجھ پہ مسلہ ہو رہی ہے تمہاری شکل میں۔“ وہ اچانک جذباتی ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ مزید اس کی شان میں قصیدہ کہتی سامنے سے آئی دردانہ پر پھر کر توجہ نہ ہو گئی۔

”کیا اور ہا ہے یہاں اس وقت؟“ اسے مجھ کا درد دیکھ کر انمول نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ پھر میری پہیلی بار کی جاسوسی کی حسرت اس بار پوری ہو گئی تھی۔ گناہداروں کی طرح یوں سوال کیا جیسے والی دلوں کو رکنے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

”یہ پوچھیں کیا کچھ نہیں ہو رہا۔“ انمول اور چاندنی دونوں نے ایک ساتھ کہا تھا۔

”اچھا تو بتاؤ کیا کچھ نہیں ہو رہا؟“ پھر پھر کو لگا اس بار والی کوئی سارے دار بات ہاتھ لگنے والی ہے۔

”پھر پھر میں نے انمول سے شادی نہیں کر لی۔“ چاندنی نے پھر پختے احتجاجی انداز میں کہا تو پھر پھر کا من نہیرت سے کھل گیا پھر اس خوف سے لڑی پھر اندر نہ چلا جائے فوراً ہی بند کر لیا۔

”ارے میں منگنی کا بتایا اور یہاں شادی کی باتیں مل رہی ہیں۔ بس جی ہماری تو اتنی ہی اوقات ہے اس گھر میں۔ وقت کے وقت بتا دیں گے کل شادی ہے پہنچ جانا پرانے گھسے پٹے کپڑے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	معنی	قیمت
غزل کے حصارے	شادی پر چوٹی	500/-
کھانا	شادی پر چوٹی	250/-
ہمسفر	فرصت عشق	400/-
یہ دے آلو	فرصت عشق	250/-
جان بولتے تھے	فرصت عشق	500/-
دل بولیں	فرصت عشق	350/-
اتنی لاکھ	فرصت عشق	300/-
وہ پہلی ہی دہائی کی	آپ بے شرم تھی	400/-
آزاد گھر کی	آپ بے شرم تھی	400/-
ایک نیا ہیرویت	میرہار	200/-
ورماں	میرہار	180/-
امریکل	میرہار	450/-
اکہ دہائی کے رکن	لاماک	300/-
میرے دل کے تیرے	لاماک	120/-
میرے خواب میرے	لاماک	300/-
میرے دل کے تیرے	فرصت عشق	300/-
دل کے دھڑکنے	آپ بے شرم تھی	300/-
دل کے دل کے	بہنوں کے حصارے	500/-
میرے دل کے تیرے	زیر دست	180/-
میرے دل کے تیرے	زیر دست	180/-
میری جہ	فرصت عشق	250/-
کچھ	فرصت عشق	150/-
اس وقت کے دل	راست نہیں	350/-
شہزاد	لاماک	300/-
رنگ و بزم	لاماک	400/-
آئینہ کاغذ	زیر دست	400/-
جان بولیں	میرہار	300/-
میرے دل کے تیرے	گھر کا گھر	400/-

اپریل 2018 62 اگست

ہے۔

”ای یہ آپ کا شایگ بیک آپ گاڑی میں چھوڑ آئی تھیں۔“ خوش خوشی اس نے ہاتھ میں پکڑا شایگ بیک ماں کو دیا اور خود مطمئن سے انداز میں سیٹی بجاتے کمرے سے باہر نکل گیا۔

پھوپھو کے چہرے کی رازدارانہ مسکراہٹ دیکھ کر اسے پورا یقین تھا اس کا کام بن گیا ہے اور اب دنیا کی کوئی طاقت اس کی شادی اس تک چڑھی چاندنی سے نہیں کر داسکتی ہے۔

”باجی نے تو لگتا ہے شایگ بھی شروع کر دی۔“ انمول کے نکتے ہی دردانہ پھوپھو نے جس سے پوچھا۔ رضیہ انمول کی مداخلت سے پہلے ہی عالیہ والی بات بھول گئی تھیں اب پھوپھو کے اس سوال پر بالکل ہی ذہن سے نکل گیا۔ جھٹ بیک کھول اس میں سے سوٹ نکالا اور بہن کی طرف بڑھایا۔

”وقت ہی پھلا کتنا تھا۔ معنی کی چیزیں تو میں کل ہی لے آئی تھی یہ تو صبح اپنا اور تمہارا سوٹ خریدنے گئی تھی۔“ سوٹ دیکھ کر پھوپھو کی باجھیں پوری کی پوری کھل گئی تھیں۔

”ہیں میرا جوڑا؟ ذرا دکھاؤ تو۔“ رضیہ کے ہاتھ سے جوڑا کھینچ کر فائنٹ انہوں نے کھول کر دیکھا۔ اس وقت ان کے چہرے پہ چھوٹے بچوں والی خوشی تھی۔

”دیکھ کیسا ہے۔ میں نے سوچا دونوں بہنیں ایک جیسا سوٹ پہنیں گی۔ انمول جتنا میرا اتنا تیرا بھی تو بیٹا ہے۔“ رضیہ کی بات سن کر ان کی تو آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے تھے۔

”ارے ہاں کیوں نہیں بلکہ مجھے تو وہ آپ سے بھی زیادہ پیارا ہے۔ اللہ کتنا پیارا سوٹ ہے باجی! ویسے ایک بات تو ہے آپ کی پسند کا جواب نہیں۔“ کپڑے کو ہاتھ لگا لگا گردیکھتے وہ نہال

ہو رہی تھیں اور اس سب میں اس وقت وہ قطعی طور پہ بھول چکی تھیں کہ یہاں ان کی آمد رشتہ تڑوانے کی وجہ سے ہوئی تھی۔

”چل شکر، تجھے پسند آگیا۔“ رضیہ نے ان کی خوشی سے مطمئن ہو کر کہا۔

”لیکن اب یہ سارے عید میں تو دردانہ باقی ہیں۔ بھلا اتنے کم وقت میں کون سی کر دے گا میرا سوٹ۔“ کوجی آئی تھیں منگنی رکوانے اور اب سوٹ سلوانے کی فکر ہوئی۔ پھوپھو رے پھوپھو آپ کی کون سی کھل سیدھی۔

”اس کی فکر نہ کریں نے درزی سے پہلے ہی بات کر لی ہے ارجنٹ کے پیسے لے کر دی دے گا۔“ فکر نہ کر سلائی بھی میں خود ہی دے دوں گی۔“ رضیہ نے تسلی دی تو پھوپھو بھی پرسکون ہو کر ایک بار پھر اپنے بیور شیفون کے سوٹ کو دیکھنے لگیں۔ ابھی انہیں اس کے ساتھ میچنگ سینڈل اور جوڑیاں بھی ملنی تھیں۔

☆☆☆

عید کی صبح نماز کے بعد قصائی کی آمد ہوئی اور ایک ایک کر کے سب جانور راہ عدم سدھارے۔ گوشت کی کٹائی کے بعد اگلا مرحلہ پکوائی تھا جو خواتین کا ذیہار منٹ تھا لہذا تقسیم والا گوشت الگ کر کے بقیہ بچن میں منتقل ہوا۔ آج سب لوگ دوپہر کے کھانے پہ مدعو تھے لہذا اسی مناسبت سے بریانی، بھنا گوشت اور نئے بنے۔ آج حیران کن طور پہ پھوپھو کی آمد بھی صبح ہی ہو گئی تھی۔ عید کی گہما گہما اور مصروفیت میں کوئی بھی کل کی تقریب کے متعلق بات نہیں کر رہا تھا۔ چاندنی کو انمول پہلے ہی بتا چکا تھا کہ پھوپھو ان کے گھر کا دورہ کر چکی ہیں اور اب راوی بچپن کی پائرسی بجا رہا ہے۔ کچھ بھی کیفیت چاندنی کی بھی تھی۔ اسے بھی یہی لگا تھا پھوپھو نے اس سے بات کر کے پروگرام منسوخ

کر دیا ہے لیکن وہ دونوں معصوم پرندے اس لمحہ سے اٹھان تھے کہ رضیہ نے سوٹ اور عالیہ نے ہالیاں اسے گردانے پھوپھو کو خاموش کر دیا ہے اور پھوپھو کی ہالیاں دیکھو تجھے لے کر ان دونوں نے سامنے ہوا بھی نکلے نہیں دی تھی۔

”کی طرف ہونے کے ساتھ ڈانقے میں بھی سب شامل تھا کہ سب خواتین کی محنت کے ساتھ محنت بھی شامل تھی۔ البتہ پھوپھو نے سب سے زیادہ توجہ دے کر اسی دی۔ شاید یہ چند روز پہلے اس کی لڑکیوں سے لیا جانے والا اپنی نوعیت کا احکام تھا۔ اس تک محنت زعفران بنی رہی۔ چاندنی شام کو کچلی کی طرف چلی گئی جبکہ انمول اپنے دوستوں سے عید ملنے نکل گیا۔ یوں عید کا دن اپنے اہتمام کو پہنچا۔

”لیکن اگلی صبح کھر میں بڑ بونگ محی تھی۔“ فکشن تو ہال میں تھا اس لیے کسی کو کوئی فکشن نہ تھی لیکن اگلی صبح تو سب نے ہی کر لی تھی۔ اس سلسلے میں جبکہ بہنیں دو بارہ لیکن کر نکل پڑنا تھا البتہ خواتین انعامت چار بجے پارلار تارہ۔ چاندنی والی تھی۔ چاندنی نے ان پریشان سب کی تھیں دیکھ کر ان کی توجہ اسے تو یقین کامل تھا منسوخ ہو رہی ہے اور اپنی روٹین کے مطابق ناشتے کے بعد کمرے کے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ ہوش اس وقت آج اب عالیہ نے جوڑا اور جیولری تھماتے ہوئے کچلی کی طرف چاندنی کے ساتھ پارلر جانے کا حکم دیا۔

”لیکن میں پارلر کیوں جاؤں امی منگنی تو نکل ہوئی ہے نا؟“ فرط حیرت میں ڈوبے اس نے معصومانہ سوال کیا۔

”کچلی بار کہا ہے شکل اچھی نہ ہو تو بات اچھی نہیں ہے۔“ عالیہ نے بلی سی چیت سر پہ لگائی۔ ”اگر اس سے بھی سے کچلی کی طرف دیکھا

جو خود اس کی بات پہ حیرت زدہ تھیں۔ اسی وقت میں گیٹ کھلا اور کاسی شیفون کے کڑھائی والے سوٹ پہ گولڈن سینڈل پہنے پھوپھو بنی سنوری گھر میں داخل ہوئیں۔

”ہائے میں نے سوچا گھر سے تیار ہو جاتی ہوں پھر یہاں سے تم سب کے ساتھ ہی ہال چلی جاؤں گی۔“ چاندنی نے بے یقینی سے پھوپھو کو دیکھا۔

”ارے واہ باجی سوٹ تو بڑا شان دار پہنا ہے اور یہ جھکیاں بھی خوب میچ کر رہی ہیں لگتا ہے نئے بنوائے ہیں۔“ کچلی نے ایک ہی قاتلانہ نگاہ میں سر سے لے کر پاؤں تک جائزہ لے ڈالا تھا۔

”ہے نا پیاری! یہ مجھے عالیہ بھابھی نے دی ہیں۔“ بھکی پہلا پہلا خوشی کا کام کر رہے ہیں جاوید بھائی تو انہوں نے کہا چھوٹی بہن کا حق بنتا ہے۔“ پھوپھو نے آگے ہو کر دکھاتے چالیس سائز انداز میں بتایا۔ چاندنی کا دل کیا سر پیٹ لے۔

”مروادیا نہ پھوپھو۔“ زرباب بڑبڑاتے وہ اس وقت صرف جل کڑھ ہی سکتی تھی کیونکہ پھوپھو تو اپنی کر چکی تھیں اور اب عین وقت پہ کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

دو گھنٹے بعد چاندنی اور انمول اسٹیج پہ منہ بسورے ناک چڑھاتے ایک دوسرے کو منگنی کی اگوشی پہنا رہے تھے اور مبارک باد دینے والوں میں سب سے اونچا دایوم پھوپھو کا تھا۔

☆☆

سروں کی شخصیت

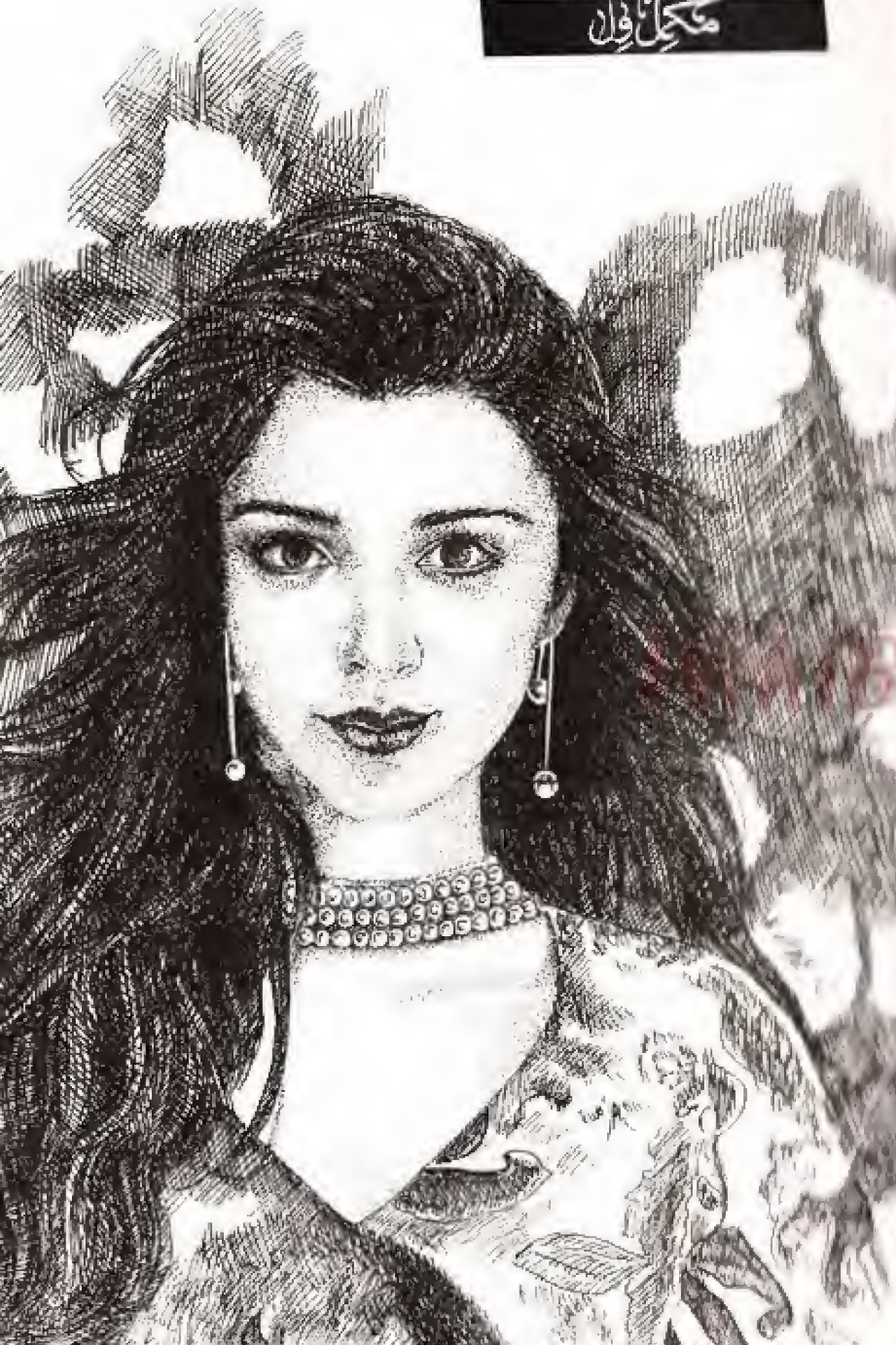
ماٹائل ————— ماٹھی خلاق

میک اپ ————— روزی بھائی ہالوارو

شو شو گھائی ————— منی منی دھما

آخری فتح

مکمل فن



اسے دیکھا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تاروں کی طرح چمکتے تھے اور وہ یہاں اسی منڈیر پر اسی طرح بیٹھا تھا، یوں ہی گھٹنوں کے گرد ہاتھ باندھے۔

جب میں درختوں کے اس جھنڈ کے پیچھے سے اسے یوں چھپ چھپ کر نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ وہاں منڈیر کے پاس گھڑا سے دیکھا تھا اور میری آنکھوں سے جیسے شعلے نکلتے تھے جو اسے جلاتے تھے، راکھ کرتے تھے۔ وہ بار بار میری طرف دیکھتے ہوئے یوں ہونٹ کھولتا تھا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو اور کہہ نہ پاتا ہو اور میں اس کی سنے بغیر اس پر غور آلود نظر ڈالتا، اس کے پاس سے گزرتا چلا گیا۔ شاید وہ میرے پیچھے بھاگا تھا، شاید اس نے مجھے آواز بھی دی تھی لیکن میری آنکھیں اندھی ہو گئی تھیں اور سماعتیں بہری..... یا وہ یہاں ہی پتھر بنا بیٹھا رہا تھا ساکت..... بے جان پتھر..... مجھے ٹھیک سے یاد نہیں اور آج چار سال.....

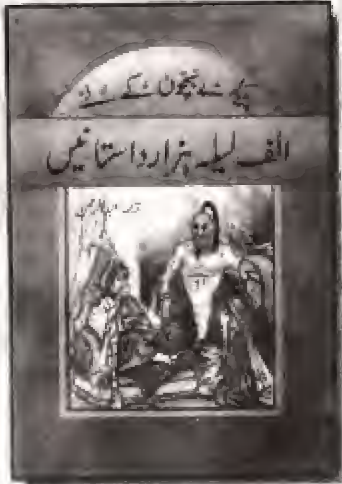
چار سال بعد بھی وہ بالکل ویسا ہی تھا۔ ذرا بھی تو نہیں بدلا تھا اس کی وہ نازک انگلیوں والے ہاتھ اسی طرح گھٹنوں کے گرد بندھے تھے اور اس کے سلی بال اس کی پیشانی پر بکھرے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ چار سال سے یہاں ہی بیٹھا تھا جہاں میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ اتنا ہی مضطرب اور بے چین۔ کیا وہ یہاں ہی بیٹھے بیٹھے پتھر میں ڈھل گیا تھا۔ کسی فوسل میں، لیکن وہ تو صدیوں کے عمل کے بعد فوسل بننے ہیں اور ابھی تو صرف چار سال، ہاں چار سال

وہ اپنی لانی نازک انگلیوں والے ہاتھ گھٹنوں کے گرد باندھے، گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے، تالاب کے کنارے بنی چوڑی لیکن پنی منڈیر پر بیٹھا تھا اور کبھی کبھی نظریں اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتا تھا اور میں تالاب کے دوسرے کنارے پر درختوں کے جھنڈ کے پیچھے چھپا اسے دیکھ رہا تھا اور اتنے دور سے بھی مجھے لگتا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں آنسو ستاروں کی طرح چمکتے ہوں اور پھر آنکھوں کو دھندلا کر جاتے ہوں بالکل ایسے ہی جیسے چار سال پہلے جب میں نے آخری بار



الف لیله

شہزادہ داستانیں



دلچسپ اور خوبصورت داستانیں جنہیں پڑھ کر بچے ہمیری پوٹو کو بھول جائیں گے، ایسی داستانیں جنہیں بڑے بھی پڑھ کر کلفت اندوز ہونگے

کتاب بذریعہ رجسٹری منگوائیں
300/- روپے کا ڈسکاؤنٹ حاصل کریں
فی کتاب 1200/- روپے
ڈسکاؤنٹ 300/- روپے
آج ہی 950/- روپے
مئی آؤ رارسال فرمائیں

بذریعہ ذاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

ایک نشان ہو جاتی۔ یوں عالیاں چھٹی تک اس کے پاس ہی بیٹھا رہتا۔

گاؤں میں یہ انگش میڈیم اسکول ایک ملازم کرمل حیدر نے قائم کیا تھا اور یہ اسکول کسی بھی لحاظ سے کسی بڑے اسکول سے کم نہ تھا۔ اسٹاف بھی اپنی لالیغائیڈ اور تجربہ کار تھا۔ حسن علی چاہتے تھے کہ یوں کو سری یا ایسٹ آباد کے کسی رہائشی اسکول میں داخل کروایا جائے لیکن عالیہ خاتون اپنی چھوٹی عمر میں یوں کو خود سے جدا کرنے کی قائل نہ تھیں۔ انہوں نے چوہدری حسن علی سے کہا تھا کہ اگر وہ کرمل حیدر اسکول کے ماحول یا پڑھائی سے مطمئن نہ ہوئیں تو پھر وہ بھی بچوں کے ساتھ اسلام آباد، راولپنڈی، راولپنڈی ہو جائیں گی۔ لیکن بچوں کو ہرگز ہوش میں نہیں آئیں گی۔ عالیاں نے اسکول جانا شروع کیا تو چند ماہ میں ہی انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اسکول کا معیار کسی بھی بڑے گرامر اسکول سے کم نہیں ہے۔ سو ایک سال بعد شایان کو بھی انہوں نے اسی اسکول میں داخل کر دیا تھا لیکن شایان نے تو مسئلہ کھڑا کر دیا تھا کہ اب کرمل حیدر نے عالیہ خاتون اور حسن علی سے کہا کہ اس مسئلہ کو سکس کیا۔

”اسی طرح عالیاں کا بھی حرج ہو رہا ہے، وہ اپنی کلاس میں بیٹھنے کے بجائے شایان کے پاس بیٹھا رہتا ہے۔ یہی عالیاں شایان کو چھوڑ کر اپنی کلاس میں جانے کے لیے تیار ہوتا ہے اور نہ شایان اسے جانے دیتا ہے۔ مارے پیار، ڈانٹ کچھ بھی شایان پر اثر نہیں کرتا۔ اس کا کوئی مناسب حل ہونا چاہیے۔“ تب عالیہ خاتون نے فیصلہ کیا، عالیاں بھی شایان کے ساتھ دوبارہ زمزمی میں بیٹھ جائے۔

چوہدری حسن علی نے اعتراض کیا۔

”کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ دو چار دن روئے گا تو وہی ٹھک ہار کر چپ کر جائے گا۔ پھر نے شایان کی ضد پر عالیاں کو بلا کر اس کے پاس بٹھانے کی غلطی کی اور اب تک عادی ہو چکا ہوتا۔ بہر حال اب میں اگر نہ چاہوں تو شایان کب تک

”تو میں زمین کو ساتھ لے جاؤں باغ میں۔“ وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا اور ابھی انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اسی کمرے سے عالیاں کتاب ہاتھ میں اٹھائے باہر آیا۔ سرخ و سپید رنگت، براؤن آنکھیں، سنہرا پن لے ایسے ہی سلی بال۔ وہ دیکھنے میں شایان کا ہم عمر ہی لگتا تھا لیکن وہ اس سے بڑا تھا، ایک سال اور چار ماہ۔ دیکھنے والوں کو بھی ان کی عمر میں فرق محسوس نہیں ہوتا تھا، وہ انہیں جڑواں ہی سمجھتے تھے اور وہ پڑھتے بھی ایک ہی کلاس میں تھے اور یہ ایک ہی جماعت میں پڑھنے کی کہانی بہت دلچسپ تھی۔ جب شایان کو اسکول میں داخل کر دیا گیا تو رورور کر اس نے برا حال کر لیا۔ وہ عالیہ خاتون کے بغیر اسکول جانے کے لیے قطعاً تیار نہیں تھا۔

”بھائی بھی تو اسکول جاتا ہے نا۔“ عالیہ خاتون نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن شایان رورور کر حشر کر دیتا۔ عالیاں بھی چار سال کی عمر میں اسکول گیا تھا لیکن اس نے شایان کی طرح ٹھک نہیں کیا تھا۔ عالیہ خاتون ملازمہ کے ساتھ خود اسے چھوڑنے جاتیں اور اسے زبردستی اس کی پیچھے کے حوالے کر کے واپس آتیں لیکن وہ تو کلاس روم کے دروازے کے پاس ہی لیٹ جاتا اور یوں چل چل کر روتا کہ بہ مشکل چوکیدار اسے قابو میں کر کے سیٹ پر بٹھاتا۔ وہ روتا اور پھلتا رہتا۔

”میرے بھائی کو بلاؤ۔“ جانتا تھا کہ عالیہ خاتون جا چکی ہیں۔ عالیاں جو پرپ میں تھا اور اس کا روم دوسرے بلاک میں تھا، پیچھے ٹھک آ کر اسے بلا لیتی۔ شایان کو روتے دیکھ کر اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے بھر جاتیں۔ شایان اس کا ہاتھ پکڑ لیتا دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بیٹھے ہوتے۔ شایان کا رونا بند ہو جاتا تھا لیکن اس نے عالیاں کا ہاتھ اتنی مضبوطی سے پکڑا ہوتا کہ پیچھے لاکھ کوشش کرتی وہ اس کا ہاتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوتا اور اگر زبردستی ہاتھ چھڑا کر عالیاں کو اپنی جماعت میں بھیجا جاتا تو شایان پھر یوں چل چل کر روتا کہ پیچھے بھی

سے چمکتے ہوئے گندم رنگ رخسار گھور سیاہ آنکھوں میں بے تحاشا چمک تھوڑے تھوڑے سے ٹھٹھکھٹھکے بال بھی بے حد سیاہ تھے۔ یہ شایان علی تھا اور تخت کے پاس کھڑا عالیہ خاتون کو دیکھ رہا تھا۔

”اماں جان آپ اس مینا مینا کی بچی کو کب تک پڑھا کریں گی۔“

”کیوں، کیا آپ کو پڑھنا ہے؟“ عالیہ خاتون نے بے حد شفقت اور محبت سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں، میں نے سچ مولوی صاحب سے پڑھ لیا تھا۔ اس وقت تو مجھے اس کے ساتھ باغ میں جا کر کھیلتا ہے۔“

”تو آپ عالیاں کے ساتھ باغ میں جا کر کھیل لیں، بھلا زمین آپ کے ساتھ کیا کھیل سکتی ہیں۔“ عالیہ خاتون کے لبوں پر مدہم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”لیکن مجھے تو اسی کے ساتھ کھیلتا ہے۔ آپ پلیز اسے میرے ساتھ باغ میں جانے دیں، مجھے عالی کے ساتھ نہیں کھیلتا۔“

زمین عالیہ خاتون کی بیٹی تھی اور عالیہ خاتون ہی نہیں چوہدری حسن علی اور دونوں بچے اس سے بہت پیار کرتے تھے۔

”کیوں، کیا عالیاں کے ساتھ آپ کی لڑائی ہو گئی ہے۔“

”نہیں تو..... بھلا میری عالی کے ساتھ کیوں لڑائی ہوگی۔ وہ تو میرا بھائی ہے اور بھائیوں کی تو بھی لڑائی نہیں ہوتی اور ہم تو بھی نہیں لڑتے۔“

اسے عالیہ خاتون کی بات اچھی نہیں لگی تھی اور اس نے قدرے ناگواری سے انہیں دیکھا تھا۔

”اور بھی آپس میں مت لڑنا میری جان! زندگی بھر نہیں۔“ عالیہ خاتون کی آنکھوں میں محبت کا شگفتہ مارتا دیا بہہ رہا تھا، انہوں نے بے اختیار ہاتھ بڑھا کر اسے ساتھ لگا لیا۔

”ہمیشہ ایسے ہی رہنا، اسی طرح محبت اور پیار سے۔“ انہوں نے اس کی پیشانی چومی۔

روئے گا۔ عالیان کا سال کیوں ضائع کرنا چاہتی ہیں، ویسے بھی آج کل زمسری پر پ، دن کتنے سال ضائع ہو جاتے ہیں بچے کے۔

”اچھا ہے ناچو ہداری صاحبہ عالی کی بنیاد اچھی ہو جائے گی۔ ہمارا عالی تو پہلے ہی اپنی کلاس کا سب سے ذہین بچہ ہے اور سو فیصد مارکس لے کر پرپ میں آیا ہے۔“

چوہدری محسن کو عالیہ خاتون کی بات پسند نہیں آئی تھی۔ یہ بات عالیہ خاتون بھی جانتی تھیں کہ عالیان کتنا ذہین ہے لیکن وہ اپنے دل کا کیا کر تیں۔ جو شایان کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ تب انہوں نے شایان کا ایڈیشن بھی پرپ میں کر دیا۔

”اس کی زمسری کی تیاری میں خود گھر میں اسے کروالوں گی۔“ انہوں نے غرل حیدر سے کہا تھا۔

”اور فرض کریں وہ اچھا رزلٹ نہ دے سکا تو ایک سال مزید پرپ میں رہ لے گا تب تک وہ سیٹ بھی ہو جائے گا۔“

”اب یہ آپ شایان کے ساتھ زیادتی کر رہی ہیں۔“ محسن علی کو بچہ بھی اعتراض تھا۔

”اس کے ننھے سے ذہن پر بوجھ مت ڈالیں۔“ لیکن عالیہ خاتون نے انہیں قائل کر ہی لیا تھا، گواہیں شایان کے ساتھ بہت محنت کرنا پڑی تھی اور اس طرح عالیان کچھ نظر انداز بھی ہوا تھا لیکن انہوں نے شایان کو زمسری کا کورس کروا دیا تھا اور ساتھ میں پرپ کی بھی تیاری کروا رہی تھیں۔

”آپ کو بھائی سے کم نمبر نہیں لینے، آپ کو ان سے زیادہ نمبر لینے ہیں۔“

وہ اس کے دل میں پڑھائی کا شوق پیدا کرنے کے لیے اکثر غریب و غریب ہنسنے کے لیے کسی صورت تیار نہ ہوتا کہا کر لی تھیں۔ یوں دونوں ایک ہی کلاس میں تھے اور مومنا دونوں کے نمبروں میں ایک یا دو نمبروں کا ہی فرق ہوتا تھا۔

☆☆☆

”اماں جان! میں نے اپنا سبق یاد کر لیا ہے۔“

عالیان نے ان کے قریب آ کر کہا۔

”شباباش بیٹا! انہوں نے شایان کے چہرے سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرائیں۔

”اماں جان! اب میں زمین کو بارغ میں ساتھ لے جاؤں۔ آپ نے کہا تھا نا پہلے سبق یاد کر لوں اور زمین بھی اپنا سبق سنالے تو پھر چلے جانا بارغ میں۔“

”ہاں ہاں چلے جاؤ۔“

عالیہ خاتون کو یاد آیا کہ انہوں نے عالیان سے کہا تھا کہ وہ پہلے سبق یاد کر لے پھر چلا جائے بارغ میں۔

زمین فوراً ہی تخت سے کود کر اتری تھی اور نورانی قاعدہ عالیہ خاتون کو پکڑا کر عالیان کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

”چلیں عالی!“

دراصل عالیان نے اپنے بارغ میں خرگوش کے بچے دیکھے تھے اور وہ بچے زمین کو بھی دکھانا چاہتا تھا۔

”لیکن اماں جان! میں نے عالی سے پہلے آپ سے کہا تھا کہ مجھے زمین کے ساتھ بارغ میں جا کر کھیلنا ہے۔“ شایان نے غصے سے زمین پر پاؤں

چٹا دیا تھا۔ غصہ اور خلاف سرخی بات پر فوراً منہ پھلکا کر بارغ میں ہوجاتا تھا۔

”لیکن ہم کھیلنے نہیں جا رہے، عالی مجھے خرگوش کے بچے دکھائے گا۔“ زمین کو شایان کا ضد کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ عالیان نے ایک نظر نا راض سے شایان اور پھر عالیہ خاتون پر ڈالی جو پریشان ہی ہو کر شایان کو دیکھ رہی تھیں۔

”اوکے شانی! آپ چلے جائیں زمین کے ساتھ بارغ میں کھیلنے۔ میں..... ہاں مجھے یاد آیا ابھی مجھے ایک مضمون بھی تو لکھنا ہے۔ مائی بیسٹ فرینڈ

پر۔“ عالیہ خاتون کے لبوں پر یک دم مسکراہٹ نمودار ہوئی اور انہوں نے تشکر نظروں سے عالیان کی طرف دیکھا۔ وہ جانتی تھیں کہ عالیان نے مضمون صبح ہی لکھ لیا تھا۔ وہ بچپن سے ہی بہت صبح جوتا تھا۔ وہ شایان کی طرح ضد نہیں کرتا تھا اور کئی بار ایسا بھی ہوا تھا کہ

شایان کے ضد کرنے پر وہ اپنی چیزوں سے دست بردار ہوجاتا تھا۔ وہ عالیہ خاتون کو پریشان نہیں دیکھ

تھا۔ اس کے لیے ساتھ ہی جانا ہے خرگوش کے بچے، زمین میں تھی، عالیان نہیں جو اس کی بات مان لیتا تھا۔

”میں آپ کو دکھاؤں گا نا خرگوش کے بچے،

میں آپ کو خرگوش کے دو بچے آپ کو لے دوں گا۔“

وہ چھ سال کی بچی ہی تو تھی، خوش ہو گئی تھی اس نے معذرت طلب نظروں سے عالیان کی طرف دیکھا تھا جیسے اسے عالیان کے ساتھ جانے کا احساس تھا۔

”عالی آپ بھی چلیں نا۔“ زمین اسے ہی دیکھ

”ہاں آپ! میں بھائی چلے جائیں۔“ عالی

زمین شانی کے ساتھ چلی جائے۔

عالیان نے انہیں یاد کیا تھا شایان کی آنکھیں

اس نے زمین کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور اب

اس کی طرف جارہا تھا۔ محسن میں

بارغ میں کھلتا تھا۔ حویلی سے ملحق

میں آج، امرو، جاسن، امار

کئی اقسام کے پھول

کی کئی اقسام تھیں۔ چوہدری

کی دہی کی وجہ سے یہ چھوٹا سا ایک

بچوں کے لیے جموں کے لیے خصوصی طور

یہی جگہ تھی جہاں کے ساتھ حویلی سے ملحق

ہوتی ہے اور یہ کوئی پہلی بار ایسا نہیں ہوا تھا کہ عالیان اس کی خوشی کے لیے اپنی خواہش سے دست بردار ہوا ہو کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ حالانکہ وہ کوئی بہت بڑا تو نہیں تھا صرف دس سال کا تھا لیکن اس کے ذہن میں تھا کہ وہ بڑا ہے اور اسے ہمیشہ شایان کا خیال رکھنا ہے۔ شاید عالیہ خاتون نے بھی ایسی ہی بات کہی تھی کہ اسے بھائی کا خیال رکھنا ہے شاید تب جب شایان پہلی بار اسکول گیا تھا اور تب سے لے کر اب تک وہ ہمیشہ ہی شایان کا خیال رکھتا آ رہا تھا۔ اس نے بھی سوچ رکھا تھا کہ جب وہ زمین کے ساتھ بارغ میں جائے گا تو اسے خرگوش کے دو بچے گفٹ کرے گا لیکن شایان کی خوشی کی خاطر اس نے اپنی خواہش دل میں چھپالی تھی جبکہ شایان فتح کے احساس سے سرشار زمین کا ہاتھ تھامے جا رہا تھا۔

کچھ دیر پہلے جب عالیان نے اسے بتایا تھا کہ وہ اپنا سبق یاد کر کے زمین کے ساتھ بارغ میں جائے گا تو تب ہی اس نے سوچا تھا کہ وہ زمین کے ساتھ بارغ میں جائے گا اس لیے تو وہ جلدی جلدی کام کر کے باہر آ گیا تھا۔ اسے ہر کام میں عالیان سے آگے رہنا ہوتا تھا۔ وہ عالیان سے پہلے زمین کو خرگوش کے بچے دکھانے لے گیا تھا اب بھلا وہ دس بار زمین کو لے جائے خرگوش کے بچے دکھانے اور یہ پہلی اور آخری بار نہیں تھا بلکہ وہ ہمیشہ ہی عالیان سے سبقت لے جاتا تھا۔ اس کے ذہن میں ہمیشہ یہ رہتا تھا کہ اسے عالیان سے آگے رہنا ہے۔ ہر میدان میں اور اس کے لیے وہ ہر پور کوشش کرتا تھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ عالیان سے جلتا اور حسد کرتا تھا۔ وہ تو اس پر جان دیتا تھا، دونوں میں مثالی محبت تھی۔ پتا نہیں کب اور کیسے وہ خود کو عالیان سے برتر سمجھنے لگا تھا شاید تب سے جب وہ تحریر کلاس میں تھے۔ ایک روز بریک میں عالیان کا ہاتھ ٹکٹے سے ایک بچے کا سوسہ پیچے گر گیا، جسے وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔ لڑکے نے جوان کا ہم جماعت ہی تھا یک دم ہی ایک زوردار ٹھٹھرا عالیان

کے رخسار پر مارا۔

”اگرچہ ہو، میرا سوسہ گرا دیا۔“ اس سے پہلے کہ وہ ایک پتھر اور عالیاں کو لگاتا، شایان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”تم..... تم نے میرے بھائی کو مارا۔“ شایان کا رنگ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے لڑکے کو دھکا دے کر پیچھے گر لیا تھا اور اسے اپنے پاؤں سے ٹھوک مار رہا تھا۔ وہ شایان کے مقابلے میں دبا پڑا اور کمزور سا تھا۔

”بس کرو شایان! پتلیز چھوڑ دیں اسے۔ کوئی بات نہیں اگر اس نے مجھے پتھر مارا ہے، میری وجہ سے اس کا سوسہ بھی تو گر گیا تھا۔“ لیکن عالیاں کے منع کرنے کے باوجود اس نے لڑکے کی ٹھیک ٹھاک پٹائی کر دی تھی اور پھر ہاتھ جھاڑتے ہوئے اس نے لڑکے کو وارننگ دی تھی۔

”آئندہ میرے بھائی پر ہاتھ نہ اٹھانا۔“ اس نے زبردستی دس روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔

”اور یہ لو دس روپے اپنے سوسے کے۔“ اور پھر مسکرا کر عالیاں کی طرف دیکھا تھا جو پریشان سا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اب عامر آپ کی شکایت کر دے گا اور پھر آپ کو سزا دیں گی۔“

”تو.....“ اسے پروا نہیں تھی۔ اس نے عالیاں کا بدلہ لے لیا تھا اور وہ خوش تھا۔ عامر نے ہی نہیں دوسرے لڑکوں نے بھی اس کی شکایت کی تھی کہ اس نے بریک میں عامر کو مارا ہے اور پتھر نے سزا کے طور پر اسے کلاس روم سے باہر کھڑا کر دیا تھا لیکن اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ عالیاں بھی پانی پینے اور بھی کسی اور بہانے سے باہر آتا تھا۔

”شایان آپ سواری کر لیں عامر سے بھی اور پتھر سے بھی۔ آپ نے خواہ مخواہ اسے مارا۔“

”اس نے پہلے آپ کو پتھر مارا تھا اور جو بھی آپ کو مارے گا میں ضرور اسے ماروں گا۔“

شایان کی اپنی سوچ تھی۔ اسے ذرا سی بھی

شرمندگی نہیں تھی اور وہ فخر سے گردن اکڑائے کھڑا تھا اور عالیاں کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ اسے کلاس روم میں بھیج کر خود اس کی جگہ کھڑا ہو جائے۔ اس نے خود ہی اس کی طرف سے عامر اور پتھر سے سواری کر لیا تھا۔ لیکن پھر بھی پتھر نے دو پیر پڑا اسے کلاس روم سے باہر کھڑا رکھا تھا اور یہ پہلی اور آخری لڑائی نہیں تھی جو اس نے عالیاں کی خاطر کی تھی اس کے بعد بھی کئی بار عالیاں کی وجہ سے اس کی دوسرے لڑکوں سے لڑائی ہوئی تھی۔ ایک بار تو اپنا بازو بھی تڑوا بیٹھا تھا تب وہ آٹھویں جماعت میں تھا۔ عالیاں ہر بار شرمندہ ہوتا اور ہر بار ممنون ہوتا اور اسے سمجھاتا کہ وہ خود کو مشکل میں نہ ڈالا کرے۔ کلاس فیلوز میں ایسے چھوٹے موٹے جھگڑے اور لڑائیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں لیکن وہ بھی شایان علی تھا۔ اس کے سامنے کوئی عالیاں سے جھگڑا کرے۔ اسے گالی دے وہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ عالیاں کا بدلہ لے کر اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا تھا کہ جو کام عالیاں نہیں کر سکتا تھا وہ کام وہ کر سکتا تھا۔ یہ کام اسے اپنے اندر مضبوط کر رکھا تھا۔ وہ عالیاں سے برتر تھا اور اسے ہر لحاظ سے عالیاں پر فوقیت حاصل تھی یہ خیال جانے کب اور کیسے اس کے دل میں جا گزریں ہوا تھا لیکن جا گزریں ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اسے ہر مقام پر خود کو عالیاں سے برتر ثابت کرنا تھا اور وہ کرتا تھا۔ وہ عالیاں کے مقابلے میں صحت مند تھا، بھرا بھرا جسم، بے پناہ خوب صورت آنکھیں، قد اگرچہ دونوں کے برابر ہی تھے لیکن عالیاں کا رنگ سرخ و سفید تھا۔ بے حد گلابی ہونٹ سنہرا پن لے براؤن آنکھیں، براؤن سلی بال، پیچھے کرنے کے باوجود ماتھے پر بھر جاتے تھے۔ بلاشبہ ایک خوب صورت لڑکا تھا لیکن شایان بھی کم تھا۔ اس کی گھور سیاہ آنکھوں اور چہرے کے دھڑلے نقوش میں ہلا کی جاذبیت تھی۔ عالیاں سارا کا سارا عالیاں خاتون پر گیا تھا جبکہ شایان کی ٹھوڑی بہت محسوس علی سے مشابہت تھی خاص طور پر اس کی گھور

آنکھیں اور ہلکے ہلکے ہلکے بال بالکل چوہدری محسن علی جیسے تھے۔

شایان کا دل بڑھائی سے زیادہ کھیل کود اور دوڑنی سرکریوں میں لگتا تھا لیکن وہ کسی طرح بھی عالیاں سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا سب سے حد محنت کرتا تھا اور ہمیشہ عالیاں سے ایک دو نمبر زیادہ لے لیتا تھا۔ یوں وہ فرسٹ اور عالیاں سکنڈ ہوتا۔ جب عالیہ خاتون نے محسن علی کی طرف دیکھیں تو اسے انہماکی کی خوشی ہوئی تھی۔ شروع شروع میں تو انہوں نے یہ دیکھ کر محسن علی کو بتایا بھی تھا کہ ان کا فیصلہ غلط نہیں تھا اور یہ کہ شایان نے ایک سال کی کمی پوری کر لی ہے اور ان کے خدشے کے مطابق وہ کلاس میں پیچھے نہیں رہا تھا۔ محسن علی مسکرا دیتے تھے کہ شایان کی کامیابی انہیں بھی خوش دیتی تھی۔

”یہ سب آپ کی محنت اور لگن ہے عالیہ!“ انہیں اعتراف کرتے تھے لیکن عالیہ خاتون کی محنت اور لگن اور بات بھی کتنی جودہ نہیں جانتے تھے۔ محسن علی کی کامیابی کے لاشعور میں جیسے خواہش عالیاں سے برتر ہونا، اسے ہر انا لاشعوری طور پر اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ خود بھی اپنے لاشعور میں جیسے اس جذبے سے بڑھتا تھا۔ شاید یہ جذبات اس وقت اس کے دل میں پیدا ہوا تھا جب عالیہ خاتون اسے نرسری کی تیاری کراتے

تھے۔ آپ کو بہت اچھی طرح سے پڑھنا ہے اور عالیہ خاتون ہوتا ہے ورنہ بابا آپ کو نرسری میں بھیج دیتے۔

یہ حال یہ جذبہ جیسے بھی پیدا ہوا تھا جوں جوں وہ بڑھتا گیا وہ سوچنے لگا تھا کہ وہ صرف جیتنے کے لیے لڑتا ہے۔ وہ عالیاں ہو یا کوئی اور اسے سب سے زیادہ دیکھو، تقاریر، مباحثوں سب میں کامیاب رہتا تھا۔ عالیاں کو ان غیر نصائی باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی، وہ شایان کے ساتھ ان میں حصہ لیتا تھا اور دوسری تیسری باتوں سے لیتا تھا لیکن بڑھائی میں شایان کو سر توڑ

محنت کرنا پڑتی تھی، وہ عالیاں کے بنائے نوٹس سے بھی فائدہ اٹھاتا اور ضرورت پڑنے پر اس سے مدد بھی لے لیتا تھا۔ عالیاں نے بھی اس سے مقابلہ نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی روشنی سے بڑھتا تھا اور شایان کی کامیابی پر اس سے زیادہ خوش ہوتا تھا۔

اگر محسن علی مقابلے میں عالیاں اور وہ مد مقابل آ جاتے تو اسے لگتا جیسے وہ زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہو۔ اگر وہ عالیاں سے ہار گیا تو اماں جان کا وہ مان جو اس پر بے ٹوٹ جائے گا۔ نہیں اسے عالیاں سے نہیں ہارنا اور وہ جیت بھی جاتا تھا اور پھر ایک بار اسے لگا تھا وہ عالیاں سے ہار گیا ہے عالیاں اس سے برتر ہے اور وہ..... وہ تو کچھ نہیں سمجھتی۔

میٹرک کے انٹرمیشن جا رہے تھے اور فارم فل کرنے سے پہلے پتھر نے انہیں برتھ ٹیفلٹ یا ”ب“ فارم کی کاپیاں لانے کے لیے کہا تھا۔ ان دنوں نویں دسویں کا اکٹھا امتحان ہوتا تھا۔ عالیہ خاتون عصر کی نماز پڑھنے لگی تھیں کہ شایان نے ان سے آ کر کہا۔

”اماں جان مجھے عالی کا اور اپنا برتھ ٹیفلٹ چاہیے اس کی کاپی کل اسکول لے کر جانا ہے۔ میں شہر جا رہا ہوں، دانیسی پر کاپی کروا لاؤں گا۔“

”شہر کیوں جا رہے ہیں آپ؟“

”عادل کے ہاں دعوت ہے، اس کے بھائی نے سی ایس ایس میں کامیابی حاصل کی ہے تو اسی سلسلے میں وہ لوگ ایک بڑی دعوت کر رہے ہیں۔ عادل نے بہت اصرار کیا تھا۔“

عادل کا خاندان سال بھر پہلے تک یہاں گاؤں میں ہی رہتا تھا۔ اچھا کھاتے پیتے لوگ تھے۔ عادل، عالیاں اور شایان کا ہم جماعت تھا۔ وہ لوگ سال بھر پہلے ہی شہر شفٹ ہوئے تھے۔

”عالیاں بھی جا رہا ہے کیا؟“ عالیہ خاتون نے پوچھا۔

”نہیں، اس کے سر میں درد ہے اور کچھ فلو سا بھی ہے۔“

”تو آپ اکیلے جائیں گے۔“ وہ کچھ رشتان

کی ہوگی تھیں۔

”اودہ..... ہوا ہاں جان! بچ نہیں ہوں میں۔“
”پھر بھی بائیک پہ مت جا بے گا، گاڑی لے
جانا اور شاہو چاچا سے کہنا احتیاط سے ڈرائیو کریں۔“
”اوکے اور کچھ..... اب پلیز وہ شوقیت دے
دیں۔ عادل نے کہا تھا جلدی آنا اور پھر مجھے کچھ
شاپنگ بھی کرنا تھی۔ کہاں ہیں۔“

”کہاں ہوتا ہے سارے ضروری کاغذات،
آپ کے بابا کے لاکر میں ہی ہوتے ہیں۔ لاکر کی
چابی بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں ہوگی۔“
اور وہ ان کے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا، عالیہ
خاتون نے نماز کی نیت کے لیے ہاتھ اٹھائے اور پھر
یک دم ہی گرا لیے۔

”برتھ شوقیت۔“ انہوں نے زیر لب کہا۔
”شایان کا برتھ شوقیت.....“ بھی نہ سمجھی تو یہ وقت آنا
تھا اور یہ وقت آ گیا تھا۔ ایک سال سے چوہدری حسن
علی ان سے کہہ رہے تھے کہ شایان سمجھ دار ہو گیا ہے
بہتر ہے کہ اسے حقیقت بتادی جائے اور یہ اس کا حق
ہے لیکن پتا نہیں کیوں وہ ڈر جاتی تھیں۔

”میں ملک صاحب! ابھی نہیں۔ ابھی اسے
کچھ اور پیچھور ہونے دیں۔ آپ کو پتا ہے نا وہ تھوڑا
ضدی ہے۔ پتا نہیں سب جان کر اس کا کیا رد عمل ہو،
وہ کیا سوچے اور آج اس وقت جب چوہدری حسن علی
بھی گھر پر نہیں ہیں وہ اسے کیسے پینڈل کر پائیں گی۔
کیسے سمجھائیں گی کہ بے شک انہوں نے اسے جہم
نہیں دیا لیکن وہ انہیں عالیان سے بڑھ کر پیارا ہے۔
کتنی بڑی غلطی ہوگی ان سے انہوں نے بلا سوچے
سمجھے اسے لاکر میں سے شوقیت لینے بھیج دیا۔ وہ
اسے ٹال دیتیں، رات کو جب حسن علی آتے تو خود ہی
مناسب انداز میں اسے بتا دیتے۔

اسنے سال گزر گئے تھے، انہوں نے کبھی ایک
لمبے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ شایان کو انہوں نے
جہم نہیں دیا لیکن ان کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔
حقیقت تو بہر حال حقیقت تھی اور اسے ایک روز ظاہر

ہوتا ہی تھا۔ عالیان ابھی ایک سال کا ہی تھا کہ ریان
ان کی گود میں آ گیا تھا۔ جب انہیں اس کی آمد کا پتا
چلا تھا تو وہ بے حد گھبرا گئی تھیں۔

”یا اللہ اب کیا ہوگا۔ ابھی عالی بہت چھوٹا ہے،
میں کیسے سنہال پاؤں گی دونوں کو۔ پلیز کچھ کریں،
مجھے یہ بچ نہیں چاہیے ابھی۔“

”نا شکری مت کریں عالیہ! اور اللہ تعالیٰ کا شکر
ادا کریں کہ وہ ایک بار پھر آپ کو ماں بننے کے رتبے
سے سرفراز فرما رہا ہے۔“ حسن علی کو ان کی بات بہت
بری لگی تھی۔

”آپ ایسا ہرگز نہیں کریں گی جس سے بچے کو
نقصان پہنچے۔“ انہوں نے سختی سے کہا تھا اور وہ بھی
بظاہر تو خاموش ہو گئی تھیں لیکن بارول میں خیال آیا
کہ اللہ کرے ایسا کچھ ہو جائے کہ یہ سلسلہ خود ہی ختم
ہو جائے بلکہ دو تین بار تو انہوں نے جان بوجھ کر
بھاری بھاری سامان اٹھایا لیکن جس روح نے دنیا
میں آنا ہوتا ہے وہ آ جاتی ہے۔ وہ ایک بار پھر ایک
بیٹے کی ماں بن گئی تھیں۔ جب برس نے پہلی بار ریان
کو ان کی گود میں دیا تو وہ مبہوت سی ہو کر اسے دیکھتی
رہ گئی تھیں۔ عالیان بھی بہت پیارا تھا لیکن ریان تو
جیسے چاند کا ٹکڑا تھا اور وہ کتنی ناشکری تھیں کہ اس کے
دنیا میں نہ آنے کی دعائیں کرتی تھیں۔ چوہدری حسن
علی نے ریان کے لیے الگ سے گورنس رکھ دی تھی
گو جو ملی میں عالیان یا ریان کو سنبھالنے والوں کی کمی
نہ تھی۔ لیکن جس طرح عالیہ خاتون ریان کی آمد کی خبر
سے لے کر اب تک پریشان رہی تھیں چوہدری حسن
علی نے یہی بہتر سمجھا تھا کہ ریان کی مکمل ذمہ داری
ایک سمجھ دار اور ذمہ دار نرس یا آبا کو دے دی جائے۔
لیکن عالیہ خاتون نے صاف انکار کر دیا۔

”ہرگز نہیں۔ بھلا اتنے چھوٹے بچے کو آپ ماں
سے جدا کرنا چاہتے ہیں۔ بھلا ایک ماں سے بڑھ کر بھی
کوئی اس کے بچے کی دیکھ بھال کر سکتا ہے۔“

”میں نے آپ کی پریشانی کے خیال سے
انہیں رکھا ہے۔ ابھی قائل اعتماد خاتون ہیں، کچھ

کچھ یہ ایک است کے بچوں کی بھی دیکھ بھال
کی ہے۔ میں ایک دم بہ خبریں کر گھبرا گئی
تھی لیکن اپنے بچوں کو خود سنبھال سکتی ہوں اور
ان کے لیے سارا اصرار صرف تو ہیں نا۔“

وہ کس ملی لے اصرار کے باوجود انہیں رکھنے کو
تیار نہ تھی۔ عالیان اور ریان دونوں بچے ہی
تھے اور نہ ہی تنگ کرتے تھے۔ عالیان کو تو
ایک سال کی عمر تھی لیکن ریان کو تو کچھ
بچوں سے کہیں زیادہ انہیں کیا تھا۔ اس کے حوالے
کے وہ کچھ نہیں کرتی تھیں۔ اس کا فیڈر
کے لیے وہ کچھ نہیں کرتی تھیں۔ وہ کچھ نہیں
کرتی تھیں۔ شاید وہ ان میں کہیں کوئی واہم سا
تھوڑا سا کچھ نہ ہو جائے کہ انہوں نے اس
کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کے لیے کچھ بار دعائیں کی
تھیں۔ ان کا وہم کچھ ہو گیا تھا صرف چھ ماہ
پہلے ہی ریان کو ان کو اللہ نے واپس لے لیا
تھا۔ ان کی رات کو انہوں نے خود اسے کاٹ
کر ان کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔ وہ ڈرنا سا اس کی
دیکھ بھال کرتی تھیں۔ کھانکھانے لگتا تھا۔

وہ کچھ نہیں کرتی تھیں۔ اسے دیکھا تھا
وہ کچھ نہیں کرتی تھیں۔ جب وہ انہیں اور
ایک کٹ پر تھیں تو ان کی جگہ نکل
گئی۔ ان کے ہاتھ نیچے ہو رہے تھے اور آنکھوں
کے کونے ہاتھوں سے دھو رہے تھے۔ ان کا جسم ٹھنڈا
ہو گیا تھا۔ ان کے ہاتھوں نے محسوس کی تو وہ چیختی
پھرتی رہی۔ ان تک انہیں یقین نہیں آیا تھا۔
حالانکہ وہ اس طرح تڑپ تڑپ کر روتیں
تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں ہو جاتا۔

”کچھ نہیں ناشکری کی سزا ملی ہے چوہدری
صاحب! اللہ نے دلکھیا ہے کہ میں ایسے دے کر
ان کی بھال کر دوں۔“

وہ کچھ نہیں کرتی تھیں۔ روز بروز ان کی ذہنی
حالت اب بھی بار بار تھی۔ وہ عالیان کو بھی جیسے

فراموش کر بیٹھی تھیں۔ ایسے میں چوہدری حسن علی کے
بھائی چوہدری احسن علی اپنے دو ماہ کے بیٹے کو اچانک
امریکا سے لے کر آ گئے تھے۔ ان کی بیوی اچانک دو
ماہ کے شایان کو چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ وہ چند سال
پہلے چوہدری حسن علی کے منع کرنے کے باوجود امریکا
چلے گئے تھے اور دو سال قبل انہوں نے وہاں ہی کسی
امریکن لڑکی سے شادی کر لی تھی۔

”بھابھی اسے اپنا ریان ہی سمجھے گا۔“
شروع شروع میں تو اپنی ذہنی حالت کی وجہ
سے وہ شایان کی طرف متوجہ نہ ہو سکتی تھیں۔ بس خالی
خالی آنکھوں سے اسے روتے دیکھتی رہتی تھیں۔
ایک روز جو اس نے رونا شروع کیا تو صالحہ صفوحی
کہ چوہدری احسن کی گود میں جا کر بھی چپ نہ ہوا
تب بے قرار ہو کر انہوں نے اسے گود میں لے لیا اور
وہ ان کی گود میں آتے ہی خاموش ہو گیا تھا اور انہوں
نے شایان کو ریان کا ہم البدل جان کر سینے سے لگا لیا
تھا۔ ان کی روز بروز خراب ہوتی ذہنی حالت بھی بہتر
ہونے لگی تھی۔ وہ جب اسے گود میں لے کر فیڈ
کرواتیں تو انہیں لگتا وہ شایان نہیں ریان ہے۔ اللہ
نے ریان لے کر انہیں شایان دے دیا تھا۔ اللہ نے
انہیں معاف کر دیا تھا۔ وہ شایان کا عالیان سے بھی
زیادہ خیال رکھتی تھیں۔

انہوں نے شایان کو صرف دودھ ہی نہیں پلایا
تھا انہیں لگتا تھا جیسے انہوں نے ہی اسے جنم دیا ہے۔
شایان کی طرف سے مطمئن ہو کر احسن علی واپس
امریکا چلے گئے تھے۔ حالانکہ حسن علی نے انہیں بہت
روکا تھا لیکن سات آٹھ سال سے امریکا رہنے والے
احسن علی کو اب یہاں رہنا بہت مشکل لگتا تھا۔
”آتا رہوں گا بھائی صاحب! لیکن مستقل
رہنا مشکل ہے۔“

”جیسے پہلے آئے ہو نو سال بعد۔“
حسن علی نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنی زمین، اپنی
مٹی چھوڑ کر جائیں۔
”اب تو اس کے لیے آنا ہی بڑے گا۔“

لیکن واپس جانے کے صرف اڑبھ سال بعد ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ان کا انتقال ہو گیا اور دیر سے اطلاع ملنے کی وجہ سے چوہدری حسن علی ان کی ڈیڈ باڈی بھی پاکستان نہیں لاسکے تھے۔ دونوں بھائی آپس میں رابطے میں رہتے تھے۔ چوہدری حسن علی ہفتہ دس دن بعد انھیں ضرور فون کرتے تھے اور احسن علی خود بھی فون کرتے رہتے تھے۔ جب ایک ماہ رابطہ نہ ہو سکا تو انہوں نے گھبرا کر اپنے ایک جانے والے کو امریکا فون کیا تو اس نے چند دنوں بعد اطلاع دی کہ احسن علی کسی کام کے سلسلے میں نیویارک سے ٹیکساس گئے ہوئے تھے وہاں ہی حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی بیوی نے جو امریکن ہسپتال انڈین مسلمان بھی انھیں وہاں ہی دفنایا تھا۔ صرف ایک ہفتے پہلے انہوں نے شادی کی تھی اور اس کے متعلق چوہدری حسن علی کو بتایا تھا کہ وہ شادی کرنے والے ہیں اور شادی کے بعد اپنی بیوی کے ساتھ وہ پاکستان آئیں گے اور ان کی وفات کے بعد ان کی بیوی ان کا ایئر ٹکٹ بند کر کے کہیں چلی گئی تھیں۔ اگر احسن علی زندہ رہتے تو بیٹے سے ملنے سال دو سال بعد آتے رہتے تو شایان کو بھی علم ہو جاتا کہ اس کے حقیقی والد احسن علی ہے۔ لیکن ان کے بعد کسی نے اسے نہیں بتایا تھا حتیٰ کہ عالیہ جب اسے اسکول میں داخل کروانے گئیں تو انہوں نے ولدیت کے خانے میں احسن علی کے بجائے چوہدری حسن علی کا ہی نام لکھا تھا جس پر حسن علی بہت ناراض ہوئے تھے۔

”کیوں کیا۔ وہ ہمارا بیٹا نہیں ہے۔“ ان کی اپنی منطق تھی۔

”ہاں وہ ہمارا بیٹا ہے۔ عالیان کی طرح ہی عزیز ہے مجھے لیکن اس کا باپ احسن تھا اور اللہ کا حکم ہے کہ وہ اپنے بے پالکوں کو ان کے باپوں کے ناموں سے پکارو۔“ انہوں نے حتیٰ سے تاکید کی تھی کہ وہ جا کر اپنی غلطی درست کر لیں لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اسے پتا چلا کہ وہ ہمارا بیٹا نہیں ہے تو وہ احساس کسری کا شکار ہو جائے گا رات کی سوچ تھی

لیکن اب ہاں اب وہ ان کے بیڑ روم میں شوقیت لینے گیا تھا لیکن ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ وہ یوں ہی جا نماز پر بیٹھی تھیں سارکت اور خاموش اور اپنے دل کو تسلیاں دے رہی تھیں۔

”لگتا ہے اسے نہیں ملے۔۔۔۔۔ اور اللہ کرے نہ ملیں۔ کیا خبر حسن علی نے کہیں اور رکھ دے ہوں۔“ لیکن اسے تو شوقیت مل گئے تھے۔ چند فائلیں دیکھنے کے بعد اسے پہلے عالیان کا شوقیت ملا۔

عالیان علی والد کا نام چوہدری حسن علی والدہ عالیہ خاتون

جائے پیدائش ہونی فیلی ہسپتال راولپنڈی

چند ایک کاغذات آگے چبچے کرنے کے بعد اسے اپنا شوقیت مل گیا تھا۔ یہ انگلش میں تھا۔

شایان علی قادر نسیم چوہدری احسن علی مدر نسیم ماریانہ

اور ٹیکس آف برچھ نیویارک۔

”نہیں۔“ اس نے آنکھوں کو مائل کیا بار بار پڑھا۔

قادر نسیم احسن علی، مدر نسیم ماریانہ۔

”نہیں۔۔۔۔۔ اس نے غلط نہیں پڑھا تھا۔ ایسا ہی لکھا تھا اس کے بار بار پڑھنے سے حقیقت بدل نہیں سکتی تھی۔ وہ چوہدری حسن علی اور عالیہ خاتون کا بیٹا نہیں تھا اسے لگا تھا جسے وہ یک دم آسان کی بلندی سے زمین پر آگرا ہو۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ جو سولہ سال تک خود کو عالیان سے برتر سمجھتا آ رہا تھا تو برتر تو عالیان تھا۔ یہ گھر، ماں باپ سب کچھ عالیان کا تھا اور وہ گون تھا، اس کے ماں کہاں تھے۔ اس نے والدین کے ناموں پر غور نہیں کیا تھا۔ اس کے ذہن میں تو جھک چل رہے تھے، وہ یہاں کیوں ہے؟ اپنے والدین کے گھر کے بجائے یہاں

کیا وہ لاوارث تھا اور عالیان کے بابا اور ماں جان نے ترس کھا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا اور اسے اپنی محبتوں میں عالیان کا شریک بنایا تھا۔ وہ اس سے

عالیان لکھنا یاد محبت کرتے تھے۔ وہ بابا ہوں

عالیان جان عالیان کی بات وہ بعض اوقات ٹال کر دیتے تھے لیکن اس کی نہیں۔ بھر یہ سب کیا تھا جو والدین کے اس لئے پودج تھا۔ اس کی آنکھیں ابھی بھی دھندلی تھیں۔ والدین جیسے دھول اٹھتی تھی۔ اپنا آپ اسے کچھ یاد تھا بہت کتر لگ رہا تھا۔ بابا اور ماں عالیان نے اب تک اسے بتایا کیوں نہیں کہ وہ ان کا بیٹا نہیں ہے اور اگر نہیں بتایا تھا تو اب اب عالیان نے یہ کاش اس پر ہمیشہ پردہ پڑا تھا۔ کچھ بھی کیوں احساس نہیں ہوا کہ میں کوئی لاوارث ہوں۔ اس پر بابا اور ماں جان نے ترس کھا کر صرف اپنے گھر میں رکھا ہے بلکہ اپنی سگی اولاد کی طرف تھاپا

مال خاتون نے یہ مشکل نماز ادا کی اور پھر گھبرا کر اپنے کمرے میں بیٹھیں۔ وہ ابھی تک ان کے بیڑ روم میں باہر کھڑی آ رہی تھی۔ ذرا سی دیر کو ان کا دل دلچسپ ہو گیا اور اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئیں اپنے آپ کو اس کے سامنے ہی بیڑ پر بیٹھا تھا۔ اس کی گونجیں براؤن فائل پڑی تھی اور اس نے اس کاغذ تھا۔ اس کے ہونٹ چمپھے ہوئے تھے اور انہوں نے کرب بھانکتا تھا یقیناً وہ جان لے کر رہا تھا۔

”کیا وہ میری جان! آپ ایسے کیوں بیٹھے ہیں؟“ اس نے عادل کی طرف جارہے تھے نا۔“ اس نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ عالیہ خاتون کی طرف دیکھا تو بے بسی سے انہوں نے اس کی چٹائی پر ہاتھ رکھا۔

”کیا وہ اشیان! آپ ٹھیک تو ہوتا۔“

”نہیں ان ہوں اب جان؟“ اس کے لبوں پر مسرت سی آواز آئی تھی۔

”وہ وہ جان چکا تھا، اس نے دیکھ لیا تھا۔“

”آپ شایان ہو، میرے بیٹے! میرے جگر

”اس نے نفی میں سر ہلایا۔“ میں

آپ کو دیکھ نہیں ہوں۔ میرے والدین کہاں ہیں؟

میں یہاں کیوں ہوں؟“ زخمی نظریں، ٹوٹا بکھرا ہوا۔ عالیہ خاتون نے بے اختیار اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کا سر سینے سے لگایا۔

”آپ یہاں اس لیے ہو کہ آپ کو یہاں ہی ہونا تھا شایان! آپ کوئی غیر نہیں ہو، ہمارے اپنے ہو۔ یہ آپ کا اپنا گھر ہے۔ احسن آپ کے بابا کے سگے بھائی تھے۔ احسن بھائی کے یہاں سے واپس جانے کے چند ماہ بعد ماریانہ آپ کی امی کا دماغ کی رگ پھٹ جانے سے انتقال ہو گیا تھا۔“ وہ ہولے ہولے سے بتا رہی تھیں۔

”میں نے آپ کو عالیان اسے زیادہ چاہا۔ ریان کے حصے کی محبت بھی آپ کو دی۔ آپ میرے شایان بھی تھے اور ریان بھی۔“

”آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں ماں جان!“

اس کی آواز بھراؤنی تھی۔

”آپ کے بابا جان کا خیال تھا کہ آپ ذرا بڑے ہو جائیں، سمجھ دار ہو جائیں تو لیکن پتا نہیں کیوں مجھے لگا تھا کہ اگر آپ کو پتا چل گیا کہ ہم آپ کے حقیقی والدین نہیں ہیں تو آپ کے اندر جھجک پیدا ہو جائے گی۔ آپ اس طرح مان اور لاؤ سے بات نہیں منواؤ گے۔ آپ کے اندر شاید وہ اعتماد پیدا نہیں ہو سکے گا جو اب ہے۔ ہم جانتے تھے کہ جب آپ کا شادی کا رڈ بنے گا تو ولدیت کے خانے میں احسن بھائی کا ہی نام لکھا جائے گا لیکن مجھے یہ خیال کبھی نہیں آیا تھا کہ اس سے پہلے اس کی ضرورت پڑ جائے گی ورنہ آپ کے بابا تو کب سے کہہ رہے تھے کہ آپ کو حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے گا۔“

انہوں نے تھکے تھکے گھر کر اس کی طرف دیکھا وہ یوں ہی سپاٹ چہرے کے ساتھ بیٹھا تھا۔

”بے شک میں نے آپ کو جنم نہیں دیا لیکن آپ کی ماں تو میں ہی ہوں نا، آپ دو ماہ کے تھے شایان! صرف دو ماہ کے۔ میں نے آپ کو دودھ پلایا، سنبھالا، راتوں کو آپ کے لیے جاگی۔ عالی بھی کوئی بہت بڑا تو نہیں تھا لیکن آپ اس سے چھوٹے

تھے۔ آپ کو میری زیادہ ضرورت تھی، میں آپ کے لیے اکثر عالی۔ کو بھی نظر انداز کر دیتی۔“

وہ ہولے ہولے اس کا ہاتھ سہلا رہی تھیں، اس کی سیاہ آنکھوں میں لہراتا شکوہ دم توڑنے لگا۔ وہ غلط تو نہیں کہہ رہی تھیں انہوں نے ہمیشہ اسے عالیان پر فوقیت دی تھی۔ یہ گھر اس کا بھی اتنا ہی تھا جتنا عالیان کا، وہ کسی بھی طرح عالیان سے کمتر نہیں تھا۔ زمین، جائداد ہر چیز میں وہ برابر کا حصہ دار تھا۔ حسن علی نے اسے بتایا تھا کہ جب وہ اٹھارہ سال کا ہو جائے گا تو اس کی جائداد اس کے نام ہو جائے گی اور اس کی زمین کی آمدنی اس کے اکاؤنٹ میں جمع ہوتی رہتی ہے اور جسے وہ اٹھارہ سال کا ہونے کے بعد خود نکلوا سکے گا۔

ہاں وہ کوئی لاوارث نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے سنبھلنے میں کچھ دن لگے تھے اور ان دنوں عالیان عالیہ خاتون اور چوہدری حسن سب نے اس کی بہت دل جوئی کی تھی۔ بظاہر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، عالیہ خاتون کی محبتیں، چوہدری حسن علی کی شفقتیں، عالیان کی دوستی اور پیار سب ویسا ہی تھا لیکن اندر کہیں عالیان کو ہرانے، اس پر رخ پانے کی خواہش پہلے سے کہیں شدید ہو گئی تھی، اس خواہش میں جارحیت بھی شدت تھی۔

وہ معصوم سا احساس کہ اسے عالیان سے زیادہ نمبر لینے ہیں اسے ناکام ہو کر اماں جان کو شرمندہ نہیں ہونے دینا۔ اسے ثابت کرنا ہے کہ وہ عالیان جتنا لائق نہیں ہے اور اسے ہرانے کے لیے اسے محنت کرنی ہے۔ وہ اسکول سے کانچ میں آگئے۔ کانچ میں بھی وہ ہر میدان میں عالیان سے آگے ہی رہا۔ وہ زبردست ڈیپٹی اور بہترین کھلاڑی تھا اور عالیان کو ہرا کر بے حد خوش محسوس کرتا تھا جبکہ عالیان اپنی بارہ بھی اتنا اداس نہیں ہوتا تھا جتنا اس کے جیتنے پر خوش ہوتا تھا۔ ہر مقابلے کے بعد وہ اعتراف کرتا کہ وہ شایان سے کبھی جیت نہیں سکتا اور شایان بے اختیار مسکرا اٹھتا۔۔۔ ایک فاتح کی مسکراہٹ۔

☆☆☆

وہ دونوں کانچ سے یونیورسٹی میں پہنچ گئے۔ ان دنوں چوہدری حسن علی نے اسلام آباد میں گھر لے لیا تھا۔ سو دونوں جوشل کے بجائے گھر میں ہی رہتے تھے۔ عالیہ خاتون بھی گاؤں سے اسلام آباد آ گئی تھیں۔ دونوں جب ساتھ ساتھ گھر سے نکلے تو نظر لپک جانے کے ڈر سے عالیہ خاتون انہیں نظر بھر کر دیکھتی تھیں۔ وہ بے حد دہیدہ و خلیل تھے۔ دونوں کی محبت اور دوستی مثالی تھی، دونوں ایک دوسرے کا خیال ایک دوسرے سے بڑھ کر رکھتے تھے۔ دونوں نے کبھی کسی تیسرے کو دوست بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ سب کلاس فیوز کے ساتھ دونوں کی اچھی دعا سلام تھی لیکن ایسا نہیں تھا کہ کوئی ایک کسی ایک کا خاص دوست ہو لیکن پھر پتا نہیں کیسے علیزہ احمد ان کے درمیان آ گئی تھی۔ وہ ذہین تھی، خوب صورت تھی اور پولڈ بھی۔

ان دنوں وہ چھٹی پر تھا، اسے ٹائیٹفائیڈ ہو گیا تھا اور ڈاکٹر نے ریست چلایا تھا۔ عالیان اکیلا ہی یونیورسٹی جاتا تھا گو وہ کم کھاتا اور کسی سے جلدی نہ کرتا تھا۔ خصوصاً لڑکیوں سے لیکن علیزہ احمد جولاء ہو کر سے بائیسگریشن کروا کے ان ہی کی ڈیپارٹمنٹ میں آئی تھی۔ وہ اس کے دوستی کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹک نہ سکا تھا۔ ان دنوں شایان کے نہ آنے کی وجہ سے وہ یوں بھی زیادہ تر اکیلا ہی ہوتا تھا۔ ایسے میں علیزہ نے خود اس کی طرف پیش قدمی کی تھی اور جب وہ تقریباً بیس دن بعد یونیورسٹی آیا تو اس نے کسی قدر حیرت سے خاور ربانی کی بات سنی تھی۔

”یار آج کل تمہارے بھائی اور علیزہ احمد کا زبردست انفریج چل رہا ہے۔“

”کیا واقعی؟“ وہ حیران ہوا تھا۔

”جی ہاں! علیزہ احمد تمہارے بھائی پر مر مٹی ہے۔ تمہارا بھائی تو کسی ہیرو سے کم نہیں ہے۔“

عالیان نے بس ایک بار سرسری سا ذکر کیا تھا

ایک فی لڑکی ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں آئی ہے۔ یوں وہ ہر بات تفصیل سے بتاتا تھا۔ وہ گھر سے کیا لیکچر دے، کتابیں جو وہ لائبریری سے لے کر آتا، اپنے نوٹس اس کے ساتھ شیئر کرتا لیکن وہ لڑکی اس نے ایک بار سے زیادہ نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں ایک گرہ سی پڑ گئی تھی، اس عالیان کے لیے جو بچپن سے لے کر اب تک اس کے لیے لپکتی پھوٹی خواہشیں اور خوشیاں قربان کرتا آیا تھا اور اسے بھی بچھٹاوا نہیں ہوتا تھا، وہ شایان کی لپٹ پر خوش ہو جاتا تھا۔

”علیزہ اور عالیان ہاڈامیزنگ۔“ اس نے یہ مکمل اپنی حیرت پر قابو پایا تھا۔

”عالیہ تو کانچ میں بھی لڑکیاں مارتی تھیں لیکن عالی نے بھی کسی کو گھاس نہیں ڈالی تھی تو کیا اب عالیہ بھی علیزہ پر مر مٹا تھا۔“ وہ عالیان اور علیزہ کے تعلقات سب کچھ جاننا چاہتا تھا، وہ سب جو اس کی عدم موجودگی میں ہوا تھا۔

”عالی کے دل کا حال تو خود اسے ہی پتا ہوگا۔ لیکن ہم نے جو دیکھا ہمیں تو صرف وہی پتا ہے۔ شروع میں تو عالیان رساں تر و اتار رہا لیکن پھر لاپرواہی اس کے صن کے سامنے گھٹنے ٹیک دے کر پچھلے پردہ دونوں سے وہ دونوں ہر جگہ اکٹھے ہی نظر آتے ہیں۔ صن + دولت۔“ خاور نے ایک آنکھ پٹی۔

”بڑے بڑے پارسواؤں کو اس کے سامنے گھٹنے دیکھا ہے تو تمہارا بھائی کیا چیز ہے۔ علیزہ جی میں حسنین ہے اور پھر سونے پر سہاگا ایک بڑے محنت کار کی اکلوتی بیٹی۔ ٹیبل اور منصور جیسے کئی اس نے آگے پیچھے بھرتے رہے لیکن کسی کی دال نہیں کھائی اور فاتح تمہارا بھائی ظہر اکہ اس نے علیزہ احمد کا دل جیت لیا تھا۔“

”نہیں۔“ اس کے ہونٹ ہنسنے لگے تھے۔

”بہت ہمیشہ اس کا مقدر رہی ہے تو اب بھی اس کا مقدر ہی ہوگی۔“

”تو بھی تمہارا ہیرو آ رہا ہے۔“

خاور نے پارکنگ کی طرف سے آتے عالیان کو دیکھ کر کہا، جو ڈرائیور شاہو چاچا سے کچھ بات کرنے کے لیے رکا تھا اور شایان اسے بات کرتا چھوڑ کر اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف آ گیا تھا۔

”سوری شانی! وہ شاہو چاچا کو گاؤں بات کرتی تھی، کہہ رہے تھے پوتا بیمار ہے کچھ، میں نے بات کر دادی۔“

”اوکے۔“ شایان بے حد سنجیدہ تھا۔

”خاور بتا رہا تھا سر ہدائی آج نہیں آئے۔ لائبریری چلیں۔“

”چلتے ہیں۔“

عالیان نے بھی اس کی کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا۔ تب ہی علیزہ احمد تیز چلتی ہوئی ان کے قریب آئی۔

”ہیلو عالی! کل تم جلدی گھر چلے گئے تھے۔ میں تمہیں لائبریری اور کینٹین میں دیکھتی رہی۔“ وہ بہت بے تکلفی سے پوچھ رہی تھی۔ اس نے پاس کھڑے شایان کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور اس کا ایسے نظر انداز کرتا شایان کو بری طرح چبھاتا تھا۔

”ہاں کل میرے سر میں کچھ درد تھا اس سے ملو یہ میرا بھائی ہے شایان۔“

عالیان نے تعارف کروایا تو تب بھی اس نے ایک سرسری سی نظر اس پر ڈالی۔

”اچھا تو یہ ہیں شایان! عالیان سے آپ کا بہت ذکر سنا ہے۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔“

”فائن!“ اور وہ ہلکا سا سرخم کر کے پھر عالیان کی طرف متوجہ ہو گئی تھی اور وہ عالیان سے معذرت کرتا ہوا کہ اسے کچھ ضروری نوٹس بتانے ہیں لائبریری کی طرف چلا گیا تھا۔

علیزہ احمد نے اسے عالیان کے سامنے نظر انداز کر دیا تھا۔

”تو۔۔۔ نیو۔۔۔ نہیں۔ عالیان جی انہیں۔۔۔ تم مجھ سے سبقت نہیں لے جاسکتے۔“

”جانیے۔“

”بھلے وہ کسی لڑکی کا دل جیتتا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ

اے لاشعور میں ہوتی کشش ہے بے خبر۔" لہذا لہذا
ساکچہ دیر لایبریری میں بیٹھا کسی کتاب کی ورق
گردانی کرتا رہا اور پھر عالیاں کو بتا کر گھر آ گیا تھا۔

اور پھر صرف پندرہ دنوں بعد ہی سب نے
حیرت سے دیکھا کہ وہ علیزہ احمد جو عالیاں کے آگے
پچھے پھرتی رہتی تھی اور اپنے گروپ میں بہت بے
باغی سے کہتی تھی۔ وہ پہلی نظر میں ہی عالیاں کی محبت
کا شکار ہو گئی ہے۔ اب شایان کے ساتھ گھومنے لگی
تھی اور اسی بے باکی سے اپنے گروپ کی لڑکیوں
میں وہ شایان علی کی محبت کا دم بھرنے لگی تھی۔

"عالیاں اور شایان میں بہت فرق ہے یا را! اور
ہمیشہ سے میرا پینڈل شایان علی جیسا شخص ہی رہا ہے۔
میں وقتی طور پر عالیاں کی وجاہت اور اس کی شخصیت
سے متاثر ہو گئی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ یہ محبت ہے۔"

کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ عالیاں علی کو چھوڑ کر
کیسے شایان علی کی اسیر ہوئی تھی۔ کوئی بھی نہیں سوائے
شایان کے کہ اس نے کیسے علیزہ احمد کو اپنی طرف
مائل کیا تھا۔ اب یہ محض اتفاق تھا یا اس کی قسمت کہ
عالیاں کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اسے غلو ہو گیا تھا اور
علیزہ احمد اس سے عالیاں کا پوچھنے آئی تھی کہ وہ
یونیورسٹی کیوں نہیں آیا۔ یوں عالیاں کے حوالے
سے ان کے درمیان بات چیت شروع ہوئی تھی۔
عالیاں صرف دو دن یونیورسٹی نہیں آتا تھا۔ ان دو
دنوں میں ان میں خاصی بے تکلفی ہو گئی تھی، اس کا
بولڈ انداز، اس کی شوخی و برہنہ انگلی ہمیشہ ہی اسے
عالیاں سے ممتاز کرتا تھا اور اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

علیزہ احمد کو بتا ہی نہیں چلا تھا کہ وہ کب عالیاں
اور شایان کا موازنہ کرنے لگی تھی اور کب اسے لگا تھا
کہ اس نے انتخاب میں جلدی کی تھی۔ اس کا
آئیڈیل تو شایان تھا۔ عالیاں کم کو تھا، خاموش طبع
تھا۔ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں کئی بار اپنی پسندیدگی کا
اظہار کر چکی تھی۔ وہ صرف مدغم سا سکرا دیتا تھا تو وہ
اس کی بات سمجھتا نہیں تھا یا پھر جان بوجھ کر نظر انداز
کرو دیتا تھا۔ لیکن شایان کے شوخ مسخی خیز جملے یاد

کر کے اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتی
تھیں اور وہ بات جو عالیاں کی سنجیدہ فطرت کی وجہ
سے وہ اس سے نہ کہہ سکتی تھی وہ اس نے عالیاں سے
کہہ دی۔

"آئی ایم فل ان لوڈ پوٹاشی!"

اور اس روز شایان کو لگا تھا کہ وہ نامعلوم سی ہے
چینی اور اضطراب جو اسے کئی دنوں سے گھیرے
ہوئے تھے، یک دم جیسے ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ اس
نے عالیاں کو ہرا دیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ فارغ ہلا خیر
وہی تھہرے گا سو وہ علیزہ احمد کا دل جیت چکا تھا جس
کے متعلق خاور ربانی نے کہا تھا کہ عالیاں علی نے اس
کا دل جیت لیا ہے اس روز بڑے دنوں بعد وہ علیزہ کو
نظر انداز کیے سارا وقت عالیاں کے ساتھ رہا تھا۔
ایک بار پھر سے وہ اور عالیاں ساتھ نظر آنے لگے
تھے اور علیزہ احمد شایان علی کو تلاش ہی رہ جاتی۔

"کیا بات ہے شانی! کیا علیزہ سے ناراضی
ہو گئی ہے تمہاری؟" عالیاں کے لبوں پر ساداسی
مسکراہٹ تھی۔

"نہیں تو....." شایان علی نے اسے بغور دیکھا۔

"وہ خواہ مخواہ فری ہونے کی کوشش کرنے لگی
تھی۔ بقول اس کے اسے مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔"

"تو کیا نہیں ہو سکتی محبت..... میرا بھائی اتنا
شان دار ہے کہ کوئی بھی لڑکی اس کی محبت میں جلا

ہو سکتی ہے۔" عالیاں کا لہجہ سادا سا تھا اور اس نے
بہت محبت سے شایان کو دیکھا۔

"لیکن میں تو صرف تمہاری وجہ سے اس سے
اچھی طرح ملتا تھا میں نے سنا تھا کہ تم اس سے محبت

کرتے ہو۔"

"نہیں..... ہرگز نہیں۔" عالیاں حیران ہوا
تھا۔ "میں بھلا ان خرافات میں کیسے پڑ سکتا ہوں۔
جب منزل سامنے ہو تو راستوں میں پڑاؤ نہیں

ڈالے جاتے۔ یہ یونیورسٹی فیلو بھی پروں کے
بنانے میں ماہر ہیں۔ وہ یہاں جسکی کیا کچھ

وغیرہ کا چکر تھا کہ اس کے ڈیڈی نے اسے یہاں

لا کر اسے اس ایسی جگہ پر پہنچی جاسے تھی، تم
اس کو لے کر آ رہے تھے تو میں اس کی باتیں سن
رہی تھی۔" وہ حالی کے سلسلے میں بھی اسے کچھ مدد کی
شکرت تھی، جو نہیں کر دیتا تھا۔"

عالیاں اسے تفصیل بتا رہا تھا اور یہ حقیقت تھی
کہ علیزہ نے اپنی تنہائی اور اجنبیت کی کہانی اس
سے سنا لی تھی کہ عالیاں کو اس سے ہمدردی ہو گئی تھی
اور اس نے اس کی دوستی کا بڑھا ہوا ہاتھ تمام لیا تھا اور
پھر ایک دم اس کے پیچھے ہٹ جانے پر اور شایان کی
ساتھ ہونے جانے پر کچھ حیرت ہوئی تھی لیکن اسے
پھر اپنی بات پر اتنا ہے اس اجنبی ماحول میں پہنچی
جاسے گی۔ شایان اسے دے رہا تھا۔

"تو تم اس سے محبت نہیں کرتے۔"

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اس راستے پر چلنے کی
اجازت صرف ایک ہستی کو ہو سکتی ہے وہ مجھے میرا

میں بات دینا ہے۔" اس کے لبوں پر بڑی دل
چاہی نظر آ رہی تھی اور اسی لمحے شایان کی علیزہ میں

پہچان ہو گئی تھی۔

"عالیزہ! ابھی لڑکی ہے، فیملی بیک گراؤنڈ
اس کا کیا ہے؟" وہ کہتا تھا۔ "میرا ہے۔" کہو تو اماں جان سے

پوچھ لو۔"

"اماں جان سے میں خود بات کر سکتا ہوں۔"

"نہیں! بھلا گیا تھا۔"

"وہ ہاں، تمہارا تو ہمیشہ ڈائریکٹ رابطہ رہا
ہے۔" عالیاں ہنس پڑا تھا۔ "اور تم تو کسی

کسی کی بات نہ کر کے تو اماں جان تمہاری بات
سنائی۔" یہ تو پھر علیزہ احمد ہے۔ ایک اعلا اور

ہم پر۔" علیزہ نے کہا۔

"اماں! یہ بے زادی چھپاتا ہوا عالیاں کے
ساتھ تھا اور اس دن کے بعد سے علیزہ احمد

اس کی بہن بن گئی اور وہ اسے نظر انداز کرتا رہتا۔
اس نے علیزہ کو آتا تو علیزہ گلہ کرتی اور وہ ٹال

دیتا تھا۔ علیزہ احمد کا دل جیت لیا تھا اور اب
اس نے علیزہ کو اپنی نہیں رہی تھی۔ وہ خوب

اس کی بات نہ کرتا تھا۔

اس کی بات نہ کرتا تھا۔

صورت تھی لیکن اسے اتنی بھی خوب صورت نہیں لگی
تھی کہ وہ اس کے سامنے دل ہار جاتا۔

☆☆☆

اس روز وہ عالیاں کے ساتھ گھر جا رہا تھا کہ
علیزہ نے اچانک ہی آکر اسے روک لیا۔

"پلیز شانی! ایک منٹ میری بات سن لو۔"

اس نے عالیاں کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ لہذا

بھر کے لیے ایک کینیسی خوشی نے اس کے دل میں

سراٹھایا اور وہ اس کی بات سننے کے لیے رک گیا۔

عالیاں اسے پارکنگ میں انتظار کرنے کا کہہ کر چلا

گیا تھا۔ علیزہ چاہتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ کسی اچھی

جگہ پر بیٹھ کرے اور پرسکون ماحول میں وہ کچھ دیر

سکون سے بات کر سکیں۔

وہ اسے اپنے ڈیڈی کے متعلق بھی بتا رہی تھی

کہ وہ چند دنوں تک اسلام آباد آ رہے ہیں اور وہ

چاہتی ہے اسے اپنے ڈیڈی سے ملوے۔ وہ یہ مشکل

اس سے جان چھڑا کر پارکنگ کی طرف بڑھا ہی تھا

کہ یک بعد دیگرے دو گولیاں چلنے کی آواز آئی اور

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ قاتل کہاں ہوئے ہیں کہ

ایک کلاس فیلو دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا۔

"شایان..... شایان..... عالیاں کو گولی لگ

گئی ہے۔"

اور اسے لگا تھا جیسے اس کا دل دو ٹکڑے ہو گیا ہو۔

وہ بھاگتا ہوا پارکنگ تک آیا تھا اور لڑکوں کا دائرہ توڑ کر

عالیاں کے پاس پہنچے ہوئے اس کا سر گود میں رکھا۔

"عالیاں..... عالی..... آنکھیں کھولو۔"

کردی تھی۔ عالیان کو ہاسٹل پہنچا دیا گیا تھا۔
 ”گوئی بالکل گردے کے پاس تھی ہے، شاید گردے کو
 بھی نقصان پہنچا ہو۔ خون بھی بہت نکل گیا ہے۔“
 چنانچہ کس نے کہا تھا، کسی ٹرس نے یا کسی
 ساتھی اسٹوڈنٹ نے۔
 ”پلیز میرا گردہ لے لیں، میرے جسم سے
 سارا خون نکال لیں لیکن میرے بھائی کو بچا لیں۔“
 اس نے آپریشن تھیٹر سے باہر نکلتے ہوئے
 ڈاکٹر کی منت کی۔

”ریلیکس ایک بول کانی ہے جو آپ دے چکے ہیں۔“
 وہ پھر جتنے دن ہاسٹل میں رہا شایان اس کے
 پاس ہی رہا۔ عالیہ اور سن چوہدری کو وہ زبردستی گھر
 بھیج دیتا تھا اور عالیان اپنے لیے اس کی اتنی محنتیں
 دیکھ کر کمزور ہو جاتا۔
 ”تمہاری پڑھائی کا حرج ہو رہا ہوگا شایانی! تم
 یونیورسٹی چلے جایا کرو۔ دن کو اماں جان آ جاتی ہیں،
 بابا بھی ہوتے ہیں اور شاہو چاچا تو ہر وقت باہر ہی
 ہوتے ہیں۔“

”پڑھائی تم سے زیادہ اہم نہیں ہے عالی!“
 اور عالیان کی آنکھوں میں کی پھیل گئی تھی۔
 ”میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ تم میرے بھائی ہو۔“
 ”یہ سنی بات میں تمہارے لیے بھی کہہ سکتا
 ہوں، اگر میں یہاں ہوتا تمہاری جگہ تو کیا تم مجھے
 ہاسٹل چھوڑ کر یونیورسٹی جاسکتے تھے۔“ عالیان نے
 فنی میں سر ہلایا۔

”تو..... اگر میں تمہارے لیے کچھ کروں گا تو
 تمہارا حق ہے مجھ پر اور تم میرے لیے کچھ کرو گے تو
 میرا حق ہے تم پر اور اس کے لیے میں بھی تمہارا
 شکر یہ ادا نہیں کروں گا۔“
 اور عالیان مسکرا دیا تھا۔

”اور میں نے کون سا تمہارا شکر یہ ادا کیا تھا۔
 میں تو صرف یہ چاہ رہا تھا کہ تمہاری پڑھائی کا حرج نہ
 ہو۔ آخر تمہیں مجھ سے زیادہ خبر ہے ہوتے ہیں۔“

”وہ تو میں اب بھی لے لوں گا۔ تم مجھ سے کبھی
 نہیں جیت سکتے عالی!“ اور دونوں ہی ہنس پڑے تھے۔
 ”اور میں نے تو سوچ رکھا تھا کہ اگر
 خدا نا خواستہ تمہیں کچھ ہو گیا تو میں بھی خود کو قسم کر لوں
 گا اور مرنے سے پہلے اماں جان کو وصیت کر جاؤں گا
 کہ پہلے میرا جنازہ اٹھایا جائے پھر تمہارا۔ یعنی سفر
 آخرت میں بھی تم سے چند قدم آگے۔“
 وہ ہولے سے جہا لیکن عالیان کا رنگ زرد
 پڑ گیا تھا۔

”یکومت۔“
 ”بک نہیں رہا، کچ کہہ رہا ہوں۔ اگر مرنا جینا
 اپنے اختیار میں ہو تو موت میں بھی تم سے سبق
 لے جاؤں۔“ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔
 ”بھی کبھی مجھے تمہاری ان شدتوں سے ڈر
 لگنے لگتا ہے۔“ عالیان سنجیدہ تھا۔

”میں کبھی بھی تم سے جیتنا نہیں چاہتا شانی!
 مجھے تمہاری جیت سے ہمیشہ ایسی ہی خوشی ہوتی ہے
 جیسے یہ میری اپنی جیت ہو۔ تم فرسٹ آتے ہو تو مجھے
 لگتا ہے میں فرسٹ آیا ہوں لیکن اگر کبھی اتفاق سے
 کچھ ایسا ہو گیا کہ کسی مقام پر میں تم سے آگے نکل گیا
 تو..... تم نہ جیت سکتے تو مجھے اس لمحے سے بہت خوف
 آتا ہے، پلیز تم اپنے اس کریر کو کم کرو۔“
 ”ایسا بھی ہو نہیں سکتا عالی!“

وہ ہمیشہ ہی پر یقین رہتا تھا۔ اسے اپنی ذات
 پر اعتماد تھا کہ وہ کبھی عالیان سے پیچھے نہیں رہ سکتا۔
 ”مجھے ہمیشہ شخ باب ہوتا ہے اور فتح میرے
 مقدر میں لکھی جا چکی ہے۔ سو تم کسی ایسے نادیدہ لمحے
 سے پریشان مت ہو جس نے بھی ہماری زندگیوں
 میں نہیں آتا۔“

”شایان ازدی گریٹ۔“
 مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار ہوئی اور دیر
 تک رہی۔ عالیان نے دل ہی دل میں ہمیشہ اس کی
 کامیابیوں کی اور اس کا یقین نہ مٹنے کی دعا کی۔
 لیکن کبھی بھی آدمی کا یقین اس بری طرح ٹوٹا

نہیں کہ وہ اس کی جہالت اور اس کے ساتھ بھی
 اس کا ہنسنا نہ سمجھتا تھا۔ کیا تھا۔ محبت کی بازی
 میں عالیان کا فرار پایا تھا اور وہ شکست خوردہ۔
 اس کا دل ان کی بازی ہار گیا تھا اور خالی ہاتھ تھا
 وہ شایان کی طرف ہاری ہوئی بازی جیتنے کا ہنر
 نہ تھا۔ ہاں وہ اپنا ہنر طریقے سے بلا خرچ کا
 ادا کرتا تھا۔

عالیان کے چھوٹے ماموں کی
 ان کی ساری سال کی عمر میں مظہر چوہدری جو شاہجہ
 میں ان کے بھائی کی شہرت کو ساتھ لے گئے تھے۔ جب
 ان کی عمر تین سال کی تھی۔ شایان کی خواہش ہوئی
 کہ وہ صرف اس کے ساتھ کھیلے اسی کی ساتھی
 کی بہن کی بہن عالیان کی ساتھی بننا چاہتی
 تھی۔ عالیان عالیان شایان کا خراب موڈ دیکھ کر اسے
 ان کی باتیں سننے پر رضامند کر لیتا تھا۔ جب تک
 وہ ان کی باتیں سن لیتا تھا۔ ان کی باتیں سن لیتا تھا۔
 جب وہ تین سال کی تھی۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو وہ
 ان کی باتیں سن لیتا تھا۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو وہ
 ان کی باتیں سن لیتا تھا۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو وہ

ان کی باتیں سن لیتا تھا۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو وہ
 ان کی باتیں سن لیتا تھا۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو وہ
 ان کی باتیں سن لیتا تھا۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو وہ
 ان کی باتیں سن لیتا تھا۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو وہ
 ان کی باتیں سن لیتا تھا۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو وہ
 ان کی باتیں سن لیتا تھا۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو وہ
 ان کی باتیں سن لیتا تھا۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو وہ

ان کی باتیں سن لیتا تھا۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو وہ
 ان کی باتیں سن لیتا تھا۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو وہ
 ان کی باتیں سن لیتا تھا۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو وہ
 ان کی باتیں سن لیتا تھا۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو وہ
 ان کی باتیں سن لیتا تھا۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو وہ
 ان کی باتیں سن لیتا تھا۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو وہ
 ان کی باتیں سن لیتا تھا۔ جب وہ گیارہ سال کی تھی تو وہ

اب جب کچھ آسامیوں کی ضرورت تھی تو دونوں
 اپنائی کیا ہوا تھا اور ان دونوں کال کے منتظر تھے ایسے
 چوہدری مظہر کی آمد نے زندگی میں رنگ بھر دیے تھے
 زمین پر پہلی نظر پڑتے ہی شایان اپنا دل
 ہٹا تھا۔ وہ غم کی سی زمین بے تحاشا خوب صورت
 ہوئی تھی۔ سیاہ اسکارف کے بالے میں گھرے اس
 چہرے کی طرف اس کی نظر اٹھی تو پھر واپس آتا بھو
 گئی تھی۔ اسے زمین مظہر سے محبت ہو گئی تھی۔
 نظر کی محبت۔ وہ رات کو بستر پر لیٹا تو آنکھوں کے
 سامنے زمین کا سراپا آ جاتا۔ دلکش، ہولے ہولے
 باتیں کرتی نرمی سے مسکراتی، لگا ہیں جھکائے اس کے
 اور عالیان کے سوالوں کے جاب دیتی وہ اسے کسی
 اور ہی دنیا کی مخلوق سمجھتی تھی۔
 ”لگتا نہیں زمین کہ آپ اتنے سال کینیڈا میں
 رہی ہیں۔“ وہ یوں ہی اس سے باتیں کرنے کے
 بہانے ڈھونڈتا تھا۔

”کیوں، کیا کینیڈا سے آنے والوں کے ماتھے پر
 کوئی چھاپ لگی ہوتی ہے؟“ زمین کے لبوں پر مدھم مدھم
 مسکراہٹ نمودار ہوئی تو وہ بھی قدرے شرمناک ہوا تھا۔
 ”نہیں لیکن آپ کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے آپ
 کینیڈا سے نہیں چک باختر شاہ سے آ رہی ہیں۔“ اس
 نے اس کے اسکارف کی طرف اشارہ کیا۔

”اس لیے کہ میرے والدین نے مجھے اپنی
 روایات، ثقافت اور مذہب کی پہچان اچھی طرح سے
 کروادی تھی اور میں یہ بھی نہیں بھولی کہ میرا مذہب
 اور میری روایات کیا ہیں لیکن لگتا ہے کہ آپ مجھے
 پور پی رنگ میں رنگا دیکھنے کے منتہی تھے۔“ اس کی
 نظریں ذرا کی ذرا اس کی طرف اٹھی تھیں۔
 ”ہرگز نہیں۔“ شایان نے فوراً کہا۔

”یقین کریں زمین! آپ کے اس روپ نے
 تو اسیر کر لیا مجھے۔ بخدا آپ تو اسکارف میں کسی حور
 کی طرح لگ رہی ہیں۔“
 زمین ذرا سی چوٹی پھر عالیان کے آنے پر وہ
 اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی اور لگتا تو وہ اس کی طرف

وہ ایک ہفتہ حویلی میں رہ کر اپنے گھر منتقل ہو گئے تھے۔ جسے عالی خاتون نے ان کے آنے سے پہلے نیا رنگ دروغن کروا کے صاف کروا دیا تھا۔

اس ایک ہفتے میں کئی بار اس کا دل چاہا کہ وہ زمین کو بتائے کہ وہ اس کی محبت میں چلا ہو گیا ہے لیکن وہ علیزہ احمد یا کوئی اور لڑکی نہیں تھی۔ وہ اس حویلی کی عزت تھی، وہ کیسے منہ بھاڑ کر اس سے یہ سب کچھ کہہ سکتا تھا۔ اسے بس اماں جان سے بات کرنا تھی، انہیں بتانا تھا کہ زندگی بھر کی رفاقت کے لیے اسے زمین مظہر کا ساتھ چاہیے اور بس۔ لیکن اسے دیکھتے ہی اس کی آنکھیں لودہ بننے لگی تھیں اور اس نے سنا تھا عورت مرد کی نظر پچھانتی ہے تو کیا زمین نے اس کی جذبے لٹائی آنکھوں سے کچھ اخذ نہ کیا ہوگا۔ وہ سوچتا تھا، ضرور اسے کچھ نہ کچھ احساس تو ہوا ہوگا۔ مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ کر معدوم ہو جاتی، یہ لڑکیاں بڑی کشتی ہوتی ہیں۔ بھی خود سے دل کی بات نہیں کہتیں۔ وہ آئینے میں خود کو دیکھتا تو ایک پر غرور سی چمک اس کی آنکھوں میں نمودار ہوتی۔

”ہاں شایان علی ایسا ہے کہ کوئی بھی لڑکی جس کی طرف وہ دیکھے اپنا دل اس کے آگے ہار دے۔“

اسے اپنی شخصیت، اپنی پرستش پر بے طرح ناز تھا۔ اس نے ایک لمحہ کے لیے بھی عالیان کے متعلق نہیں سوچا تھا کہ آخر وہ بھی تو اس گھر میں ہے۔ خود بروہ و دبیرہ اور اس کا پلٹس پوائنٹ زمین مظہر کا رگ پھوپھی زاد ہونا لیکن اسے تو خود پر بے تحاشا مان اور یقین تھا کہ وہ جب بھی زمین کے آگے دامن دراز کرے گا، رد نہیں کیا جائے گا۔ لیکن زمین سے کچھ کہنے سے پہلے اسے اماں جان سے بات کرنا تھی اور ابھی وہ اماں جان سے بات کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی انٹرویو کال آگئی اور ہجرت کی بات یہ تھی کہ عالیان کی کال نہیں آئی تھی۔ حالانکہ میرٹ تو تقریباً برابر ہی تھا دونوں کا۔ مگر مندی کے احساس سے دل ہی دل میں مغرور ہوتے ہوئے وہ عالیان

کے روم میں آیا تھا۔

”برادر سنو! میرا انٹرویو لیٹر آ گیا ہے جب کہ تمہارا نہیں آیا۔ پرسوں میرا انٹرویو ہے۔ میں کل صبح عادل کی طرف چلا جاؤں گا۔ اس کے چاچا اٹاک انرجی میں ہیں نا، انٹرویو کے سلسلے میں ان سے پوچھوں گا۔ عادل نے بات کر لی ہے ان سے، تم بھی چلو نا ساتھ دونوں تیاری کر لیں گے۔“

”میں جا کر کیا کروں گا یار! جب میرا انٹرویو لیٹر ہی نہیں آیا۔“

”تمہیں افسوس نہ ہو رہا ہوگا عالی!“ اس نے یوں ہی پوچھ لیا۔

”نہیں تو، بھلا افسوس کیوں ہوتا۔ اچھی بات ہے نا تمہاری خواہش ہوتی ہے نا مجھ سے آگے رہنے کی سوتہاری خواہش پوری ہوگئی۔ میرا جب آنا ہوا آ جائے گا، نہ آنا ہوگا تو نہیں اور فریٹ کر لیں گے۔“

”وہ بے حد مطمئن سا اس کی بات کا جواب دے کر پھر سے اپنی کتاب کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس کے آنے سے پہلے پڑھ رہا تھا۔

”تم بھی عجیب ہو عالی! میں تمہاری جگہ ہوتا تو جمل کر کتاب ہو جاتا کہ میرا لیٹر کیوں نہیں آیا جب کہ میرٹ تو دونوں کا ہی بنتا ہے۔“

”تم چاہتے ہو شانی کہ میں تم سے تمہاری کامیابیوں سے جلوں؟“ عالیان ہنسا تھا۔

”لیکن بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے شایان کہ کوئی بھائی اپنے بھائی سے جملے اور تم میری جگہ ہوتے تو تم بھی میری کامیابی سے ایسے ہی خوش ہوتے جیسے میں۔ ایک کریز سے نہیں آگے رہنے کا درد نا اگر اس کے برعکس بھی ہوتا تو تم خوش ہوتے۔“

اس کے لہجے میں اتنا یقین تھا کہ لہجہ بھر کے لیے شایان خاموش ہو گیا تھا، کیا واقعی ایسا ہوتا اور کیا وہ عالیان کی خوشیوں اور کامیابیوں پر ایسا ہی خوش ہوتا جیسے وہ ہوتا ہے۔ وہ عالیان سے بہت محبت کرتا تھا اس کے لیے شاید جان بھی دے سکتا تھا لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ عالیان اس سے جیت

جائے یا وہ چیز جو اسے بھی پسند ہو عالیان لے لے۔ یہ وہ جگہ تھا جسے صرف وہ جانتا تھا۔

وہ عالیان کے کمرے سے نکلا تو زمین کی طرف چلا آیا اور جب سے وہ لوگ اپنے گھر منتقل ہوئے تھے وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر دو تین دفعہ ان کے گھر کی نہ کی بھانے سے اکیلا ہی چلا گیا تھا۔ مظہر ماموں اور شمیم ممانی بہت محبت سے ملتے اور زمین بھی خوش اخلاقی سے بات کرتی تھی اگر چہ دس پندرہ منٹ کے لیے ہی سب کے ساتھ آ کر بیٹھتی تھی پھر اٹھ کر چلی جاتی تھی۔ آج بھی جب زمین کے گھر آیا تو اس کے پاس بھانہ موجود تھا۔

”ماموں، ماما جی! میرا انٹرویو لیٹر آ گیا ہے۔ آپ میرے لیے دعا کیجیے گا، کل صبح میں چلا جاؤں گا۔ پرسوں میرا انٹرویو ہے۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

”ان شاء اللہ، اللہ تمہیں کامیاب کرے گا۔“

”اللہ چوہدری نے کہا۔“

”اور دعا بھی ضرور کریں گے تمہارے لیے۔“

ممانی نے بھی دعا دی تھی۔ کچھ دیر بعد زمین اپنے کمرے کے ساتھ چائے کے کرائی تو اس نے زمین سے بھی دعا کی درخواست کی اور ساتھ ہی بتایا بھی کہ ”اسی عالی کا انٹرویو لیٹر نہیں آیا“ اس کے لیے بھی دعا مانگے گا۔ زمین کے لبوں پر ایک معنی خیزی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہوگئی۔

سفید لباس میں زمین آج بے انتہا حسین لگ رہی تھی۔ اس کی نظریں بار بار اس کی طرف اٹھتی اور پھر اٹھنا بھول جاتی تھیں۔ زمین کی پیشانی پر ہلکی سی ناکواری کی لکیر نمودار ہوئی تھی اس کو شاید شایان کا ہاتھ دیکھنا برا لگ رہا تھا اس لیے وہ اپنا چائے کا کپ لٹا کر معدوم کر رہی ہوئی چلی گئی تھی۔ اس کا یہ گریز اچھا لگتا تھا۔

”کب تک..... کب تک..... یہ گریز.....“

ان نے دل ہی دل میں کہا اور کچھ دیر پھر ایک بار اس کے لیے کہتا ہوا گھر واپس آ گیا۔

☆☆☆

اس کا انٹرویو بہت اچھا ہوا تھا اور اس نے سوچا تھا وہ واپس جا کر اماں جان سے زمین کے لیے بات کرے گا۔ اس نے ایک دن زمین کو نہیں دیکھا تھا تو اسے لگتا تھا جیسے کہیں کچھ ہو گیا ہو۔ اسے پہلی فرصت میں اماں جان سے بات کرنی چاہیے، کہیں وہ دیر نہ کر دے۔ ماما بھی تو کہہ رہی تھیں نا کہ جیسے ہی زمین کی گریجویشن مکمل ہوگی، ہم پاکستان آگئے گا لڑکیوں کے لیے یہی بہترین عمر ہے شادی کی۔

زمین کی شادی کے بعد شاید مظہر صاحب تو واپس جا سکیں لیکن میرا ارادہ نہیں ہے۔ اپنے ملک اور اپنی زمین کی بات ہی اور ہوتی ہے۔

کیا انہوں نے زمین کی کہیں شادی نہ کر دی ہے، اس کے دل میں یک دم وہم پیدا ہوا تھا۔

لیکن نہیں، ایسی کوئی بات ہوتی تو کوئی تو ذکر کرتا پھر ماما نے بھی تو یوں ہی سرسری سا ذکر کیا تھا جیسے مامیں کرتی ہیں۔

اس نے اپنے دل کو تسلی دی لیکن دل کو دھڑکا سا لگ رہا تھا اور پھر انٹرویو کے بعد وہ عادل کے اصرار کے باوجود نہیں رکا تھا۔ حالانکہ پہلے اس کا ارادہ شام کو واپس کا تھا لیکن اب وہ جلد از جلد جا کر اماں جان سے بات کرنا چاہتا تھا۔

وہ سارے راستے سوچتا رہا، پلان بناتا رہا کہ ایسے بات کروں گا، یوں کہوں گا کہ بس اب میں برسر روزگار ہو گیا ہوں۔ جاب تو ظاہر ہے مل ہی جائے گی تو جلدی سے میرے سر پر سہا ہاندھنے کی تیاری کریں..... نہیں یوں نہیں..... یوں کہوں گا۔ وہ خود ہی جملے سوچتا رہا اور رد کرتا رہا۔ کچھ بھی نہیں صاف صاف کہہ دوں گا۔ اماں جان! مجھے زمین اچھی لگتی ہے اور یہ کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں، بس یہ ٹھیک ہے۔ ہاں ایسے ہی ٹھیک ہے۔

حویلی پہنچتے ہی وہ سیدھا عالیہ خاتون کے کمرے میں گیا تھا، وہ زیورات کا صندوق کھولے بیٹھی ایک ایک زیور نکال کر دیکھ رہی تھیں۔

”ارے آپ آگئے شایان! کیا ہوا انٹرویو۔“

”بہت اچھا۔ ایک دو روز میں اپنا منتقلی لٹرل جائے گا۔“ وہ ان کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔
 ”اور آپ یہ دکان کیوں سجائے بیٹھی ہیں؟“
 اس نے ایک بریلیٹ اٹھا کر دیکھا۔
 ”کیوں بھی، اب تم دونوں کی شادیاں نہیں کرنی ہیں ہم نے۔“ عالیہ خاتون کے لبوں پر بڑی جان دار مسکراہٹ تھی۔ یوں تو تم دونوں کی دہائیوں کے لیے سارا زور دیا ہی ہے گا لیکن میں دیکھ رہی تھی کہ کچھ پرانا زور بھی نکال لوں، زمین کو بھی دکھا لوں گی۔“
 ”زمین!“

اس کا دل جیسے سینے کی چار دیواری توڑ کر باہر آنے کو بے تاب ہوا۔ اب اسے تمہید نہیں باندھنی پڑے گی، اماں جان نے خود ہی بات چھیڑ دی تھی۔
 ”کیا آپ نے ہمارے لیے لڑکیاں دیکھ لیں؟“ اس نے بریلیٹ نیچے رکھا۔
 ”عالیان اور زمین کی بات تو بچپن سے طے ہے۔ میں نے زمین کے پیدا ہوتے ہی اسے عالیان کے لیے مانگ لیا تھا۔ ہاں آپ کے لیے وہ تین لڑکیاں ہیں نظر میں، آپ کے بابا کھڑے تھے کہ آپ آ جاؤ تو آپ کی رائے لے لیں تو دونوں بھائیوں کی انکشی شادی کر دیں۔ مجھے تو عالیہ آپا کی آمنہ بہت پسند ہے۔“

وہ کھڑی رہی تھیں اور شایان کو لگ رہا تھا کہ اس کے سر پر عالیہ خاتون نے کوئی ہم بلاست کر دیا ہو اور اس ہم کی زد میں آ کر اس کا پورا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہا ہو۔

”ان دنوں آمنہ گاؤں آئی ہوئی ہے، اپنی دادی کے پاس۔ آپ ان کو دیکھ لیں، بات چیت کر لیں۔ کئی روز میں آمنہ کو گھر بلا لوں گی، یوں تو وہ کل بھی آئی تھی مجھ سے ملنے پر آپ نہیں تھے۔ بہت پیاری بچی ہے لیکن آپ کے بابا کھڑے رہے تھے کہ آپ کی پسند اور مرضی کے بغیر کسی سے بات نہ کروں۔“

”میری پسند اور مرضی؟“

اس کی سوالیہ نظریں عالیہ خاتون کی طرف اٹھیں، جن میں عجیب سرد مہر سی بے گانگی تھی۔
 ”ہاں ظاہر ہے زندگی آپ نے گزارنی ہے اور آپ کی پسند اور مرضی ضروری ہے۔“
 وہ کچھ زبورات الگ کرنے کے بعد باقی واپس صند فوجی میں رکھ رہی تھیں۔

”تو میری پسند زمین ہے اماں جان! مجھے زمین سے شادی کرنی ہے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہاتھ میں پکڑا جھومر عالیہ خاتون کے ہاتھوں سے گر پڑا تھا، وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے شایان! زمین تو بچپن سے ہی عالیان سے منسوب ہے اور مظہر بھائی اس کی شادی کے لیے ہی آئے ہیں۔“

”آپ نے میری پسند پوچھی تھی، میں نے بتا دی۔ اب یہ آپ جانیں کہ کیسے ہو سکتا ہے لیکن شادی مجھے زمین سے کرنا ہے اور کسی سے نہیں۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ رکائیں تھا اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

”یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا۔“ عالیہ نے سر پکڑ لیا۔
 یہ عالیان کا کوئی کھلونا یا کپڑا پسند کرنے والی بات تو نہ تھی کہ بچپن کی طرح وہ اس کی ضد پر اسے دے دیتیں۔ نہیں یہ ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

”یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے زمین کے علاوہ۔ جو لڑکی بھی آپ کو پسند ہو بھلے وہ غیروں میں سے ہی ہو میں آپ کے بابا کو مانا لوں گی۔“

”لیکن میں زمین سے محبت کرنے لگا ہوں۔ پلیز آپ بابا کو مانا لیں۔۔۔۔۔ ماموں جان سے بات کریں۔ مجھ میں کیا کمی ہے آخر میں عالیان سے کسی بھی لحاظ سے۔۔۔۔۔“

”بات کی کی نہیں ہے شایان۔“ عالیہ خاتون نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”یہ کیسی صورت ممکن نہیں ہے۔ زمین عالیان کی منگ ہے۔ مظہر بھائی بھی

”نہیں مانیں گے۔“

”آپ جانیں تو ممکن ہو سکتا ہے اماں جان۔“
 ”بے وقوفوں کی سی باتیں مت کرو شایان۔“
 عالیہ خاتون از حد پریشان تھیں۔

”یہ بے وقوف والی بات نہیں یہ میری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔“ تب گھبرا کر انہوں نے محسن علی سے بات کی اور چوہدری محسن علی کو پتا چلا تو وہ عالیہ خاتون پر ناراض ہو گئے۔

”ساری غلطی آپ کی ہے عالیہ! بچپن میں جب پہلی بار اس نے عالیان کے کھلونے پر ہاتھ رکھا تھا تو آپ کو سمجھا دینا چاہیے تھا لیکن آپ عالیان کا کھلونا اٹھا کر اسے دے دیتیں لیکن زمین کوئی کھلونا یا چیز نہیں ہے۔ میں آپ کو ہرگز اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ آپ مظہر سے بات نہیں کریں گی اور ان سے بات کر کے نزدیک ترین کی کوئی تاریخ لے لیں شادی کی اور عالیان کے آنے سے پہلے اپنے صاحبزادے کو سمجھائیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا بیٹا سب جان کر ہرٹ ہو۔ آپ ہمیشہ عالیان کی حق تلفی کرتی رہی ہیں لیکن اب نہیں عالیہ! اب میں اپنے بیٹے کی حق تلفی نہیں ہونے دوں گا۔“

”وہ بھی ہمارا بیٹا ہے محسن صاحب!“
 ”ہاں ہے مجھے اس سے کب انکار ہے۔ مجھے بھی وہ انتہائی پیارا ہے جتنا عالیان لیکن میں اس کی ناجائز اور بے جا ضد نہیں مان سکتا۔“

عالیان کو انہوں نے اپنے کسی کام سے جان بوجھ کر سرگودھا بھیج دیا تھا۔ نہیں چاہتے تھے کہ اسے اس سارے معاملے کی خبر ہو اور وہ شایان کے لیے کوئی قربانی دے۔

”دو دن بعد وہ واپس آ رہا ہے اس کے آنے سے پہلے پہلے یہ معاملہ ختم ہو جانا چاہیے، آئندہ اس موضوع پر کوئی بات نہ ہو۔“

چوہدری محسن علی اپنا فیصلہ سن کر چاٹکے تھے وہ ساکت بیٹھی تھیں۔ چند دن پہلے انہوں نے چوہدری محسن علی کو صرف شایان کی خواہش بتائی تھی لیکن آج

انہوں نے اسی کی تھی کہ وہ مظہر سے اور عالیان سے بات کریں۔ کیا خبر انہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔ عالیان اور شایان آخر دونوں ہمارے بیٹے ہیں اور چوہدری محسن علی بھڑک اٹھے تھے۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ بھی نہیں مانیں گے۔ لیکن وہ ولی کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھیں ورنہ جانتی تھیں کہ یہ کتنی نامناسب بات ہے لیکن کیا کریں۔ کتنے دن ہو گئے تھے وہ ان سے ناراض تھا۔ بات نہیں کر رہا تھا، کھانا پینا بھی تقریباً چھوڑ رکھا تھا۔ وہ اسے منامنا کر، سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھیں تو مجبوراً بات کر بیٹھی تھیں اور اب ناممکن اور شرمندہ سی بیٹھی تھیں کہ وہ آیا۔

”آپ نے بابا سے بات کی؟“
 ”وہ نہیں مانتے۔“ عالیہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”اس لیے ناکہ میں ان کا سگایا نہیں ہوں۔ عالیان اگر میری جگہ ہوتا تو وہ اس کی بات مان لیتے۔“

”عالیان ہرگز ایسا بے ہودہ مطالبہ نہ کرتا جو تم کر رہے ہو، وہ بھی اپنے بھائی کی ہونے والی بیوی پر بری نظر نہ ڈالتا۔“

پتا نہیں آج کیسے عالیہ خاتون نے پہلی بار اس سے اس طرح اس لمحے میں بات کی تھی۔ شاید یہ محسن علی سے ہونے والی گفتگو کا اثر تھا یا انہیں احساس ہو رہا تھا کہ واقعی شایان کے اس بگاڑ کی وہ قصور وار ہیں۔

”مجھے اس کا علم نہ تھا جب مجھے اس سے محبت ہوئی۔“

”بس کرو یہ محبت محبت۔۔۔۔۔“ وہ غصے سے بولیں۔

”ذرا جانیں رہی آپ میں۔“
 ”آج ثابت ہو گیا ہے کہ آپ عالیان کی ماں ہیں۔“ وہ طنز سے مسکرایا۔ ”صرف عالیان کی۔۔۔۔۔ بے شک آپ نے مجھے دودھ پلایا، پالا پوسا لیکن ماں صرف آپ عالیان کی ہیں۔“ وہ غصے سے دروازے

کوٹھو کر مارتا ہوا باہر نکلا تھا، اندر آتے عالیاں سے گرا گیا۔

”کیا ہوا شانی؟“ عالیاں نے اس کا ہاتھ پکڑا لیکن وہ ہاتھ جھٹکتا ہوا چلا گیا۔ حیرت زدہ سا عالیاں کمرے میں آیا جہاں عالیہ خاتون زار و قطار رو رہی تھیں۔

”کیا ہوا اماں جان! اور یہ شانی اتنے غصے میں کیوں تھا؟“

”آپ کو تو آج نہیں آتا تھا عالیاں! دو دن بعد آنے کا تیار ہے تھے آپ کے بابا۔“ عالیہ خاتون اسے دیکھ کر گھبرا گئیں۔

”نہیں کام ہو گیا تھا تو میں آ گیا۔“

عالیاں نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے اپنا بازو ان کے گرد حائل کرتے ہوئے انہیں اپنے ساتھ لگایا۔

”ہاں اب بتائیں کیا ہوا؟ آپ اس طرح کیوں رو رہی تھیں؟ ضرور شایان نے آپ سے کہا ہو گا کہ اسے جاب نہ ملی تو وہ امریکا چلا جائے گا۔ لیکن آپ پریشان نہ ہوں وہ نہیں جائے گا۔“ انہوں نے فٹی میں سر ہلایا اور اپنے آنسو پونچھنے لگیں۔

”پلیز اماں جان! اگر آپ کے دل میں ایسا کوئی وہم ہے تو نکال دیں۔“

اور ان کے آنسو پھر سے بہنے لگے اور پھر چوہدری محسن علی کے منع کرنے کے باوجود وہ عالیاں کو سب کچھ بتاتی چلی گئیں۔ عالیاں کی گرفت ان کے گرد و حیل ہو گئی تھی اس کے ہونٹ بھیجنے ہوئے تھے۔ انہوں نے پراسید نظروں سے اسے دیکھا۔

شاید ہمیشہ کی طرح وہ کہہ دے۔

”ٹھیک ہے اماں جان! آپ زمین اور شایان کی شادی کر دیں۔“ لیکن وہ ہٹا کچھ کہے سخت چہرے کے ساتھ کمرے سے نکل گیا تھا۔ اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا اور کہتا بھی کیسے، کیا وہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ زمین کو کتنا چاہتا ہے اور ان کے پاکستان آنے سے کتنا خوش ہے اور زمین بھی تو..... دونوں کے

جذبات سے بے خبر تو نہیں تھیں پھر بھی پتا نہیں کیوں وہ چاہتی تھیں کہ عالیاں ہی اس کے حق میں دست بردار ہو جائے۔

وہ بڑا ہے، سمجھ دار ہے جبکہ شایان جذباتی ہے۔ جلد باز ہے، تھردلا ہے۔ لیکن عالیاں اتنی بڑی قربانی دینے کے لیے خود کو تیار نہیں کر پارہا تھا۔ صرف اس کی اپنی ذات کی بات ہوئی تو وہ اماں جان کے آنسوؤں اور عالیاں کی ضد کی خاطر قربانی بھی دے دیتا۔ لیکن بات زمین کی بھی تو تھی اور زمین کسی نہ جانتی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا اور جو بات وہ نہیں جانتا تھا وہ شایان کی ہر جائز اور ناجائز طریقے سے جیت لینے کی خواہش کی شدت تھی اور وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اس کے لیے وہ جان کی بازی لگا دے گا اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

وہ عالیاں سے کبھی نہیں ہارا تھا۔ سو اس نے نیند کی گولیاں کھالی تھیں۔ گو صالحہ نے اس کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے حلق سے نکلنے والی خرخراہٹ کی آواز سن کر شور مچا دیا اور یوں بروقت اسے ہاسپٹل پہنچا دیا گیا تھا اور فوری طور پر معہہ دواش کروایا گیا تھا۔ تاہم ڈاکٹر نے چوبیس گھنٹے خطرہ بتایا تھا کہ اس نے بہت زیادہ گولیاں کھالی تھیں۔ اگر صالحہ اپنے کوارٹر کی طرف جاتے ہوئے آواز نہ نہتی تو.....

کافی دنوں بعد اس نے رات سب کے ساتھ کھانا کھایا تھا نارمل انداز میں باتیں کی تھیں اور کچھ دیر بی وی لاؤنڈ میں بیٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور اتنے دنوں بعد عالیہ خاتون اطمینان کی نیند سو گئیں کہ شور سے آنکھ کھل گئی۔ چوہدری محسن علی نے اپنے تعلقات سے کام لے کر پو پو کیس کیس نہیں بننے دیا تھا۔

آئی سی یو کے باہر بیٹھے عالیاں کو یاد آیا تھا کہ جب اسے گولی لگی تھی تو وہ اپنا گروہ دینے کو تیار ہو گیا تھا وہ کہتا تھا کہ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں بھی اپنی زندگی ختم کر لوں گا تو کیا وہ اپنے اس بھائی کی خاطر

اپنی محبت سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ یہ مشکل تھا بہت مشکل شاید جان دے دینے سے بھی زیادہ مشکل۔ لیکن اسے ایسا ہی کرنا تھا اور اس نے کیا۔

عالیہ خاتون نے مظہر چوہدری کے سامنے جھولی پھیلا دی۔

”وہ میرا بیٹا ہے، اسے کچھ ہو گیا تو میں بھی جی نہیں پاؤں گی مظہر۔“ عالیاں نہ سہی شایان سہی۔ اسے علم نہیں تھا کہ عالیاں اور زمین کی نسبت طے ہے۔

”آپ کی بات صحیح ہے آپا! لیکن یہ فیصلہ میں نے نہیں کرنا۔ زمین نے کرنا ہے کہ اسے عالیاں کے بجائے شایان کا ساتھ قبول ہے یا نہیں۔ میں نے بہت پہلے زمین کے کان میں ڈال دیا تھا کہ وہ عالیاں کی امانت ہے اور اسے اس امانت کی حفاظت کرنا ہے۔ پچھلے آپ نے بچوں کو کچھ نہیں بتایا تھا اس شے کے متعلق لیکن میں جس آزاد ملک میں رہ رہا تھا وہاں میں نے ضروری سمجھا تھا کہ زمین کو اس بات کی خبر ہو گئی ہوگی یقین ہے کہ گیارہ سال کی عمر سے اب تک عالیاں کو اس روپ میں دیکھنے کے بعد زمین بھی شایان کو یہ مقام دینے کے لیے تیار نہیں ہوگی پھر بھی آپ کی خاطر میں زمین سے بات کروں گا۔“

اور زمین نے انکار کر دیا تھا اور عالیاں جانتا تھا کہ وہ انکار کر دے گی اور اسے انکار ہی کرنا تھا۔ بارہ سال پہلے جب وہ آئی تھی جب بھی وہ اپنے اور عالیاں کے رشتے سے آگاہ بھی اور شایان سے چڑتی تھی۔ ”تم اسے اتنا بھرمت کیا کرو عالی۔ وہ بچہ تو نہیں ہے اب“ اور عالیاں کو یہ مرحلہ خود ہی سر کرنا تھا اور زمین سے خود ہی بات کرتا تھی۔ سو اس نے خود ہی زمین سے بات کی تھی اس نے زمین کو کیسے منایا تھا اطمینان کی قسم دے کر اپنی زندگی کی..... وہ خود ہی جانتا تھا۔ زمین مان گئی تھی اور شایان کے ہاسپٹل آنے کے ایک ہفتے بعد ایک مختصر تقریب میں انہماں کے نام کی انجمنی زمین کو پیدائش گئی لیکن

رخصتی ایک سال بعد رکھی گئی کہ زمین فی الحال دینی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھی۔

کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ سب جانتے تھے کہ زمین کے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان نہ تھا سوائے شایان کے جو کسی قانع کی شان سے آنکھوں میں جیت کی چمک لیے سوچتا بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ اسے نظر اویا جاتا۔ جب عالیاں اور شایان میں سے کسی ایک کے انتخاب کا حق زمین کو دیا جاتا تو اسے شایان کو ہی چننا تھا اور اس نے شایان کو ہی چنا تھا۔ وہ فخر سے آئینے میں اپنے کسرتی جسم کو اپنے سیاہ گھٹنگہ پائے بالوں کو اپنی بے حد دلکش گھور سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر فخر سے مسکراتا تھا۔

☆☆☆

جب سے مقفی کا فنکشن ہوا تھا اس نے زمین کو نہیں دیکھا تھا۔ نہ تو وہ حویلی آئی تھی نہ ہی وہ ان کے بیگے میں گیا تھا کہ اماں جان نے جتنی سے منع کیا تھا کہ اسے اب مظہر بھائی کے گھر یوں ہی نہ اٹھائے نہیں جانا چاہیے تھا۔ مظہر بھائی اسے اچھا نہیں سمجھیں گے۔

”لیکن کیوں اماں جان۔“ اس نے احتجاج کیا وہ زمین سے ملنا چاہتا تھا اس کے احساسات جانتا چاہتا تھا اور اپنے جذبات سے اس کو آگاہ کرنا چاہتے تھا۔

”بھی تو بات مان لیا کرو شایان!“ ان کے لہجے کی بے بسی نے جس میں نمی کھل سی تھی اسے مزید کچھ نہ کہنے دیا۔

”اوکے اماں جان۔“

انہوں نے اپنے گئے بیٹے کی خواہش پر اس کی خواہش کو ترجیح دی تھی تو اسے بھی ان کی بات ماننی چاہیے تھی۔ اس نے اپنی خوشی میں کسی بات پر غور نہیں کیا تھا نہ عالیہ خاتون کی ہر وقت غم رہنے والی آنکھوں پر نہ محسن چوہدری کی سنجیدگی پر اور نہ ہی عالیاں کی گوشہ نشینی پر۔ وہ بہت کم اپنے کمرے سے باہر نکلتا تھا بہت کم اس سے ہم کلام ہوتا تھا۔ وہ تو اپنی

ہی فتح میں سرشار زمین سے ملنے اور بات کرنے کا موقع ڈھونڈتا رہتا۔ گھر کے نمبر پر وہ فون کرنا نہیں چاہتا تھا اور زمین کے بل کا نمبر اس کے پاس نہیں تھا۔ اور وہ کسی سے لینا نہیں چاہتا۔

بس ایک بار..... ایک بار وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ یقیناً وہ بھی بہت خوش ہوگی۔ اسے خوشی بھی تھی۔ یقین جیسی خوشی بھی اور پھر ایک روز اسے موقع مل گیا۔ حسن علی اسلام آباد میں تھے اور عالیہ خاتون کسی سے ملنے کی ہوئی تھیں۔ عالیان کو بھی کچھ دیر پہلے اس نے گھر سے باہر جاتے دیکھا تھا اور اس کے دل نے دعا کی کہ کاش اس وقت زمین آجائے وہ کوئی قیولت کا لمحہ تھا کہ اس نے زمین کو عالیہ خاتون کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔

”زمین۔“ وہ تیزی سے اپنے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آیا تھا۔ ”اماں جان تو شاید زمین خالہ کے گھر گئی ہیں ساتھ والے گاؤں میں۔“

زمین نے وہاں سے ہی قدم موڑ لیے۔

”زمین پلیز ایک منٹ رکو۔ میری بات سنو لو۔“

وہ رک گئی تھی لیکن اس نے لگا ہیں اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

”تم خوش ہونا زمین اس سنے تعلق، سنے رشتے سے۔“ اس کی مشتاق نظروں نے اس کے وجود کو اپنے حصار میں لیا تھا۔ ”میں بہت خوش ہوں زمین۔ بہت خوش کہ میں نے تمہیں پایا۔ میں تم سے بے حد بے حساب محبت کرتا ہوں۔ مجھے تمہارے بغیر زندگی بالکل بے معنی اور بے کار لگتی تھی۔“

وہ اس کے جواب کا انتظار کے بغیر بول رہا تھا۔ آج کتنے دنوں بعد اسے موقع ملا تھا کہ وہ اپنے دل کی بات اس سے کر سکا اسے بتا سکا کہ وہ پہلی نظر میں ہی اس کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ جب بارہ سال بعد اچانک اس نے اسے بچی سے ایک خوب صورت و شیرہ کے روپ میں دیکھا تھا۔

زمین نے بہت جمل سے اس کی بات سنی تھی اور پھر نگاہیں اٹھائی تھیں۔

”لیکن میں خوش نہیں ہوں۔“ اس نے بے حد نفرت سے اسے دیکھا۔

”آپ ایک خود غرض، خود پسند اور مطلق شخص ہو، ایسے شخص کی رفاقت کسی کو اذیت تو دے سکتی ہے خوشی نہیں۔“

”زمین کیا کہہ رہی ہو۔“ شایان نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”وہ جو آج تک آپ سے کسی نے نہیں کہا اور وہ جو جج ہے۔ آپ کو ہمیشہ ہی عالیان سے جیتنے کا شوق رہا اور آپ جیتتے رہے اس لیے کہ عالیان چاہتا تھا کہ آپ ہمیشہ فاتح رہو اسے آپ کی آنکھوں کی اس چمک سے اس خوشی سے محبت تھی جو عالیان کو ہر اکرا آپ کو ہوتی تھی۔ بچپن سے ہی اس کی پسندیدہ چیزیں آپ لیتے رہے ہیں کہ وہ آپ کو بھی پسند تھیں اور عالیان کے لیے بھائی کی خوشی ماوی چیزوں سے زیادہ تھی۔“

لیکن میں چیز نہیں تھی کہ آپ کی ضد پر وہ آپ کو روے دیتے تو آپ نے اپنی موت کا ڈراما چاکر نہیں بے بس کر دیا۔ اور عالیان نے اپنی موت کا منظر دکھا کر مجھے مجبور کر دیا کہ میں یہ انگوٹھی پہن لوں۔“

اس نے دایاں ہاتھ آگے کیا جس میں ڈائمنڈ کی وہ خوب صورت رنگ جگمگاتی تھی جسے وہ انتہائی شوق سے خود پٹیلہ چیلرز سے لے کر آیا تھا کہ وہ مفتکی کا نشکھن کرنا اور زمین کے ہاتھ میں خود انگوٹھی پہنانا چاہتا تھا۔

”اور یہ تمہاری آخری فتح تھی شایان علی! وہ ایک دم آپ سے تم پر آگئی تھی۔“

”جو تم نے میرے ہاتھ میں یہ انگوٹھی پہنا کر حاصل کی لیکن اس کے بعد تم ہمیشہ ہارو گے اپنی زندگی کے آخری سانس تک کیونکہ میرا دل اور روں صرف اور صرف عالیان کی ہے تم مر کر بھی میرا دل

نہیں جیت سکتے۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں شایان علی۔ شدید نفرت۔ تم مجھے حاصل کر کے بھی حاصل نہیں کر سکو گے۔“

وہ بول نہیں رہی تھی پھٹکار رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں جو شایان کے تئیں اور دل پر آبلے ڈال رہی تھیں۔

”عالیان مجھے اپنی محبت کا واسطہ دے کر اور اپنی موت سے ڈرا کر مجھے تمہارے نام تو منسوب کر دیا ہے لیکن مجھے تم سے محبت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔“ وہ طنزی تھی۔

”سو اپنی اس آخری فتح پر جو مجھے اپنے نام سے منسوب کر کے حاصل کر چکے ہو خوب جی بھر کے ان مناد کیونکہ پھر عمر بھر تم نے اپنی بار بر روتا ہے۔“

اپنی بات مکمل کر کے وہ رک گئی تھی وہ ساکت لڑائی سے ڈکھ رہا تھا۔ برآمدے سے سن اور صحن سے اگلے گیٹ کی طرف جاتے تھے لیکن وہ بانو پتھر کا ہاتھ تھا۔ اس کا رنگ یوں پیلا ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ وہ نہ جانے کب تک ایسی تھرا رہتا اگر حال ہی اپنے کوارٹر سے نکل کر صحن میں اور پھر صحن سے برآمدے میں آکر اسے مخاطب نہ کرتی۔

”آپ کو کہیں جانا ہے۔ میں ذرا چھوٹی کو اپنے چلی گئی تھی اسے بخار ہے نا۔ کچھ چاہیے یا جس۔“

اس نے چونک کر صالو کی طرف دیکھا۔ خالی خالی نظریں جن میں اس سے زندگی مفقود تھی اور وہ اس سے بلا تا وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آیا تھا۔

”نہیں..... نہیں..... یہ کیا کہا تھا زمین نے وہ جہان زمین تھی۔ ہاں زمین ہی تھی۔“

”یہ تمہاری آخری فتح تھی شایان علی یاد رکھنا اگلی۔“ اس کی باتیں تھوڑے کی طرح اس کے سامنے بے ضرر نہیں لگ رہی تھیں۔

یہ عالی تھا جو ساری زندگی تمہاری چھوٹی میں کی بیک ڈال رہا اور یہ آخری بیک تھی آخری

فتح۔“

اسے لگا جیسے کمرے کے ہر کونے سے زمین کی ہنسی کی آواز آرہی ہے۔ طنز۔ ہنسی جیسے کمرے کی دیواریں، بیڈ فرنیچر سب اس پر برس رہے ہوں۔

”نہیں۔“ اس کے حلق سے تھکی تھکی سی آواز نکلی تھی۔ اسے لگا جیسے میز پر رکھے کرشل کے خوب سورت گل دان نے قہقہہ لگایا ہو۔

سنو شایان علی..... یہ آخری فتح تھی۔

اس نے گل دان اٹھا کر دیوار پر مارا..... ایک چھناکے سے کر چیاں بھر گئیں..... پھر نیل یس، گلاس، جگ کتابیں جیتی ڈیکوریشن جو جو کچھ اس کے ہاتھ میں آتا رہا وہ پھینکنا رہا۔ اس کے اندر جیسے طوفان برپا تھا آگ لگی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ جیسے تھک کر شکست خوردہ سا بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ارگردوٹی ہوئی چیزیں پھری پڑی تھیں اس کے اندر بھی ایسی ہی ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور اپنی ضروری چیزیں کاغذات، اسے لی ایم کارڈ، چیک ایک اور چند جوڑے کپڑے، ایک بیک میں ڈال کر گھر سے نکل پڑا۔ اسے کہاں جانا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا لیکن اس وقت وہ بغیر سوچے سمجھے گھر سے نکل پڑا تھا۔ اسے یہاں نہیں رہنا تھا اب اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

اس جوتی میں جس کی ایک ایک اینٹ اس پر ہنس رہی تھیں اس کا تسخیر اڑا رہی تھی۔ اور اگر جو وہ جلد بازی نہ کرتا اور نیند کی گولیاں نہ کھاتا تو..... اس نے غلط طریقہ اختیار کیا تھا اسے وہی طریقہ اختیار کرنا تھا جو اس نے علیرہ کے لیے اختیار کیا تھا۔ پتھر دیکھتا میں کہ کیسے زمین مظہر خود کو میرے بحر سے بچا سکتی۔ پھر عالیان علی کو مجھ پر احسان نہ کرنا پڑتا۔ اسے ابھی بھی خود پر مان تھا اور ابھی بھی اسے اپنی کوئی غلطی نظر نہیں آرہی تھی۔

اس کے پاس گاڑی نہیں تھی وہ پیدل بسوں کے اڈے کی طرف جا رہا تھا جب سر پاک کے پاس

سے گزرتے ہوئے اس نے عالیاں کو دیکھا تھا۔ منڈ پر پر بیٹھا گھٹنوں کے گرد بازو جامل کئے ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھے کیا سوچ رہا تھا۔ اس کی براؤن آنکھوں میں اداسی کا سنہرا سا غبار پھیلا ہوا تھا۔ وہ جب اس کے قریب آ کر لہو بھر کے لیے رکھا تھا تو اسے گمان گزرا تھا کہ اس کی آنکھوں کی سطح کیلی ٹھکی اور آنسو ستاروں کی طرح ان میں چمکتے تھے۔ ان کیلی آنکھوں میں اسے دیکھ کر حیرت سی اتری تھی۔

”شانی تم کہاں جا رہے ہو۔“

اور وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر بیک گھسٹا آگے بڑھنے لگا تھا۔ ”شانی“ وہ بے چین ہو کر منڈ پر سے اتر تھا اور اس کے بازو کو پکڑا تھا لیکن اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

”کیا ہوا ہے اتنے ناراض کیوں ہو اور یہ بیک۔“ اور پھر پتا نہیں غصے میں اس نے کیا کیا کہا تھا۔

کچھ کہنے کی کوشش کرتے عالیاں کو وہاں ہی چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔

اور پھر بہت سارے دن وہ ایک ہوٹل میں رہا تھا۔ یوں تو وہ عادل کے پاس کی اور دوست کے پاس بھی جا سکتا تھا لیکن وہ نہیں جانا چاہتا تھا۔ کسی ایسی جگہ پر جہاں عالیاں ڈھونڈتا ہوا آجائے اور عالیاں اسے ضرور ڈھونڈتا ہوا آتا۔ شاید عالیہ خاتون اور حسن چوہدری بھی ساتھ ہوں۔ اسے یقین تھا اور اس کا یہ یقین غلط تو نہیں تھا۔ عالیاں مہینوں اسے ڈھونڈتا پھرا تھا۔ ہر کلاس فیلو ہر دوست سے اس کا پتا کیا تھا لیکن اس کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔

☆☆☆

وہ چند روز دن اس ہوٹل رہا میں اور وہاں ہی اس کی ملاقات حماد سے ہوئی تھی۔ حماد کالج میں ان کا کلاس فیلو تھا اور کالج کے بعد وہ لاہور چلا گیا تھا۔ وہ راولپنڈی کی کسی ایجنٹ سے ملنے آیا تھا اور اسی ہوٹل میں ان کی ملاقات طے تھی اس نے بتایا تھا کہ وہ اس ایجنٹ کے ذریعے امریکا جانے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ امریکا پہنچانے کے اٹھارہ لاکھ لے گا تو پہلے نو بعد میں اور اس نے حماد سے کہا تھا کہ وہ اس کے لیے بھی ایجنٹ سے بات کرے۔ پیسے کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ چوہدری حسن علی اس کے حصے کی ساری رقم اس کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیتے تھے۔ یوں وہ حماد کے ساتھ ہی لاہور آ گیا تھا۔ لاہور میں بھی وہ ہوٹل میں ہی ٹھہرا تھا اور پھر ٹھیک چار ماہ دس بعد وہ امریکا پہنچ گیا تھا وہ امریکا کیسے پہنچے یہ بھی ایک الگ کہانی تھی تاہم وہ جب غیر قانونی طور پر سرحد عبور کر کے امریکہ میں پہنچے تو وہاں حماد کے ماموں انہیں لینے آئے ہوئے تھے۔ آگے کے سب معاملات انہوں نے ہی سنبھالے تھے۔

انہوں نے انہیں جاب بھی دلوا دی تھی گو شروع میں انہیں چھپ کر ایک دو خانے میں کام کرنا پڑتا تھا پھر ہولے ہولے وہ سیٹ ہوتا گیا۔ اسے سب یاد آتے تھے اماں جان بابا عالیاں، اپنا گاؤں خوبلی سب راتوں کو وہ بے قرار ہو کر جاگتا رہتا شروع شروع میں تو زمین کی باتیں یاد آتیں تو اس کا دماغ کھولنے لگتا تھا۔ اعصاب یوں تن جاتے جیسے ذرا سے کھچاؤ سے ٹوٹ جائیں گے۔ لیکن پھر ہولے ہولے وہ زمین کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ شاید نہیں یقیناً وہ کبھی ہی وہ غلط تھا۔ خود غرض اور خود پسند تھا۔ جوں جوں وہ اپنا احتساب کرتا اسے اپنا آپ مجرم لگنے لگتا تھا۔ وہ بچپن سے ہی عالیاں کے ساتھ زیادتی کرتا آرہا تھا۔ اس نے علیزہ کو عالیاں سے دور کرنے کی پوری کوشش کی تھی اور کامیاب ٹھہرا تھا پھر اب زمین۔

اور زمین نے کیا کہا تھا کہ عالیاں جان بوجھ کر کسی ایک پیپر میں ایک آدھ سوال چھوڑا تھا تاکہ وہ.....

اور اس نے کیا کیا تھا اس کی محبت اس کی سنگت چھیننا چاہی تھی۔ زمین نے کہا تھا تم احسان فراموش ہو۔

ہاں میں احسان فراموش ہو۔ وہ اعتراف

کرتا۔ اسے عالیہ خاتون کی محبتیں، چوہدری حسن علی کی شفقتیں اور عالیاں کا پیار یاد آتا تھا۔ وہ کیسے اس کا ہال رکھتا تھا اپنی محبت سے دست بردار ہو جانا کتنا مشکل ہوتا ہے بلکہ ناممکن اور عالیاں نے یہ ناممکن کام کیا تھا۔ وہ اس سے معافی مانگتا چاہتا تھا بلکہ سب سے لیکن پھر بھی وہ واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ عالیاں، زمین، اماں جان کی کا بھی سامنا نہیں کر سکتا تھا۔ یوں اس نے چار سال گزار دیے تھے۔

ایک سال قبل اس نے ایک مختلف نام سے مالیاں علی کو اپنے فیس بک اکاؤنٹ میں ایڈ کیا تھا۔ عالیاں نے اسے اور اس کے بچپن کی تصویر لگا رکھی تھی وہ اس ایک ساتھ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کھڑے تھے۔

وہ کتنی ہی دیر تک اس تصویر کو دیکھتا رہا تھا اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہتے رہے تھے۔ پھر وہ بھی کھار ہاں اسٹھ کے نام سے عالیاں سے پیٹنگ کرنے لگا۔ مالیاں عالیاں سے چیٹ کرتے ہوئے وہ مانی بے آب کی طرح ٹوٹتا۔ اس نے بھی اپنی تصویر نہیں لگائی تھی۔ اس مختلف مناظر، پھول سجے، وہ بہت کم آن لائن ہوتا تھا کہ جدائی کی اذیت بڑھ جاتی تھی۔

☆☆☆

دو سال پہلے نیویارک سے واشنگٹن آتے ہوئے فاطمہ حسن سے اس کی ہوائی جہاز میں ملاقات ہوئی تھی اور پھر اتفاق یہ ہوا کہ وہ اس کی بلڈنگ کے ایک ایئرمنٹ میں رہتی تھی۔ اس کے والدین نیویارک میں تھے اور وہ یہاں جاب کرتی تھی۔ اور اس نے ہی اسے اس ایب میں جاب دلوا دی تھی۔

ہاں وہ جاب کرتی تھی۔ جاب پہلی جاب سے بہتر تھی اور اس کی تعلیم کے مطابق تھی۔ اور پھر پتا نہیں کب کیسے فاطمہ حسین اور اس کے درمیان دوستی رشتہ گہرا اور مضبوط ہوتا گیا۔ اور فاطمہ حسن اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ لیکن وہ بھی اپنے دل کو ٹوٹتا تو فاطمہ حسن کے لیے ایسا کرنا چاہتا۔ فاطمہ حسن اس کے ساتھ ہوتی تو

اسے علیزہ احمد یاد آتی۔ کتنا ہرٹ کیا تھا اس نے اسے۔ وہ فاطمہ حسن کو ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اپنے دل سے زمین کی محبت کو نہیں نکال سکتا تھا۔ بے شک اس نے علیزہ احمد کے ساتھ محبت کا ڈرامہ کیا تھا لیکن زمین کے ساتھ اس کی محبت ڈرامہ نہیں تھی۔ زمین کا تصور آتے ہی دل میں آج بھی کک جاگ اٹھی تھی اور وہ بے اختیار زمین اور عالیاں کی خوش گوار زندگی کی دعا کرنے لگتا تھا۔ اور فاطمہ حسن کی اپنی طرف اٹھتی ہنسی آنکھوں سے نظریں چرا لیتا۔

اسی روز وہ کئی مہینوں بعد آن لائن ہوا تھا اور اس نے فیس بک کھولی اور اس کا دل ڈوب گیا۔ عالیاں نے پوسٹ لگا رکھی تھی۔

”میری مدد شدید بیمار ہیں پلیز آپ سب ان کے لیے دعا کریں۔“

”اماں جان!“ اس کے لبوں سے سسکی نکلی۔ وہ عالیاں سے بات کرنا چاہتا تھا پوچھنا چاہتا تھا کہ اب وہ کئی ہیں لیکن وہ آف لائن تھا وہ بے چین تھا مضطرب تھا۔ وہ ذرا سا بیمار پڑتا تو کیسے عالیہ خاتون ساری ساری رات اس کے سر ہانے بیٹھی رہتی تھیں۔ اور کیسے وہ نخرے کرتا اور اپنے لاڈ اٹھواتا تھا۔

بے چین ہو کر اس نے اپنے گھر کا نمبر ملا ہوا تھا۔ ایک بار نہیں کتنی ہی بار اور ہر بار یہ سن کر کہ یہ میری کسی کے استعمال میں نہیں اس کا جی جا ہادہ فون کو دیو اور مار کر توڑ دے۔ بابا اور عالیاں کا سلی نمبر بھی اسے یاد نہیں تھا۔ اس کا پرانا فون امریکا آتے ہوئے گر گیا تھا۔ فاطمہ حسن جب ملاؤ بنا کر اسے دیتے آئی تو وہ رو رہا تھا۔ وہ جب بھی کوئی چیز پکاتی اس کے لیے ضرور لے کر آتی۔

”کیا ہوا شایان! کیوں رور ہے ہو۔“

”میری اماں جان بیمار ہیں۔“

اور پہلی بار اس نے فاطمہ حسن کو مختصر بتایا کہ چار سال پہلے وہ معمولی سی بات پر گھر سے ناراض ہو کر آ گیا تھا۔

”الحق بھلا ماں ماب سے بھی اکوڑا ناراض ہو جاتا۔“

ہے۔ ”اسی نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھے تھے تسلی دی۔ امید دلائی اور دعا مانگتے کو کہا تھا۔ اور پھر بغیر اس سے پوچھے وہاں ہی بیٹھے بیٹھے اس کے لیے آن لائن پاکستان کے لیے سیٹ بک کروائی تھی۔ وہ اسے منع ہی کرتا رہ گیا تھا۔

”نہیں فاطمہ! میں وہاں نہیں جاسکتا۔ میں نے ان کا بہت دل دکھایا۔ میں نے ان سے زیادتی کی میں خود غرض اور خود پسند تھا۔“

”تو؟“ فاطمہ کی دلکش آنکھیں سوالیہ انداز میں اس کی طرف اٹھیں اور اسے پہلی بار لگا کہ اس کی آنکھیں بے حد خوب صورت ہیں اور ان میں وہ بے پناہ مقناطییت ہے جو اسے زمین کی آنکھوں میں محسوس ہوتی تھی۔

بے وقوف لڑکے ماں باپ کے ظرف اور دل بہت بڑے ہوتے ہیں اور انہیں یاد بھی نہیں رہا ہوگا کہ تم نے بھی ان کے ساتھ زیادتی کی ہوگی ان کا دل دکھایا ہوگا۔ وہ تو تمہارے لیے تڑپتے ہوں گے۔ بالکل میرے والدین کی طرح جو میرے بھائی کی ہر زیادتی کو بھلا کر اس کی جدائی میں تڑپتے ہیں۔ اس سے ملنے کی اور اس کی خوشیوں کے لیے دعا کریں کرتے ہیں۔ بس اب پاکستان جانے کی تیاری کرو۔“

ٹھیک چار دن بعد وہ فاطمہ کے ساتھ ایئر پورٹ پر کھڑا تھا۔ عالیان کی نئی پوسٹ سے اسے پتا چل گیا تھا کہ اماں جان ہاسپٹل سے گھر آگئی ہیں اور پہلے سے بہت بہتر ہیں۔ فاطمہ کے ساتھ ہی اس نے سب کے لیے شاپنگ کی تھی۔ لیکن ایک دوسرا ایک خوف سا تھا کیا پتا وہ مجھ سے ملنا پسند نہ کریں۔ کیا جبرہ مجھے حویلی سے نکال دیں مجھ سے بات ہی نہ کریں۔

”ماں بھوتہ۔۔۔۔۔“ فاطمہ حسن نے اس کی بات سن کر اسے ڈانٹ دیا تھا جب وہ پور ڈنگ کے لیے جانے لگا تو اس نے دیکھا فاطمہ کی خوب صورت آنکھوں میں پانی پھیلنا جا رہا تھا۔ ”تم واپس تو آؤ گے نا۔۔۔۔۔ اور اگر نہ آسکو تو

بھی مجھے یاد رکھنا شان۔۔۔۔۔ اور یہ بھی کہ میں تمہیں کبھی بھول نہیں پاؤں گی۔۔۔۔۔ اور یہ کہ میں۔۔۔۔۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ بہت بے حد۔“

آنسو اس کی آنکھوں کے کونوں سے پھیل کر رخساروں پر اتر گئے۔

”تم بہت پیاری ہو فاطمہ بہت اچھی۔ میں واپس آؤں گا۔“

میں ہمیشہ آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گی۔“ اس نے رخ موڑ لیا تھا اور وہ بوجھل قدموں سے آگے بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

درختوں کے اوپر ایک ساتھ کئی پرندوں نے اڑان بھری تو ان کے پردوں کی پھڑ پھڑاہٹ سے چونک کر میں نے سر اٹھایا۔ میرا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور میں نے ماضی سے حال تک کا لمبا سفر طے کیا تھا اور وہ ابھی تک وہاں ہی بیٹھا تھا یوں ہی افسردہ اور اداس سا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا میری نظریں اس پر پڑیں۔ یہ میں تھا شایان علی تھا اور وہ عالیان علی پھر وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ شاید وہ گھر کی طرف جا رہا تھا۔

”عالی۔۔۔۔۔“

میں نے اسے پکارا لیکن میری آواز حلق میں ہی بچس گئی تب میں نے اپنے جسم کی پوری طاقت لگا کر اسے آواز دی۔

”عالی۔۔۔۔۔ عالیان!“

وہ ٹھٹھک کر رک گیا تھا اور ادھر ادھر تلاشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھک کر اپنا چھوٹا سا بیگ اٹھایا۔ میں ایئر پورٹ سے سیدھا ایک ہونٹ میں گیا تھا اور اپنا سامان وہاں رکھ کر وینگ سے گاؤں آیا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد وہ مایوس سا نظر آنے لگا تو کہ میں بیگ اٹھائے درختوں کے جھنڈ سے باہر نکلا۔ ”عالی۔“ میری آواز آنسوؤں سے بوجھل ہو رہی تھی لیکن پھر بھی اس نے میری آواز سن لی اور اب کے مجھ دیکھ بھی لیا تھا۔

”شانی۔۔۔۔۔ شایان“ وہ اندھا دھند میری طرف بھاگا تھا میرے ہاتھ سے بیک گر گیا تھا۔ قریب آتے ہی اس نے مجھے دونوں بازوؤں میں بھر لیا تھا۔

”کہاں چلے گئے تم۔۔۔۔۔ شانی۔۔۔۔۔ ظالم۔۔۔۔۔ کوئی ایسا بھی کرتا ہے۔ گویا چلے گئے تھے ہمیں چھوڑ کر۔“

وہ رو رہا تھا۔ بار بار میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر مجھ دیکھتا اور پھر مجھ سے پٹ جاتا۔

”مجھے لگا تھا میرے کان بج رہے ہیں۔ مجھے تو لگزیوں ہی تمہاری آوازیں آتی تھیں۔“

میرے آنسو بھی میرے رخساروں کو بھگوتے تھے۔ میں کیا کہتا کیوں چلا گیا تھا۔ مجھ سے اپنی بار برداشت نہیں ہوئی تھی بازمین نے مجھے جو آئینہ دکھایا تھا اس میں مجھے اپنی عمر وہ صورت برداشت نہیں آئی تھی۔ سو میں نے صرف اتنا کہا ”سوری عالی!“

میں نے تم سب کو بہت تکلیف پہنچائی مجھے معاف کر دو پلیز۔ میں شرمندگی سے سر جھکائے کھڑا تھا۔

”تم آگے ہوتا سمجھو ساری تکلیفیں ختم ہو گئیں سارے درد ماند پڑ گئے۔“ اس نے جھک کر میرا بیگ اٹھالیا۔

”عالی تم نے مجھے معاف کر دیا نا۔“

’بھائی میں کیسی معافی تلائی۔ اگر تمہیں میری کوئی بات بری لگی تھی تو دو چار سنا لیتے مجھے اور بس معاملہ ختم۔“

”اماں جان اور بابا کیسے ہیں وہ تو مجھ سے بہت ناراض ہوں گے وہ مجھے معاف کر دیں گے نا تم میری سفارش کرو گے نا۔“

”اماں جان کو تمہارے جانے کے بعد انجانا کا الگ ہوا تھا اور ابھی چند دن پہلے مائیز ماہارت ایک ہوا ہے۔ چند دن پہلے ہی ہاسپٹل سے گھر آئی ہیں۔ اب ٹھیک ہیں اور بابا وہ ابھی کچھ کمزور ہو گئے ہیں جاب انہوں نے چھوڑ دی ہے۔ گھر پر ہی ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ابھی نہیں لیکن شانی انہوں نے تمہارا غم دل سے اٹھالیا ہے۔“

میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ سادگی سے

بتا رہا تھا اور میں اندر سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ ”اور تم سے کوئی ناراض شاراخ نہیں ہے سمجھ۔“

”اور تم کیا کر رہے ہو آج کل۔“

”کچھ نہیں۔“ اس نے لا پرواہی سے کندھے اچکائے۔

”کیوں کیا تمہاری انٹرویو کے لیے کال نہیں آئی تھی۔“ میں حیران ہوا۔

”آئی تھی اور میں سلیکٹ بھی ہو گیا تھا لیکن پھر میں نے جاب نہیں کی۔“

”کیوں۔“

میری حیرت میں اضافہ ہوا۔

”یار مجھے تو ہمیشہ تمہارے پیچھے رہنے کی عادت تھی تو تم نہیں تھے اور میں کیوں جاب کرتا۔“

”فضول تم نے چار سال ضائع کر دیے۔“

”فضول کہاں یہاں بابا کے ساتھ زمینوں وغیرہ کو دکھاتا رہا۔“

”لیکن میں تو وہاں جاب کرتا ہوں۔ ادھر امریکا میں۔“

تم امریکا بھاگ گئے تھے۔ اس نے آنکھیں پھاڑیں۔

”اور میں یہاں سارے پاکستان میں تمہیں ڈھونڈتا پھرا۔ خیر! انا تک اترتی میں دونوں ایک بار پھر کوشش کریں گے۔“

وہی لا پرواہ سادا سا انداز جو مجھے بار بار شرمندہ کر رہا تھا۔

”اور شادی تو کر لی ہوگی نا تم نے بچے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔

”شادی کیسے کرتا تم سے پہلے اب پہلے تمہاری شادی ہوگی اور پھر میں بھی کر لوں گا اچھا ہوا تم آگئے۔ زمین کی وجہ سے مظہر مایوس بہت پریشان رہتے ہیں۔ چند ماہ پہلے وہ بھی مستقل طور پر پاکستان آگئے ہیں۔ بس اب فوراً تمہاری اور زمین کی شادی ہو جائے تو ان کی پریشانی ختم ہو۔“ چلتے چلتے مجھے ٹھوکر لگی۔

عقلمند مائوسی چلو

ترتیبہ ریاض

چھٹی قسط

نکلیٹ

”زیادہ چوٹ تو نہیں لگی۔ چا تو ہے تمہیں ادھر زمین اونچی تھی ہے۔ سنبھل کر چلو۔“ وہ تشویش سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”تم نے زمین سے شادی کیوں نہیں کی عالی میں تو چلا گیا تھا۔“

”کیسے کر لیتا کیا بھول گئے تم نے اسے اپنے نام کی انگوٹھی پہنائی تھی۔“ اس نے نظریں چرا لی تھیں لیکن میں نے اس کی آنکھوں میں پھیلنے کرب کو شدت سے محسوس کیا تھا۔

”میں نہیں جانتا تھا زمین نے تم سے کیا کہا تھا لیکن جو کچھ بھی کہ اس کے لیے میں تم سے معافی مانگتا ہوں چا تو ہے تمہیں یہ لڑکیاں اتنی اجنبی ہوتی ہیں۔“ وہ دنگا ہیں جھکائے کبہ رہا تھا۔

”معافی تو مجھے تم سے مانگنی ہے عالیان۔ میں تم دونوں کے درمیان آ گیا تھا۔“

ایم ریلی دیری سوری۔ میری آواز بھرا آگئی تھی۔

”میں اس لیے تو چلا گیا تھا کہ تم زمین سے شادی کر لو اور تم بے وقوف کیا میں تمہیں اتنا ظالم نظر آتا ہوں کہ تم سے تمہاری محبت کی قربانی مانگتا۔“

”لیکن تم بھی تو شافی..... تم بھی تو زمین سے..... اور تم نے خود کشی کی۔“

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

”وہ بخش دے گی..... بس اور کچھ نہیں..... میری پیارو بہنیت۔“ میں نے دل پر میر کا پتھر رکھا۔

”خیر اب جو ہوا سوا ہو۔ مظہر ماموں اور سب چار سال سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

”تو تم ان کا انتظار ختم کر دو کل ہی سہرا باندھ کر چلے جاؤ ماموں کے گھر میں تو شادی کر چکا ہوں۔“ میں زبردستی ہنسا۔

”یعنی“ اس نے میری پیٹھ پر ہکا مارا۔

”ہمیشہ کی طرح تم یہاں بھی بازی لے گئے۔ اور مجھ سے پہلے ہی شادی کر لی۔“

اس کی آنکھوں سے اواسی کا غبار یک دم چھٹ

گیا تھا اور ان کی سنہری چمک بڑھ گئی تھی جسے وہاں ایک ساتھ ہزاروں جگنو جگنو گارہے ہو مجھے اپنے دل سے ایک بوجھ ہٹا ہوا سا محسوس ہوا۔

”کون ہے کیا نام ہے، ساتھ کیوں نہیں لائے۔“

”ساری باتیں ابھی پوچھو گے کچھ تو سنس رہے دو۔“

میں مسکرایا اور میرے اندر کہیں نی سی پھلتی چلی گئی۔ اور میں نے سوچا مجھے پہلی فرصت میں جا کر فاطمہ حسن کو فون کرنا ہے اور اسے بتانا ہے کہ وہ بات جو میں اس سے ایئر پورٹ پر نہیں کہہ سکا تھا۔ اب کہنا چاہتا ہوں کہ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں اور یہ کہ وہ میرا انتظار کرے چند دنوں بعد اسے لینے آ رہا ہوں۔

اور ہاں مجھے اس سے یہ بھی تو پوچھنا ہے کہ اس روز اس نے مجھے دوبارہ حق کیوں کہا تھا اور یہ کہ نکاح سے پہلے اس کے لیے اسے مجھ سے سوری کرنا ہوگا ہاں نہیں تو۔ وہ چلتے چلتے یکدم رک کر مجھے دیکھنے لگا تھا اس کی آنکھوں کی چمک ماضی پرانے لگی تھی۔

”سچ کہہ رہے ہو تا تم نے شادی کر لی ہے یا جھوٹ بول رہے ہو۔“

”جھوٹ کیوں بولوں گا فاطمہ نام ہے تمہاری بھابھی کا اور ہاں شادی بھلے میں نے تم سے پہلے کر لی ہے لیکن ولیمہ دونوں کا اکٹھا ہوگا۔ تاکہ یہ پہلے بعد کا جھگڑا اب ختم ہو جائے۔“

”مجھ کو۔“

اس نے قہقہہ لگایا۔ زندگی سے بھرپور قہقہہ جس میں میرا قہقہہ بھی شامل ہو گیا تھا۔ کیا ہوا جو میں فاطمہ حسن سے محبت نہیں کرتا لیکن محبت کا کیا ہے۔ محبت بھی ہوتی جائے گی ایک روز۔

اور ہم دونوں جوتوں کی نوک سے بچپن کی طرح راستے میں آنے والے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو ٹھوکر مارتے ہنستے مسکراتے قہقہے لگاتے حوصلے کی طرف جارہے تھے۔

دوستو! یہ میری داستان کا سب سے اہم حصہ ہے۔ اس حصے میں آپ ایک بات ضرور سیکھ لیں گے کہ فہم و فراست کسی کی میراث نہیں ہوتی اور عقل و شعور کسی کو ترکہ میں نہیں ملا کرتا اور تباہی کسی کی دولت اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ وہی دانش ور ہوگا اور یہ بھی لازم نہیں ہے کہ روپے پیسے سے ہی انسان کے کردار کو جانچا جائے۔ عام انسان بھی ایسے ہوتے ہیں قیمتی ہوتے ہیں۔ اس لیے انسان کی انسان سمجھ کر بھی عزت کرنا شروع کریں۔

آسان الفاظ میں کہنا میں یہ چاہ رہا ہوں کہ بہت ہی آری تھی نا آپ کو اس انکشاف پر کہ میں ایک کپڑے سینے والا عام سا ٹیلر ماسٹر ہوں۔ اس بار آپ کو پتا چلے گا کہ ایک ٹیلر ماسٹر بھی کسی بھی معاشرے کا اہم ترین رکن ہو سکتا ہے بلکہ ٹیلر ماسٹر ہی نہیں بلکہ دھوبی، موچی، تصانی ناکی۔ سب کے سب اہم ہوتے ہیں۔ اگر آپ سمجھیں تو۔۔۔۔۔

اس لیے اگلی مرتبہ جب کسی بھی ایسے شخص سے ملیں جو کسی ایسے پیشے سے وابستہ ہو تو اس کی دل سے عزت کیجیے گا کیونکہ وہ بھی اس کا حق ہوتا ہے۔ اس کی بھی اولاد ہوتی ہے جس کے لیے ان کا باپ یا دشاہ ہوا کرتا ہے۔

جی جی مجھے پتا ہے آپ بورہور ہے ہیں۔ آئیے جانا ہوں۔ آپ کو آگے کا قصہ۔

☆☆☆

"انتش کہتے ہیں مجھے۔ یہ جتنا ہے مجھ پر۔ انتش کہتے ہیں مجھے۔ وہ جتنا ہے مجھ پر۔۔۔۔۔" مہناز بیگم نے منہ بنا کر اور ناک چڑھا کر بیٹے کی نقل اتاری تھی۔

"ہر وقت کی اس گردان نے دکھایا ہے یہ دن۔ آج ثابت ہو گیا کہ غرور کا سر ہی نیچا نہیں ہوتا۔ میں تو اتنا جانتی ہوں ماسٹر جی کہ اگر غرور اتنا ہو جتنا آپ کے ہونہار سپوت کو لائق ہے تو پھر غرور کا سر ہی نہیں بلکہ ٹائلیں بازو، سر دھڑ سب کا سب نیچا ہو جاتا ہے۔" انہوں نے تو یوں کاٹرن ان کی جانب کیا۔ وہ چائے کے انتظار میں ڈائمنگ ٹیبل پر بیٹھتے تھے ورنہ

دل تو اتنا بھجا ہوا تھا کہ دل چاہ رہا تھا کہ بس خلاف تک چڑھائیں اور کسی کی جانب ناویکیں۔ میڈم جینہ نے چند گھنٹوں میں ان کا سالو کرایا اعتماد مٹی میں ملا دیا تھا۔

مہناز بیگم نے ساس پین کو پانی سے بھر چوڑے پر پھینکنے والے انداز میں رکھا اور ان کی جانب رخ کیا۔ سونیا نے آگے ہو کر ساس پین کو سنبھال لیا لیکن منہ سے کچھ نہیں کہا۔ ممانی کے غصے سے ابھی ڈر لگ رہا تھا آخر اس کا خیر میں اس کا بھی برابر کا حصہ تھا۔ اس نے بھی تو انہیں زر میں کے جانے کے لیے کتنی مشکل سے رضامند کیا تھا۔ ان کی جانب دیکھے بنادہ چائے کی پتی اور چینی وغیرہ نکالنے کے لیے کینٹ کی جانب ہوئی تھی۔ مہناز بیگم ماسٹر جی کے سامنے والی کرسی پر جا بیٹھی تھیں۔

"بہت شوق تھا آپ کو بھی ماسٹر جی بیٹے کی کے مطابق چلنے کا۔ اس کی پسند کی ہوئی لڑکی کے جانے کا۔ اسے بھونانے کا۔ بہت بھر و سا تھا آپ اپنے بیٹے کی عقل و دانش پر۔ آپ کا فرمان تھا نا انتش نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا ہوگا۔ اب آیا۔ پتا چلا۔ دھلے دھلائے منہ پر پڑ گئی ہے ناچیز اب تو بہت خوش ہوں گے آپ۔ اتنی تو بہن کروا سکون مل ہو گیا ہوگا آپ کو اور آپ کے بیٹے کو بھی جن کا اصول ہی یہ ہے کہ کپڑا لینا ہو یا صابن، برادیکھ کر لینا چاہیے اور ساس پسند کی ہیں انجڈ، چار گنوار۔ کس قدر بدتمیز اور بد لحاظ عورت تھی وہ۔ کیسے احمقانہ سوال پوچھ رہی تھی بار بار۔ ہیں ماسٹر جی ہائیں ماسٹر جی! یہ آپ کا بیٹا ہے؟ اتنی تھکی ہوئی ہو کر میں پڑھا کیسے لیا آپ نے اپنے بیٹے کو۔ بینک سے قرض تو نہیں لیا تھا؟ اور یہ غریب کسی گاڑی فسطوں لے کر دی ہوگی آپ نے بیٹے کو؟

ہاں بھائی غریب ہیں تو کیا ہوا دل تو چاہتا ہے کہ اکلوی اولاد کے جو چلے پورے کیے جائیں۔ اپنے بڑھاپے کے لیے بھی کچھ بچایا ہے یا ساری پونہ بیٹے کو سجانے سنوارنے میں ہی ضائع کر دی؟ آئیے

انتش سوال بار بار پوچھ کر ثابت کیا کرنا چاہ رہی تھیں کہ وہ ہم کوئی بھوکے گئے، بنانا منہ کے لوگ ہیں جو اس سے اتار لیے گئے تھے یا کھو کھو کر درک آلو کی طرح زمین سے برآمد کیے گئے تھے۔ اگر اتنا ہی احمق ہے انہیں اپنی امارت کا تو ہمیں بلوایا ہی کیوں تھا؟ آپ کی تو آواز ہی نہیں نکل رہی تھی اس کے سامنے۔ کیسے میڈم جی، میڈم جی کرنے لگے ہوئے تھے آپ۔" انہوں نے لگے ہاتھوں ماسٹر جی کو بھی مارا۔

"مجھ سے خفا ہونے کی ضرورت نہیں ہے بی بی! میں پہلے ہی بہت الجھا ہوا بیٹھا ہوں۔ جو کچھ بھی آج ہوا۔ وہ میری توقع کے بالکل برعکس ہے۔ میری تو پوچھ میں ہی نہیں آ رہا لیکن جو بھی ہوا، برا ہوا۔ وہ کچھ بد لحاظی پر آخر اتنی تھیں تو آپ کے بیٹے نے بھی اچھا نہیں کیا۔" کسے غور توں کی طرح ان کی ہر بات کے جواب میں بھگو بھگو کر لگا رہا تھا۔ رشتے کا لانا کیا نا ان کی عمر کا۔ ایسے بات کی جانی ہے بڑوں کے۔ کیا سوچتی ہوں گی وہ۔ اچھی تربیت کی ہے ماسٹر جی نے بیٹے کی۔" ماسٹر جی کھینچنے سے ہو کر اٹھ گئے۔

میڈم جینہ کے روپے نے انہیں بہت تکلیف پہنچائی تھی حالانکہ وہ رات کے کھانے پر مدد کے گئے تھے لیکن صورت حال اتنی بگڑ گئی تھی کہ وہ لوگ کھانا کھاتے بیٹا ہی واپس آگئے تھے اور انہیں کسی نے روکنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ ماسٹر جی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ساری زندگی جو کام سرانٹھا کر کیا تھا وہ ان کے لیے سر جھکانے کی وجہ بن جائے گا۔ وہ ایک الگ ہی تکلیف سے گزر رہے تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ میڈم جینہ کا رویہ بہت تنگ آمیز تھا لیکن انتش نے بھی بدتمیزی کی انتہا کر دی تھی۔ ابتدا میں تو وہ خاموش ہی رہا لیکن پھر اس کے صبر کا پیمانہ بڑھ ہو گیا تھا اور اس نے ان کے ہر سوال کا بدو بد جواب دینا شروع کر دیا تھا۔ ماسٹر جی کو یہ بات بھی اچھی نہیں لگی تھی لیکن فی الوقت وہ اپنی اہلیہ کے سامنے

اس بات کو زیادہ دہرا کر ان کے غصے کو ہوا نہیں دینا چاہتے تھے اسی لیے ان کا لہجہ کمزور سا تھا۔ مہناز بیگم ان کی بات سن کر ہنرک ہی اٹھیں۔

"ماشاء اللہ۔۔۔۔۔ یعنی آپ ابھی بھی اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ آپ کے متعلق کچھ سوچتی ہوں گی۔ دو ٹوکے کی سلاہی ہے آپ کی اس سوچ کو ماسٹر جی۔" وہ غرا کر بولیں پھر انہیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بات مکمل کی۔

"آپ ابھی بھی شاید اس رشتہ داری کے خواب دیکھ رہے ہیں لیکن میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ تو بھی منور نگہمی نا دیکھے گی آپ کی طرف۔ آپ نے دیکھا نہیں اس کا رویہ۔ لیکن پھر بھی آپ نہ جانے کون سی امید کے انڈے نوکری میں ڈال کر بیٹھے بیٹھے رہے ہیں کہ نا آپ تھک رہے ہیں، نا انڈے ترخ رہے ہیں اور انتش کو کوٹنے کی ضرورت نہیں۔ اس عورت نے بڑے پن کا ثبوت تو خود نہیں دیا تو وہ تو پھر کل کا بچہ ہے نہ حترمہ کے آگے۔ اس کے صبر کا پیمانہ تو ایسے بھی لمبیریز ہونے کو ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ آپ نے دیکھا تھا وہ بات کیسے کر رہی تھی جیسے ہم اس کے ملازم ہوں۔ انتش نے بالکل ٹھیک کیا۔ کہیں تو فائدہ ہوا مجھے اس کی منہ پھٹ طبیعت کا۔

بھلا بتاؤ۔ ہونے والی ساس پہلی ہی ملاقات میں سوال کیسے کر رہی تھیں۔ میری بیٹی کو رکھو گے کہاں۔ کتنے کمروں کا گھر ہے تمہارا۔ جب خرچ کتنا دو گے۔ بیٹی حون پر کہاں لے جاؤ گے۔ اتنی ہی خاندانی بنتی ہیں تو یہی لحاظ کر لیتیں کہ ایسی باتیں پہلی ملاقات میں ہی طے نہیں کر لی جائیں۔ پہلی ملاقات میں ہی اصلیت دکھا دی اس عورت نے تو۔ ویسے ایک لحاظ سے اچھا بھی ہے۔ انتش کو ایسی ہی بنگلی کا بیٹا بنانے والی ساس مٹی چاہیے۔ اس لڑکے نے بھی کون سا اچھا کیا ہے ہمارے ساتھ۔ ذلیل کر داکر رکھ دیا ہے۔ خود ہی جھگٹے ایسی کڑوی ساس کو۔" وہ نا جانے سنجیدہ تھی یا طنز یہ انداز میں کہہ رہی تھیں لیکن چائے بنائی سونیا کے لبوں پر مسکراہٹ چھپنے لگی تھی۔

"انتش غلام حسین۔ ماسٹر جی آپ کا بیٹا ہے؟" زرمین کی ماما کے تحقیر آمیز تاثرات اس کے ذہن میں جیسے چمکر رہے تھے۔ سونیا ان ہی کے متعلق سوچتی چلی جا رہی تھی اور اسے انتش ہی تصور دار نظر آ رہا تھا۔ زرمین کی ماما کا چہرہ ماسٹر جی کو دیکھتے ہی کیسے بدل سا گیا تھا۔ وہ اس انگشٹاف پر ہکا بکا رہ گئی تھیں۔ انتش نے اپنی قبلی کے بارے میں جانے کون کون سے چھوٹ بول رکھے تھے زرمین سے کہ وہ بھی حیران نظر آتی تھی۔

"افسوس..... صد افسوس۔ یہ کیا ہو گیا انتش!" سونیا نے سوچا تھا پھر اس نے اچلتے ہوئے پانی میں چھپ بھر کر جانے کی پتی ڈال دی۔ ایک سیکنڈ میں ہی پانی کا بے رنگ چہرہ مجبورے رنگ میں ڈھل گیا تھا۔ دن کا اچال جیسے یک دم بنا دو پہر اور شام میں ڈھلے رات بن گیا تھا۔ اسے لگا جیسے یہ چائے کا پانی نہیں ہے بلکہ اس گھر میں وقوع پذیر ہونے والی صورت حال ہے۔ ایک بختے سے جو بے مسرت ماحول بنا ہوا تھا اسے کسی کی نظر ہی لگ گئی تھی۔

انتش کو جس روز اس نے بتایا تھا کہ ممانی زرمین کے گھر جانے کے لیے رضامند ہو گئی ہیں اس روز سے وہ بے پناہ خوش تھا۔ ماموں ممانی نے بھی جیسے بیٹے کی مرضی کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ان سب کا ہی خیال تھا کہ بس ممانی جان کی رضامندی ہی ایک مشکل مرحلہ تھا۔ ان کے گمان میں ہی نہیں تھا کہ میڈم تہمین بھی ایک "رکاوت" ثابت ہو سکتی ہیں۔ وہ تو ان لوگوں کو دیکھتے ہی جیسے جتنے سے اکھڑ گئی تھیں۔ سونیا جہاں تک سمجھ سکی تھی۔ غلطی کا معاملہ لگ رہا تھا۔ زرمین کی والدہ شاید توقع نہیں کر رہی تھیں کہ انتش کا تعلق ان کے خاندانی درزی ماسٹر غلام حسین سے ہو سکتا ہے تب ہی وہ صورت حال اور اپنے مزاج پر قابو نہیں رکھ پائی تھیں۔

"انتش کہتے ہیں مجھے۔ سب جتنا ہے مجھ پر۔" سونیا کی سماعتوں میں جیسے کوئی تاخیر پھری آواز سرسرائی ہوئی آئی تھی اور لڑکھرائی ہوئی گزر گئی تھی۔ ایک استہزائی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر نمودار

ہوئی۔ اس نے مزید کرسی عقب میں دیکھا۔ ممانی جان ماموں آپس میں اچھے ہوئے تھے۔ اس نے دوبارہ سے چائے کے ساس پین کی جانب دیکھنا شروع کر دیا۔ یہاں کھڑے ہو کر مسکرانے کا مطلب الوقت اپنی شامت کو دعوت دینا تھا۔

ڈیزھ ایک گھنٹہ ہو چلا تھا ان سب کو زرمین کے گھر سے واپس آئے ہوئے۔ انتش ان کو دروازے پر چھوڑ کر بیٹا کچھ کے کہیں چلا گیا تھا۔ ماموں کو بات کا بھی ڈھکھنٹھن ممانی جان کی ناراضی کے سے وہ اس متعلق کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔

"انتش غلام حسین۔ آج کا دن تو سدا یاد رہے نہیں۔" وہ پھر مدھم سا مسکرائی تھی۔ اسے جاہ کیوں گدگدی ہوئے چلی جا رہی تھی۔

☆☆☆

"ارے بہت کچھ ہو گیا ہے اب تو....." بتاؤں اور کیا بتاؤں۔ اس نے اس کو چھوڑ دیا۔ جس کو پہلے گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتا تھا۔ "مجھ جگمگ کی آواز سارے گھر میں گونج رہی تھی۔"

"لا حول ولا قوتہ" وہ سخت کبیدہ خاطر ہو کر بڑا دیا تھا۔ امی کہیں نظر نہیں آئیں وہ یقیناً فون بائیں کرنے میں مصروف تھیں۔ اسے بھوک لگ رہی تھی لیکن سونیا بھی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ کھانے کے لیے اپنے کمرے سے نیچے آیا تھا۔ دن گزر گئے تھے زرمین کی والدہ سے ملاقات کو ان دو دنوں میں اس نے اپنے آپ پر اتنا جبر کیا جتنا کبھی زندگی میں نہیں کیا تھا۔ اس نے ایک بار زرمین کو کال کی تھی ماسٹر جی کے تھے اور تھپ تھپ یہ بھی کہ اس نے رابطہ کرنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔

"بہت دعوے کرتی تھی میڈم! تمہارے نہیں رہ سکتی۔ سر جاؤں گی۔ ادنیہ، جھوٹی!" وہ ہر بلا وجہ موبائل اٹھا کر دیکھنے لگتا تھا کہ شاید اس جانب سے کوئی میج ہی آیا ہو پھر بڑا بڑا ہوتے رہتا تھا۔ یہ کیفیت تو دل میں چل رہی تھی لیکن بظاہر لا رہا تھا پھر تا تھا اگرچہ اپنے کمرے تک محدود ہو

تھا۔ سب سے بات چیت مختصر ترین کر دی تھی۔ آفس سے بہت تاخیر سے واپس آ رہا تھا لیکن یہ ظاہر نہیں کر رہا تھا کہ جیسے اس کو یہ درگت بہت محسوس ہوئی ہے بالانگہ اس دن جو کچھ بھی ہوا تھا وہ اس کی توقعات ہی نہیں برداشت سے بھی بڑھ کر تھا۔

آج تک کبھی کسی نے ایسے تھیک نہیں کی تھی اس کی۔ ایسا ہنک آمیز سلوک کبھی سہا ہی نہیں تھا اس نے۔ اس کے والدین کے سامنے اس کی بڑا اعتماد مفرد شخصیت پر زور دار پھنڑا تھا اور وہ یہ سب اتنی جلدی بھولنے والوں میں سے نہیں تھا۔ لیکن وہ منہ لٹکا کر بیٹھنے والوں میں سے بھی نہیں تھا۔ یہ اس کی اتنا کا مسئلہ تھا۔ اسے اس کی غربت کا طعنہ ہی نہیں دیا گیا تھا، اس کے والد کا مذاق بھی اڑایا گیا تھا۔ وہ عجیبے بھول سکتا تھا یہ سب۔ لیکن اس کی دلی تمنا تھی کہ باقی گھر والے سب کچھ بھول جائیں اسی لیے جب وہ نیچے آیا تو امی کی آواز سن کر اسے غصہ آنے لگا تھا۔

"ہونا ہو۔ میرے متعلق بات کر رہی ہیں کسی سے۔" اس نے جل کر سوچا تھا۔ وہ جانتا تھا امی کی ایک ہی سہلی ہیں جن سے وہ ایسی باتیں کرتی تھیں اور وہ اس کی پھوپھی تھیں۔

"مجھے اس پر غصہ تو آتا ہے لیکن ترس بھی آتا ہے۔ جو کچھ ہوا ہے اس نے یہ سب نہیں سوچا تھا لیکن ذہن بہت ہے عطیہ۔ پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتا۔ ایسی کھری کھری کی ہے نا اس نے اس ملک کے ساتھ کہ میرے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی ہے۔" وہ مسلسل بول رہی تھیں اور ان کی آوازیں سارے گھر میں گونج رہی تھیں۔

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔ ذہن تو میں ہوں لیکن اس بات کا ڈھنڈورا پیسنے کی کیا ضرورت ہے۔ امی کے پیٹ میں بھی کوئی بات نہیں لگتی۔" اس نے انگلی ٹھیک کی کرسی تھمیت کر بیٹھے ہوئے جو کر خود سے کہا تھا اور سامنے بڑا اجارے قریب کیا تھا۔ میز پر ایک بڑے جار کے اندر خشک میوہ جات اور پائیس ہمیشہ ہی پڑی رہتی تھیں۔ یہ اس کا شوق تھا

اور وہی یہ سب چیزیں لا کر رکھا کرتا تھا۔ جار میں سے ایک چاکلیٹ نکالتے ہوئے اس نے پھرائی کی آواز کی جانب توجہ کی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو عطیہ! مفرد تو ہے لیکن اس کی پروا کرتا ہے۔ دم بہت بھرتا ہے اس کا۔ محبت کرتا ہے اس سے۔ اپنے منہ سے کئی بار تو کہہ چکا ہے۔ وہ بھی سب سمجھتی ہے اور یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ ماں کی وجہ سے مجبور ہے۔"

ان کی آواز میں بے زاری اور شکوہ ایک ساتھ محسوس ہوا تھا انتش کو۔

"سب کچھ آج ہی بتا دیں پھوپھو کو۔ وہ بھی فون پر۔ کل تو جیسے پانچ سال بعد آئی ہے۔" اس نے تجھجھلاتے ہوئے چاکلیٹ کے دو بڑے بڑے بائٹ ایک ساتھ لیے تھے۔

"لڑکی بہت لاڈلی ہے بھائی اس کی۔ اس کی خاطر سب کچھ کر سکتا ہے۔ جان دیتا ہے اس پر۔ اسی کی خاطر کر رہا ہے سب۔ لیکن تم دیکھ لینا عطیہ یہ لڑکی ہی اس کی زندگی کی سب سے بڑی مصیبت بن جاتی ہے۔ یہ قدرت کے اصول ہیں۔ یہ لڑکی اس کا سارا طغیہ خاک میں ملا ڈالے گی۔"

"باللہ۔ کیا ہو گیا ہے امی آپ کو۔ کوئی پردہ بھی رکھیں گی اگلی اولاد کا یا نہیں۔" اس بار وہ ذرا بلند آواز میں بڑا دیا تھا۔ جواب نہایت قریب سے آیا۔ "وہ تمہاری بات نہیں کر رہیں۔ امی کو میرے سلطان کی نئی قسط کا خلاصہ سنار ہی ہیں اور اسی کے متعلق بحث کر رہی ہیں۔" سونیا کی آواز میں مسخر تو نہیں تھا لیکن کہیں دلی ہوئی ہنسی ضرور ٹھک رہی تھی۔ انتش نے یک دم مزہ کر دیکھا۔ وہ فریج کی سائڈ پر لگے سوچ بورڈ کے قریب کرسی پر بیٹھی تھی۔ گوگن ہاتھ میں پلڑے گود میں چھپتی دھکی دھکی چیزیں پھیلائے جانے کیا کرنے میں مگن تھی کہ اس کو نظر ہی نا آئی۔ اسے اپنے غلط انداز پر پر شرمندگی تو ہوئی مگر اعتراف کرنے میں تو کسی بھی سوا سی انداز میں چڑ کر بولا۔ "پچھل بھری۔ تم کہاں سے آ گئی ایک دم؟"

ہمیں بھی مرفی ہی کھلائی اور جب جب ہم نے وال کھائی۔ آپ نے بھی ہمارے ساتھ وہی کھائی۔ انسان دولت جانیدار ہے۔ روپے پیسے۔ رنگ روپ۔ کام کاج، اونچ نیچ۔ حسب نسب سے نہیں بننے ماسٹر جی! اگر بننے ہوتے تو میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری خطبہ ایسا بنا دیا ہوتا کہ برتری صرف تقویٰ کو حاصل ہے۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا ماسٹر جی کہ انسان تو دل سے بنتے ہیں۔ جس کا دل اللہ والا ہے نا۔ پر ہیرو گار، محبت کرنے والا۔ اخلاص برستے والا۔ بس وہی انسان ہے اور آپ سے بڑھ کر میں نے کوئی محترم انسان اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ آپ تو میرا آخر ہیں ماسٹر جی۔ "وہ ان کے شانے دباتے دباتے جانے کیا کیا کہتا چلا جا رہا تھا۔ اسے پتا بھی نا چلا تھا کہ ماسٹر جی کی آنکھیں بالکل بھگ گئی تھیں۔

"چپ کر جا رہا نوازیا۔ میں بھی بڑا معتبر بنا پھرتا تھا۔ لیکن میں نے اپنی اولاد کو ذلیل کر دیا۔ بڑی بے عزتی ہو گئی میری وجہ سے اس کی۔" ان کی آواز گھونک رہی۔ رب نواز کے تیزی سے چلتے ہاتھ کچھ مدھم ہوئے۔ اس نے کن آنکھوں سے ان کے چہرے کو دیکھنا چاہا جو کہ پشت سے ممکن نا تھا لیکن اسے یقین ہو گیا تھا کہ ان کے ساتھ کوئی مسئلہ ضرور ہے ورنہ اتنا سنجیدہ و رنجیدہ اس نے انہیں بھی نہیں دیکھا تھا۔

"میرا دروزی ہوتا میرے بیٹے کے لیے گالی بن کر رہ گیا ہے رب نواز۔ جو میں نے زندگی بھر نہیں سوچا تھا۔ وہ ہو گیا میرے ساتھ۔ میرا بچہ کیا سوچتا ہوگا میرے بارے میں۔ اکوں اک میرا ختم ارادہ پتر ایسی ایسی باتیں سن کر آیا ہے کہ دل میں ضرور ہی سوچتا ہوگا کہ اس دروزی باپ سے تو اچھا تھا یتیم ہو جاتا۔" ان کا لہجہ اتنا پیچھا ہوا تھا کہ رب نواز کے دل کو دھکا سا لگا۔ وہ تڑپ کر ان کے سامنے آ گیا اور ان کے قدموں میں ہی بیٹھ گیا۔

"مجھے نہیں پتا ماسٹر جی! آپ کے دل میں کیا کیفیت چل رہی ہے۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں یا کیا سوچتے ہیں۔ لیکن میں اس کام سے بے حد خوش

ہوں۔ مجھے اس کام سے زیادہ آج تک کوئی کام اچھا نہیں لگا۔ اس میں بے ایمانی کرو تو فوراً پتا چل جاتا ہے۔ ایک اونچ کی غلطی بھی پہلی نگاہ میں سامنے آ جاتی ہے اور پھر ذرا سی اونچ نیچ ہو جائے تو لوگ جواب غلی کرنے آ جاتے ہیں۔ آپ کو ذرا ہی لگا رہتا کہ کہیں کوئی خالی نارہ جائے۔ یعنی بہت خطا رہنا پڑتا ہے کیونکہ ایک ایک بچہ کے لیے آپ گاہک کو جواب دہ ہوتے ہیں۔ آپ خود سوچیں ماسٹر جی جس کام میں غلطی کی گنجائش ہی نا ملتی ہو۔ اسے تو بہت دھیان سے کرتا ہے نا انسان۔ بہت نیت لگا کر۔ پورے اخلاص کے ساتھ۔ تو پھر ایسے کام میں چار و ناچار حرام کمائی کے مواقع بے حد کم ہو جاتے ہیں۔ یقین کریں ماسٹر جی اس سے زیادہ اعلا کام کوئی ہو ہی نہیں سکتا جس میں حرام کمائی کے مواقع کم سے کم ہوں۔" وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بہت آہستہ آہستہ اپنی بات مکمل کر رہا تھا۔

"رہن دے رب نواز یا! وہ فرمانہ گیا۔ اب تو دروزی ہونا گالی ہی لگنے لگا ہے۔ بھلا بتا دیا کتر پیٹھے والا انسان رشتہ بھی نہیں مانگ سکتا اپنی اولاد کا۔ اتنا گیا گزرا ہوتا ہے دروزی۔" وہ لا چاری بھرے لہجے میں بولے تھے۔ اس نے ان کی بات کی تردید کرنے کے لیے سختی سے نفی میں گردن ہلائی۔

"آپ غلط سوچ رہے ہیں ماسٹر جی! آپ کتر نہیں ہیں اور کوئی کام بھی کتر یا نرا نہیں ہوتا۔ میں جب مدرسے جاتا تھا تو ہمارے قاری صاحب کہا کرتے تھے کہ جس پیٹھے سے بھی انسان کو حلال کمائی ملتی ہوتا۔ وہ چھوٹا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کمائی کا حلال ہونا شرط ہے۔ پھر چاہے آپ جہاز چلائیں یا سلائی مشین۔ آپ ایک برابر ہیں۔ آپ کی ایک جتنی عزت ہے۔ طیب سوئی سے زخم پوشی کرتا ہے اور دوس سے بارہ دن میں زخم بھرتے ہیں۔ درد جاتا ہے اور دروزی سوئی سے ستر پوشی کرتے ہیں اور چند لمحوں میں پردہ ہو جاتا ہے۔ کسی کا پردہ رکھنا تو بڑا نیکی والا کام ہے ماسٹر جی۔ آپ خود بتائیں ستر پوشی کرنا کیا کوئی

ادنیٰ کام ہو سکتا ہے۔ مان لیجیے ماسٹر جی! یہ پیش ادنیٰ نہیں ہو سکتا۔ یہ پردہ داری والا کام ہے۔ آپ لوگوں کی بے لباہی کو لباس فراہم کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔ آپ کیوں خود کو کتر سمجھتے ہیں۔ میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو جو تھے بھی گاتھے، پونہ بھی روکے۔ اینٹیں بھی ڈھوکیں اور بکریاں بھی چرا میں۔ مچھلیاں بھی پکڑیں اور بھیڑیں بھی پالیں۔ انہوں نے تو سارے کام سر اٹھا کر کیے، فخر سے کیے کہ خدا نے کسی کام سے نہیں رد کا تھا بلکہ حرام سے رد کا تھا۔"

اس نے زک کران کا چہرہ دیکھا پھر زری سے بولا۔ "کوئی بھی کام نرا نہیں ہوتا۔ حرام نرا ہوتا ہے اس لیے کام کو نرا نہیں سمجھتے ماسٹر جی۔ حرام کو نرا سمجھتے ہیں۔ حلال کمائی والے سب ہی پیٹھے اچھے ہوتے ہیں۔ معتبر ہوتے ہیں۔ سب ہی پیشہ ور لوگ چاہے وہ موجی ہوں یا دھونی۔ مزدور ہوں یا کھار۔ سب ہی محنت کر کے اپنا رزق کشید کرتے ہیں۔ خون پسینہ بہا کر اپنی آل کے لیے کماتے ہیں۔ اس لیے میرے لیے آپ اور میرا پیشہ دونوں بہت معتبر ہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں میری بات؟" وہ ان سے پوچھ رہا تھا۔ ماسٹر جی نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے "ناٹ" نے ان کے حوصلے کو کافی بلند کر دیا تھا۔ چند دن سے جو بے زاری ان پر سوار تھی چھٹنے لگی تھی۔ انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹپک لگائی تھی۔ رب نواز ان کے چہرے کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔

"اتنے دن ہوئے میں نے کوئی میٹھی چیز نہیں کھائی۔ دماغ بند ہو گیا ہے میرا۔ مجھے کہاں کچھ میں آکس کی تیری باتیں۔ پہلے طبعی لے کر آ۔ پھر پوچھنا اے سوال۔" وہ بولے تھے۔ رب نواز کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ابھی لے کر آتا ہوں۔" وہ فوراً ہار کو لپکا تھا۔ "کوئی کام نرا نہیں ہوتا۔ حرام نرا ہوتا ہے۔" رب نواز کے الفاظ جیسے ان کے گرد پھیلے رہ گئے تھے۔ انہیں یک دم ہر طرف روشنی ہی محسوس ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

"تمہیں کچھ کہنا ہے؟" انش نے زمین کے چہرے کی جانب دیکھتے سے گریز کر پتے ہوئے لٹھ مار انداز میں کہا تھا۔ اپنے لٹھے کی کی ٹپی اور ترشی کو چھپانے کی اس نے کوئی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ زمین کا حلیہ بتانے کو کافی تھا کہ وہ کس قدر بے چین ہے۔ اس کے چہرے پر آرائش کا کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ بالوں کو بھی اجڑے مجڑے جوڑنے کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔ دودھیا رنگ کی سنہری سنہری بنٹوں والی شکلوں بھری شرٹ کے ساتھ بیرون ٹراڈرز پہنے وہ بالکل نڈھال ہی لگ رہی تھی۔

انش کے دل کو اسے اس حال میں دیکھ کر بے پناہ سکون ملا تھا لیکن میڈم تہینہ کے ہاتھوں جو بے عزتی اس نے سہی تھی وہ ابھی بھولی نہیں تھی اسے اور کبھی بھولنے والی بھی نہیں تھی۔ وہ جان بوجھ کر مقرر کردہ وقت سے کچھ تاخیر سے اس کافی شاپ میں پہنچا تھا جہاں زمین نے اسے آنے کے لیے کہا تھا اور آتے ساتھ ہی اس نے جیسے پلٹنا کرنے والے انداز میں گفتگو شروع کر دی تھی جو کہ زمین کی توقع کے برخلاف تھا۔

"میں کیوں؟" اس کے چہرے پر طنز کی پرچھائیاں چمکی تھیں پھر بات کو مزید بڑھاتے ہوئے استغیاب انداز میں کہنے لگی۔

"کیا مجھے کچھ کہنا چاہیے؟" اس نے انتہائی نرا مان کر "کچھ" پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔ وہ توقع کر رہی تھی کہ چونکہ اس نے خود رابطہ کر کے صلح کی پہل معذرت کر لے گا اور جیسے چیزیں ایک خراب دن نے بگاڑ ڈالی تھیں ویسے ہی ایک اچھا دن سب معاملات کو سدھار دے گا اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

انش چند ثانیے تو مستغرق انداز میں اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر کرسی پر بیٹھے ہو کر بیٹھے ہوئے بولا "ارے نہیں۔ تم کیوں کچھ کوہی بھلا اور باقی بیجا ہی کیا ہے کہنے کے لیے۔ سب کچھ کہہ کر تو دبا تھا

تمہاری والدہ محترمہ نے۔ "زمین نے اس کے بلند لہجے پر خائف ہو کر ادھر ادھر دیکھا تھا۔ لہجے کا وقت تھا اس لیے نوڈ کورٹ میں لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بڑھنے لگا تھا۔

"ماما نے ایسا بھی کیا کہہ دیا تھا کہ تم آؤٹ آف کنٹرول ہی ہو گئے اور کھانا بھی نہیں کھایا۔ تمہیں اندازہ بھی ہے کہ کتنی انسٹل ہوئی ہے تمہاری وجہ سے میری۔ تمہاری وجہ سے کتنی باتیں سنی پڑی ہیں مجھے "زمین ضبط سے کام لیتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی کہ انتہا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تمہاری انسٹل۔" وہ ایک بار پھر غرا کر بولا۔ "زمین بی بی انسٹل میری ہوئی ہے۔" تم کھانے کی بات کر رہی ہو۔ ہم سے تو وہ چائے ختم نہیں ہو رہی تھی جو تمہاری والدہ محترمہ نے احسان بناتے ہوئے سامنے رکھ دی تھی۔ ان کا انداز دیکھا تھا تم نے اور پھر بھی تم مجھ سے شکوہ کر رہی ہو۔ ایک نظر ان کے رویے پر بھی غور کر لیتا تھا ذرا۔ "وہ سخت ناراض لہجے میں کہتے کہتے ایک لہجے کے لیے ڈکا پھر بولا۔

"معاف کرنا زمین لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی....." وہ جان بوجھ کر لفظ "ال میزڈ" کہتے کہتے رک گیا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات نے زمین کو بخوبی یاد کر دیا تھا کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔ اسے بے حد برا لگا لیکن انتہا حریف کہہ رہا تھا

"تم ان کی غلطیاں نکالنے کے بجائے ذرا اپنے رویے کی بھی وضاحت کرو۔ تم نے کتنی بدتمیزی کی تھی ان کے ساتھ۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر پچھل گیا ہوئی۔

"میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی بلکہ انہوں نے کی۔ تم خود سوچو کہ وہ کس قدر تنہیک کے ساتھ میرے پیرنس سے پیش آ رہی تھیں۔ ہم خود نہیں آئے تھے۔ بلوائے گئے تھے اور وہ ہم سے لہجہ سلوک کر رہی تھیں جیسے ہم زبردستی ان کے گل میں گھس آئے ہوں۔ چار بار انہوں نے مجھ اوپر سے نیچے دیکھ کر

پوچھا ہوگا کہ ماسٹر جی یہ واقعی آپ کا بیٹا ہے اور پھر یہ سوال کرتے ہوئے وہ مسخرانہ انداز میں چہرہ دیکھ کر ہنسی کیوں نہیں۔ مجھے کیا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا جتنا چاہ رہی تھیں۔ تین بار انہوں نے انتہائی طنز انداز میں مجھے "پیارے افضل" کہا۔ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھیں کیا مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کب تک برداشت کرتا میں۔ ہاں بھی مان لیا بہت امیر ہیں وہ۔ بہت پیسہ ہے ان کے پاس۔ لیکن یاد رہے میں بھی پھونک مار کر اڑا لیا جانے والا جہاز نہیں ہوں۔" وہ انگلی سے اس کی جانب اشارہ کرنے والے انداز میں کہتا ہوا ایک بار پھر ڈکا۔ اس کی آنکھوں سے انگارے نکل رہے تھے۔ ایسی تحقیق تو اس نے کبھی ناسی تھی۔

"کتنی چمک محسوس ہو رہی تھی مجھے ان کی باتیں سن کر۔ اپنی امی اور ماسٹر جی کے سامنے۔ یہ کوئی بات بھی کرنے والی کہ مجھے انسانوں کی بالکل صحیح پرکھ ہے۔ میں تو انسان کا چہرہ دیکھ کر ہی بتا دیتی ہوں کہ وہ منسلکی ہے یا جڑوا۔"

انتہا کو نے سر سے سے جیسے سارے حساب کتاب یاد آ گئے تھے۔

زمین نے گہری سانس بھر کر توانائی جمع کی۔ وہ تو اس کے سامنے جیسے پختا ہٹ لگا کر بیٹھ گیا تھا اور جب جرح شروع ہوئی تھی تو بہتر تھا کہ ساری جمع تفریق ابھی ہی کر لی جاتی۔

"تم نے بھی کوئی کر نہیں چھوڑی تھی انتہا! کتنا ردولی جواب دیا تھا تم نے انہیں کہہ رہے بھی دیں سسر جہیز آپ ذات برداری کی بات کرتی ہیں۔ آپ جیسے لوگ تو وہ پڑھائے دیکھ کر یہ نہیں بتا سکتے کہ آلودہ کون سا ہے اور مولی والا کون سا۔ آپ پچھانیں گی لوگوں کو۔" اس نے جتا کر کہا تھا۔ انتہا کے چہرے پر ہلکا آمیز مسکراہٹ حریف بڑھ گئی تھی۔

"یہی برقیٹ جواب تھا۔ ان کو بھی پتا چلنا چاہیے تھا کہ اکیلی وہی سینہ خانی نہیں ہیں شہر کی۔ ہم بھی گتے جاتے ہیں معززین میں۔ اگر آدھا شہر ان کی

تعظیم میں جھکتا ہے تو باقی آدھا ہمیں بھی سلام کیے بغیر آگے نہیں جاتا اور وہ ہمیں کس طرح ٹریٹ کر رہی تھیں جیسے سارے تھانوں میں ہماری ہی تصویریں تو لگی رہتی ہیں۔" وہ ہر جملہ ایسے ادا کرتا تھا کہ زمین کو نے سر سے سے بات کرنی مشکل ہو جاتی تھی۔ "تم کسی باتیں کر رہے ہو انتہا! تمہیں تو ذرا بھی افسوس نہیں ہے اپنے رویے پر۔" وہ ذہن سی ہوئی۔ اس کا خیال تو تھا کہ انتہا شرمندہ ہوگا مگر یہاں صورت حال ہی مختلف تھی۔

"افسوس کس بات کا۔ میں نے خود سے کسی چیز کا آغاز نہیں کیا۔ اتحاد تمیز نہیں ہوں میں۔ طبل جنگ انہوں نے بجا دیا تھا اور پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں میں۔ اب معرکہ ہوگا اور پھر پور ہوگا۔ میں نے جو بھی کہا وہی کہنا چاہیے تھا مجھے اور تم مجھے لڑنے کے بجائے ان کی ٹریننگ پر زور دو۔ انہیں سکھاؤ کہ تمیز سے بات کیے کی جانی ہے۔ گھر آئے ہوئے مہمانوں کو کیسے ٹریٹ کیا جاتا ہے اور شادی جیسے سنسیٹیو ایٹو (حساس مسئلہ) بریکنڈ پارٹی سے گفتگو کرنے کا کیا طریقہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ کیوں سیکھیں گی بھی۔ وہ تو میڈیم تہیہ ہیں۔ دامیڈم تہیہ!" اس نے انتہائی بدتمیزی سے کہا تھا۔ زمین کو بہت برا لگا۔ ایسی بدتمیزی اس نے انتہا کو پہلے کرتے نہیں دیکھی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو چلا تھا۔

"کم تو تم بھی نہیں ہو انتہا اور سیکھنا تو تمہیں بھی بہت کچھ چاہیے۔ سب سے پہلے تم یہ سیکھو کہ اس طرح کے معاملات میں جھوٹ نہیں بولا کرتے۔" انتہا نے غر کر اس کی بات کاٹی۔

"جھوٹ؟ میں جھوٹ نہیں بولتا زمین صاحب!" "تو پھر تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا کہ تمہارے فادر پچھ نہیں بلکہ....." وہ جان بوجھ کر پچھ ہوئی جیسے منہ سے حریف کوئی لفظ نکلا تو زبان داغ دار ہو جائے گی۔ "انتہا کے چہرے کے تیور حریف بار بار دہرائے گئے۔

"بلکہ..... کیا بلکہ؟ بات پوری کرو۔" اس

نے اسی انداز میں کہا تھا۔

"میں ابھی تک شاک میں ہوں انتہا! میں تو تمہارے فادر کو بہت عالم فاضل سمجھتی تھی اور وہ تو درزی ہیں۔" اس نے انتہائی تحقیر آمیز انداز میں اگل ڈالا تھا۔ یہی بات تو اس کی سب سے بڑی پریشانی بنی ہوئی تھی۔ "تم سوچو تو سہی کہ میری اپنی پوزیشن کتنی آکورڈ ہوگی ہے ماما کے سامنے۔ میں تو ماما کے سامنے شرمندگی سے سر نہیں اٹھا پارہی۔ تمہیں پتا ہے وہ ہمارے خاندانی درزی ہیں۔ سب جانتے ہیں انہیں۔ ہمارا سارا خاندان ان کے ہاتھ کے سٹے کپڑے پہنتا ہے۔ شادی بیاہ پر چھ مہینے پہلے سے ہم اپنے کپڑے ان کی شاپ پر دے جاتے ہیں۔ میری پچھوکی شادی کا، میری خالہ کی شادی کا۔ چچی کی شادی کا اور جتنی بھی میری کزنز ہیں نا۔ ان کی شادی کے لینگ ماسٹر جی کی شاپ پر سلائی ہوئے ہیں۔ سارا خاندان ماسٹر غلام حسین سے واقف ہے۔ سب کو پتا ہے کہ وہ درزی ہیں۔۔۔ اور۔۔۔" وہ لہجہ بھر کے لیے چپ ہوئی تھی

"اور..... بات مکمل کرو زمین۔ کیا اور....." انتہا نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حریف دھار آئے جیسی کاٹ تھی۔ اس کی آنکھیں اتنی سرخ ہو رہی تھیں کہ زمین کو اس سے خوف آیا۔

"اور تم ایک درزی کے بیٹے ہو انتہا! یہ بہت شاک ہے میرے لیے۔ ماما تو ایک اسکول بچہ کے بیٹے کے لیے راضی نہیں تھی اور یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہو گیا ہے۔ میری کس درزی کے بیٹے سے شادی۔ ہمارے خاندان میں بھی نا بھولنے والا واقعہ بن جائے گی۔ تمہیں یہ بات چھپانی نہیں چاہیے تھی۔" وہ روہاسی ہو کر بولی تھی۔ انتہا کو جیسے اب سمجھ میں آیا تھا کہ ماسٹر جی کا غریب ہونا نہیں بلکہ اصل میں "ماسٹر جی" ہونا سارے خساد کی جڑ تھی۔

"ایک سکول زنی اور زنی ہونا کوئی گالی نہیں ہے اور میں نے کبھی چھپایا بھی نہیں تھا۔ انتہا کہتے ہیں مجھے۔ دو غلامین بچتا نہیں مجھ پر۔ ہمیشہ بتانا تمہیں کہ میرے

والد کو زمانہ ماسٹر جی کہتا ہے بلکہ میں تو خود انہیں ماسٹر جی ہی کہہ کر پکارتا آیا ہوں۔ "وہ ایک لمحے کے لیے چپ ہوا پھر اس کا چہرہ بغور دیکھا۔

"یہی تو غلطی ہو گئی مجھ سے۔ میں کبھی نہیں پائی کہ تم اپنے فادر کو ماسٹر جی اُس وجہ سے نہیں بلکہ اُس وجہ سے کہتے ہو۔" وہ خود ہی اپنا موقف ٹھک سے بیان نہیں کر رہی تھی لیکن اس کے باوجود انہیں اس کی بات بہت اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔

"تم اُس کو یا اس کہو۔ وہ میرے باپ ہی رہیں گے اور مجھے ان پر فخر ہے۔ بخدا زمین تجھے پتا نہیں تھا کہ تمہارے لیے مجھ سے زیادہ میرے باپ کا پروفیشن میٹر کرتا ہے۔ مجھ سے زیادہ تمہارے لیے اس بات کی اہمیت ہے کہ میرے باپ کیا کرتا ہے ورنہ میں جنہیں ہر روز تاکید سے بتایا کرتا۔ مجھے تو حیرت ہے کہ اتنی سی بات سے تمہارا سارا عشق اڑ چھو ہو گیا یعنی درزی کے بیٹے سے محبت کرنا بھی گناہ ہو گیا لوگوں کے لیے۔ واہ۔" اس کا لہجہ آہنیچہ دینے لگا تھا۔ اس کے کانوں کی لوہیں سرخ ہو چکی تھیں۔ زمین کو اسے دیکھ کر بھی ڈکھ ہوا تھا۔

عشق اڑ چھو نہیں ہوا! انہیں! یہ کیسے کہہ سکتے ہو تم..... "وہ رو ہی پڑی تھی۔ انہیں نے چہرے پر طنز بھرا مسکراہٹ بجا کر ہنگامہ بھرا۔

"ادبہ..... لی بی آپ وہی ہیں نا۔ جو محبت کے بڑے بڑے دعوے کیا کرتی تھیں۔ میرے ساتھ گولا گنڈا کی ریز بھی لگانے کو بھی تیار تھیں اور اب اس بات سے خائف ہیں کہ میرا باپ ایک درزی ہے اور باپنی دا دے اگر کسی کا باپ درزی ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کسی کی ماں کو بے عزتی کرنے کا لائسنس مل جائے۔ درزی ایک پیشہ ہے۔ گالی نہیں ہے۔"

"اس انداز میں بات نہیں کرو انہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہارے میرے درمیان صدیوں کا فاصلہ حائل ہو گیا ہو۔ محبت کرتی ہوں میں تم سے۔ بے پناہ محبت لیکن تم میرا پوائنٹ آف ویو بھی تو سمجھو۔ میرا سارا خاندان میرا مذاق اڑائے گا۔" وہ اس کی بات کاٹ کر

بولی اور پھر ضبط کے سارے بندھن جیسے ٹوٹ گئے تھے۔ وہ جھوٹ جھوٹ کر رونے لگی تھی۔ انہیں کے دل کو کچھ ہوا۔ اتنے دن سے وہ بھی تو کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ کوئی سراہی ہاتھ نا آتا تھا کہ ہوا کیا۔ وہ مالی حیثیت میں ان سے کم تھے لیکن پھر بھی اس سلوک کے مستحق نا تھے۔ آج اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ اصل بات تو یہ "تھی۔ اس نے زمین کے پچھلیاں لیتے وجود کی جانب دیکھا۔ وہ اس سے دامن نہیں چھڑوا سکتا تھا۔ وہ واقعی اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کی دوبارہ بھی شکل نا دیکھنے کے اس سے بات نا کرنے کے سارے دعوے دھڑلے کے دھڑلے رہ گئے تھے۔

"اب رونا تو بند کرو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ کیا سوچتے ہوں گے میرے بارے میں۔ پلیز زمین۔" وہ مسلسل رو رہی تھی۔ انہیں کرسی کی پشت سے جیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے روتی رہو۔ میری ذات کے وہ پرچے جو تمہاری اماں نے بچا دیے تھے، وہ تم اڑا ڈالو۔" اس کے رونے سے اتنا اطمینان تو ضرور ہوا تھا کہ دل میں اس کی محبت کا یقین مزید پختہ ہو گیا تھا۔ یہ احساس ہو گیا تھا کہ نقصان دونوں کا ہی ہوا تھا۔ دونوں ہی عشق کی آتشزدگی کے متاثرین میں سے تھے۔

☆☆☆

"ممائی جان! میرا دل چاہ رہا ہے پکڑے بنانے کو۔ بنا لو؟" اس نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ وہ لی وی پر کوئی سیریل لگائے نہایت انہماک سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کے سوال پر انہوں نے اس کی جانب دیکھتے بنائی میں سر ہلا دیا۔ وہ شرمندہ ہو گئی۔ دس دن ہو گئے تھے زمین والے واقعہ کو لیکن ان کے گھر کی صورت حال اب بھی تک نارمل نا ہو سکی تھی۔ ماسٹر جی تو بالکل ہی — گرم صم ہو گئے تھے۔ انہیں کی کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ آفس کے لیے بھی جلدی نکل جاتا تھا اور واپسی پر بھی تاخیر

سے آنے لگا تھا۔ سونا خود بھی اپنے کمرے میں محدود رہنے لگی تھی کہ کہیں ممائی جان اسے بھی کھر کی کھر کی نا سنا دیں لیکن وہ اس صورت حال سے انکار ہی تھی۔ سب ہی نارمل نظر آنے کی کوشش کرتے تھے لیکن ہو نہیں رہے تھے۔ اسے اس تناؤ والی کیفیت سے اچھٹ ہونے لگی تھی تب ہی اس نے ممائی جان سے کچھ بنانے کی فرمائش کر ڈالی تھی تاکہ ذرا ہلکا کیا جاسکے لیکن انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ وہ چند لمحے اسی طرح بیٹھی رہی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو وہ اسے گھور رہی تھیں۔

"اگر پکڑے بھی اجازت لے کر ہی بنانے ہیں تو بہتر ہے بناؤ۔" وہ طنز نہیں کر رہی تھیں۔ انہیں سونا کا اتنا تکلف اچھا نہیں لگا تھا جبکہ سونا ان کے لہجے سے پریشان ہو گئی تھی۔

"آپ ناراض ہیں مجھ سے؟" اس نے پوچھ لی لیا، انہوں نے فوراً فنی میں سر ہلا دیا۔

"تم سے کیوں ناراض ہونے لگی بھلا۔ تم سے بالکل بھی ناراض نہیں ہوں میں بلکہ تمہاری جانب سے تو دل کو مزید سکون ہو گیا ہے کہ جو لڑکی میرے بیٹے کی مدد کے خیال سے جھوٹ بول سکتی ہے۔ وہ جب بیٹے کی مدد کرنے کو چاہے بولا کرے گی تو اس گھر میں کتنی برکت ہو جائے گی۔ میں تو شکر ادا کر رہی ہوں کہ ابھی عطیہ کو اس پر دیگرام کی خبر نہیں دی تھی ورنہ بات بنائی کتنی مشکل ہو جاتی۔"

ان کے لہجے میں اس قدر یقین اور بھرپور سا تھا کہ لہجہ بھر کو سونا کچھ بول نا کی پھر اسے احساس ہوا کہ اس کا کچھ کہنا بہت ضروری ہے تو سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں ممائی جان۔ بات یہ نہیں۔" انہوں نے اس کی بات کاٹنے میں لہجہ بھی نہیں لگایا تھا پھر اس کی بات کو قطعی رد کرتے ہوئے بولیں۔

"میں جانتی ہوں بات یہ نہیں تھی۔ بات وہی تھی جو میں کہہ رہی ہوں کہ تم تو صرف انہیں کی مدد کرنا چاہ رہی تھی اور سچ کہوں تو ناراض میں انہیں سے بھی نہیں ہوں ہماری تو ہیں تو جو ہوئی سو ہوئی لیکن اس

نے اپنی متوقع ساس کے ساتھ اس روز جو کیا ہے نا، اس نے میرے دل کو عجیب سا سکون بخش دیا ہے ورنہ اس کے ہر طعنے کے جواب میں ماسٹر جی کی خاموشی مجھے غصہ دلارہی تھی۔ ماسٹر جی کے دل میں بڑی عزت تھی میڈم صاحبہ کی لیکن وہ اب نہیں پوچھنے والی ان کو۔ تم دیکھنا مہناز کا کہا کبھی غلط نہیں ہوتا۔ جی دینا تو دور کی بات۔ وہ اب انہیں سلائی کے لیے ساڑھیاں ملاؤ رنگ نہیں دینے والی۔ خیر چھوڑو سب کو۔ تم بتاؤ جھوٹ بولا تھا تا تم نے مجھ سے کہ تم کسی کو پسند کرتی ہو۔" انہوں نے اس قدر یقین لہجے میں کہا کہ سونا گڑ بڑا ہی گئی۔

گزشتہ بار بھی ان دونوں کے درمیان یہ موضوع ادھر رادہ گیا تھا۔ سونا اس متعلق زیادہ تفصیل میں پڑنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس نے یہ ساری بات ابھی تک اپنی اکی کو نہیں بتائی تھی بلکہ اس نے مہناز بیگم کو بھی یہی کہا تھا کہ وہ اس متعلق ابھی اس کی اکی سے بات نا کریں۔ اگر اس کی اکی کو ذرا سی بھی بھینک پڑ جاتی تو ان کا خفا ہو جانا بھی لازمی امر تھا۔ وہ واقعی کسی کو پسند کرتی ہوئی تو شاید بولا کہہ بھی دیتی لیکن اس موضوع پر مسلسل جھوٹ بولنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے اس بات کو طول دینا اس لیے بھی برا لگتا تھا کہ اس سے اس کی ماں کی تربیت پر حرف آتا تھا۔ اس کا اس بات پر عمل ایمان تھا کہ کسی کو پسند کرنے میں کوئی برائی نہیں ہوتی لیکن اس معاملے میں جھوٹ بولنا یا والدین کو اندھیرے میں رکھنا غلط تھا سو ایک ماموں کے بیٹے کی خاطر وہ اپنی ماں کو ان کی بچپن کی سہیلی کے سامنے شرمندہ نہیں کروا سکتی تھی لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ ممائی پرانے خواب دیکھنے میں کسی جھگڑ کا شکار ہوں سو اس نے بات بنائی چاہی۔

"آپ ابھی بھی غلط سمجھ رہی ہیں ممائی جان۔ میں واقعی....." اس نے بجلت کہا نا چاہا کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ممائی جان دوبارہ سے اس کی اور انہیں کی شادی کے خواب دیکھنے لگیں اسی لیے وہ ایک من گھڑت نام لینے کو تیار ہی بیٹھی تھی کہ انہوں نے اس

کی بات کاٹ دی۔

"یعنی ابھی بھی اعتراف نہیں کرو گی کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ لیکن خیر جاؤ بناؤ پکڑوے۔۔۔۔۔ پکڑوے بنانا مجھے احمق بنانے سے تو زیادہ ہی اچھا کام ہے۔" وہ چپ کی چپ رہ گئی۔ مہناز بیگم دوبارہ سے لی دی کی جانب متوجہ ہو گئی تھیں۔

"اور ہاں وہ میرے برخوردار بھی موجود ہیں آج۔ ان سے بھی پوچھ لو کہ تم پھاٹکنے سے فرصت مل گئی ہو تو کچھ کھا پی لیں۔" اسے باہر لکھا دکھ کر انہوں نے کہا تھا۔ سونیا خاموشی سے بچن کی جانب آگئی تھی۔

☆☆☆

"کہاں ہے آری ہے تشریف؟" زرمین کی ماما نے اسے لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھ کر دور سے ہی کہا تھا۔ وہ پارلر جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ گھر کے گریبان کے سادہ سے شلوار قمیض میں کاؤچ پر بیٹھی موبائل سے کھیلتی ہوئی وہ جانے کس کا انتظار کر رہی تھیں۔ زرمین نے کوشش کی کہ چپ چاپ لاؤنج کی سیز صباں چل کر اسے کمرے تک چلی جائے لیکن انہیں نے دیکھتے ہی سوال پاردیا تھا۔

"نمبرہ کی طرف گئی تھی۔" اس نے سادہ سے انداز میں جواب دیا۔ اس کا دل آتش سے ملاقات کے بعد کچھ مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس سارے مسئلے کا کوئی حل جلد ہی نکال لے گا۔ مسئلہ حل تو نہیں ہوا تھا لیکن دل ضرور مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ کافی دن بے چین رہنے کے بعد آج ہی ذرا پرسکون ہوئی تھی اور اس کا چہرہ اس بات کی گواہی دے رہا تھا۔ میڈم تہینہ نے گھور کر اسے دیکھا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ باہر جانے سے پہلے مجھے بتا کر جانا۔ ایک بار کی بات تمہیں بھی سمجھ نہیں آتی؟" وہ ناراضی بھرے لہجے میں گلہ کر رہی تھیں۔

"میں نے آپ کو تلاش کیا تھا لیکن آپ شاید کہیں گئی ہوئی تھیں۔" اس نے ابھی بھی محل کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ جس کیفیت سے گزر رہی تھی اس میں اسے سب سے زیادہ انہی کی ضرورت تھی اور وہ

اس کا خیال رکھ بھی رہی تھیں لیکن وہ اس کی جانب سے مشکوک بھی رہتی تھیں۔ "میں کہاں گئی ہوئی تھی۔ میں تو کہیں جاتی ہی نہیں ہوں۔ تمہاری وجہ سے سارا دن گھر میں رہتی ہوں کہ میری بیٹی کو آج کل میری سب سے زیادہ ضرورت ہے جبکہ تم۔۔۔۔۔" انہوں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی پھر آنکھیں پکڑ کر اسے دیکھا۔ "اسی کم بخت سے ملنے کی تھی نا۔" انہوں نے جتاتے ہوئے اسی انداز میں شکوہ کیا تھا۔

زرمین نے ان کا چہرہ دیکھا۔ اس سے جھوٹ نہیں بولا گیا تھا اور اس کی نمی کو اس کے چہرے سے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ جو کچھ رہی ہیں وہی حقیقت ہے۔ ان کے چہرے پر پھیلے تناؤ میں مزید اضافہ ہوا۔ "واقعی؟ ہیں زرمین؟ اسی کہنے سے مل کر آئی ہو؟" وہ حیران و پریشان اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ وہ ابھی بھی خواہش کے باوجود کچھ بولنا مانی تھی۔ ان سے بھی کس بنیاد پر بحث کرنی۔ اگرچہ آتش نے تسلی دی تھی لیکن وہ اپنا تصور سمجھنے اور تسلیم کرنے کو تیار نا تھا نا ہی زرمین اسے یہ بات سمجھا پارہی تھی کہ اس کے والد کا پیش اس کے لیے بے حد تنگ آ رہا تھا۔ وہ ایک درزی گھرانے کی بہو کس طرح جن سکتی تھی۔ وہ تو اپنی اُن کمزری تفحیک کرنے میں سب سے آگے رہتی تھی جن کی شادیاں الگ گھرانوں میں ہوئی تھیں۔ اسی لاؤنج میں بیٹھ کر جانے کس کس کا کس کس بات پر مذاق اڑاتی رہی تھیں دونوں ماں بیٹی۔ اپنا جاہ جلال، حسب نسب انگلیوں پر بکنا کرنا کرتھوں کی مٹی اسی لاؤنج میں بیٹھ کر پلید کرتی آتی تھیں وہ۔

فلاں قصائی کا بیٹا۔ فلاں دھونی کا۔ فلاں نے جولاہوں میں بیٹی دے دی اور فلاں کہاروں کے یہاں مٹی مٹی ہوئی جا رہی ہے۔ سر اٹھا کر، گردن خم کر ایسی باتوں پر جانے کتنے لوگوں کی بے عزتی کرتی رہتی تھیں وہ۔ زرمین کو تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میڈم تہینہ نے سر پیٹ لیا تھا "زرمین! تجھے کب عقل آئے گی۔ کب تو سمجھے

گی کہ تیری ماں تیری دشمن نہیں ہے۔ چھوڑ دے اس کا پیچھا۔ کچھ ہاتھ نہیں آنے والا تیرے۔ کیوں نہیں سمجھتی تو۔۔۔۔۔ وہ کنگلا ہی نہیں کی (کم ذات) بھی ہے اور اوپر سے شکل بھی اچھی ہے چھوہندری۔ وہ جو چار میسے کھائے گا نا۔ وہ بھی اپنی کریموں لوشنوں میں ضائع کر دیا کرے گا۔ چلو روپے پیسے کی پھر بھی خیر ہے۔ جو میرا ہے، وہ بھی تیرا ہی ہے۔ پورا کرنی رہوں گی تیرا۔۔۔۔۔ لیکن خاندان والوں کو کیا منہ دکھائے گی۔ کیسے سامنا کرے گی ان کا۔ کیسے برداشت کرے گی ان کے طعنے۔ وہ تو بائیس سانسنا کر تیرا جینا دو بھر کر دیں گے۔ زرمین، تیرے تائے چاہے کی بیٹیوں نے ہی طعنے دے دے مار دینا ہے تجھے اور پھر وہ تیری خال جواتے چاؤ سے اپنے دہور کا رشتہ لاتی تھی۔ اس دو ٹکے کے درزی کی اولاد کو دیکھ کر اس کی تو نظر ہی ہی چکا کھا جائیں گی تجھے۔ کیسے برداشت کرے گی۔" وہ تودہ بانیاں دینے لگی تھیں۔

زرمین نے ان سب باتوں پر پہلے ہی کافی سوچ بچار کی ہوئی تھی اور سوچ سوچ کر ہی اس کی یہ حالت ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے آگے کتواں تھا تو تجھے بھی کھاٹی نہیں تھی بلکہ کھائیاں تھیں۔ وہ پھوٹ کر روٹنے لگی تھی۔ میڈم تہینہ اپنی جگہ چھوڑ کر اُپل کر اس کے قریب آئیں۔ وہ ناراض تو تھیں اس سے لیکن اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کی آہ و زاریاں بھی برداشت نا ہوئی تھیں ان سے۔

"ہا۔ میری بیٹی اروتی کیوں ہو۔ رونے سے ایسا ہو جائے گا۔ مت رو میری جان!" وہ اس کا سر اپنے کندھے سے لگا کر اسے پکڑ کرنے لگی تھیں۔ زرمین اتنی ہی تسلی پا کر مزید رونے لگی تھی۔ اس کے آنسو گھسنے کا نام ہی نا لیتے تھے۔

"میں ہوں نا میری بیٹی! میں سنبھال لوں گی سب۔ دُخ کر اس کنکھ کو۔ اچھا ہوا جان چھوٹ گئی۔" انہوں نے اس کی پشت چھو تھائی تھی۔ "مہی! میں کیا کروں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا ایسا۔ اب کیا کروں گی

میں۔ میں نہیں رہ سکتی اس کے بغیر۔ مرنے والی ہوں گی! اور یہ بھی کیسے برداشت کروں کہ وہ درزی کا بیٹا ہے۔ دماغ پھٹ جائے گا میرا مہی۔ پلیز کوئی سلوشن نکالیں مہی۔" اس نے ہچکچاہٹ لیتے ہوئے کہا تھا۔ میڈم تہینہ کی پیشانی پر تیریاں بڑھ گئیں "لے لی منہ اس اندھے عشق کا۔" انہوں نے منہ بگاڑ کر خود سے کہا تھا۔ زرمین کی تو ایسی حالت ہی تھی کہ اسے مزید کچھ کہا جاتا۔ وہ بس اس کی پشت چھو تھاتے ہوئے آتش اور اس کے خاندان کو کوٹنے لگی تھیں۔

☆☆☆

"میں سمجھ رہی تھی کہ تم آج کل بس جگجگت سنگھ کی غزلیں سن سن کر دقت گزارتے ہو گے" سونیا نے پکڑ دوں اور کچھ اپ والی ٹڑے اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا تھا۔ اس میں دو چائے کے کپ بھی موجود تھے۔ آتش کے چہرے کے تاثرات بالکل نارمل تھے۔ اپنی اسی کی توقع کے برعکس وہ غم بھانکتا ہوا تو بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ دو فلور کشن اپنے نیچے اور دو پشت پر نکائے وہ لی وی پر یکم لگائے بیٹھا تھا اور مسلسل اسی میں مگن تھا۔ کمرے میں کوئی وحشیانہ قسم کا چکنا چکی رچ رہا تھا جس کی سونیا کو بالکل سمجھ نا آتی تھی۔ اسی لیے اس نے مذاق میں کہہ دیا تھا۔

"جگجگت سنگھ کی غزلیں سنیں میرے دشمن۔" اسے ہاتھ کے اشارے سے دائیں جانب بڑے سنگھل کاؤچ پر بیٹھنے کی دعوت دیتے ہوئے وہ سخت سے بولا تھا۔

"تمہارا مطلب زرمین کی مدد؟" سونیا نے جڑانے کو کہا تھا اور وہ چوچھی گیا۔ چہرے کے تاثرات ناگوار ہو گئے تھے۔

"دیکھو چارٹ دس ایچ۔ میرا موڈ بہت اچھا ہے۔ لیکن اگر تمہیں گوارا نہیں تو وہ دروازہ ہے۔ سڑی ہوئی باتیں کرنے سے بہتر ہے اس دروازے کو استعمال کر لو۔ باقی تم خود سمجھ دار ہو۔" سونیا کچھ کہنا جاتی تھی لیکن اسے ہنسی آ گئی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اسے اب آتش کے

خواب پہاڑوں سے اونچے دیکھتی تھی۔ اس کے دل میں گدگد سی سی ہوتی تو کہہ اٹھا۔

"سیرجی پر چڑھنا بھی سیکھ لینا کیونکہ گھوڑے پر چڑھنے سے پہلے نہیں سیرجی پر چڑھنا پڑے گا۔" وہ شرارتی انداز میں کہہ رہا تھا۔ ایک دفعہ پھر اس کے چھوٹے قدر پر چوٹ کی تھی۔ سونیا مسکرائی تک نہیں لیکن چہرے پر پھیلا استحکام مزید وسیع ہو گیا۔

"تم نے بھی اونٹ کی سواری کی ہے؟" وہ اس کے جیلے کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی پھر مزید بولی۔

"جب اونٹ پر سواری کرنی ہوتی ہے تو سیرجی نہیں لگائی جاتی بلکہ اونٹ کو سیدھا لیا جاتا ہے۔ اونٹ جب دیکھتا ہے کہ کوئی اس پر سوار ہونا چاہتا ہے تو وہ نیچے جھک کر یہ موقع فراہم کرتا ہے اور پہلے خود زمین پر بیٹھ جاتا ہے تاکہ سوار ہونے کا خواہش مند آسانی سے سوار ہو سکے۔ سمجھ رہے ہو میری بات۔" وہ اس سے ایک اور سوال کر رہی تھی۔ وہ کچھ نہیں سمجھا۔ سونیا کی آنکھوں میں عزم مزید گہرا ہو گیا تھا۔ اتنا گہرا کہ آتش کو اپنے چہرے پر اس کی پیش محسوس ہوتی۔

"تم میری فکر مت کرو آتش! مجھے گھوڑے کو اونٹ اور اونٹ کو گھوڑا پہنانا آتا ہے۔ وقت آنے دو میں اپنے گھوڑے کو اونٹ بنا لوں گی۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ آتش اس عزم کا مقابلہ تو نہیں کر سکتا تھا لیکن ایک چیز تھی جس میں وہ بہر حال وہ سونیا سے بہتر تھا، باتیں بنانا اسے خوب آتی تھیں۔

"اوغھہ! وہ دن ڈبا۔ جدوں گھوڑی چڑھیا گہا۔ (وہ دن بھی نہیں آئے گا جب یہ خواب پورے ہوں گے)" اس نے آخری پکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔

☆☆☆

"ماما تم سے ملنا چاہتی ہیں آتش!" زرمین نے اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے جھک کر کہا تھا۔ اسے پتا تھا کہ وہ فوراً انکار کر دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔

"زبے نصیب! پتاؤ کب ملنا چاہتی ہیں، ویسے بھی کافی دن ہو گئے کوئی مزاحیہ سووی نہیں دیکھی۔ مزا آئے گا۔" وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے اطمینان سے بولا تھا۔

انہوں نے باری کیو کا آرڈر دے رکھا تھا اور گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کر رہے تھے۔ زرمین کے کال کر کے ذرا ایک ساتھ کرنے کی پیش کش سے ہی وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ کوئی اہم بات کرنے کا ارادہ رکھتی ہوگی۔ اسے یہ بھی لگتا تھا کہ وہ اسے دوبارہ سے اپنی کمی سے ملنے کے لیے مجبور کرے گی، اس لیے وہ مکمل تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب کی بار وہ اس کی کمی سے ملنے وقت خود کو پرسکون رکھے گا اور ان سے بدگیزی نہیں کرے گا۔ اسے اس بات کا بہت حوصلہ اور اطمینان تھا کہ زرمین کا وہ اس کی طرف تھا۔ وہ کچھ بھی کہہ نہیں سکتی۔ زرمین اسی کا ساتھ دینے والی تھی اور اس امر نے اس کے اعتماد میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔

"تم ایسے کیوں ہوا آتش؟" وہ اس کے انداز پر الجھ کر بولی تھی۔ آتش نے کندھے اچکائے۔

"یہ بات تو مجھے بھی حیران کرتی ہے لیکن بچپن سے ہی ایسا ہوں۔ چنڈم اسمارٹ، دل موہ لینے والا، نیندیں چرا لینے والا۔" وہ نہایت سنجیدگی سے بولا تھا۔ زرمین کو اس کا انداز بالکل اچھا لگا تھا۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ صورت حال اتنی پیچیدہ ہے۔ اس کی راتوں کی نیند اڑی ہوئی تھی جبکہ وہ ہنستا ٹھٹھکا تاروتا زہ اس کے سامنے بیٹھا ٹھنڈے لگا رہا تھا۔

"آتش خدا را میریس ہو جاؤ۔ صورت حال کو سمجھو۔ ہر معاملے میں نان سیریس نہیں (غیر سنجیدگی) اچھی نہیں ہوتی۔" وہ ناراض سے لہجے میں بولی تھی۔

"اچھا جی۔ فرماتے کیا کروں۔ دوپٹا لے کر

مصلے پر بیٹھ جاؤں؟" وہ جی اسی انداز میں بولا تھا۔ اس کا مقصد صرف زرمین کو چوانا تھا تاکہ وہ ہنس دے اور اس کے اعصاب کچھ دیر کو پرسکون ہو جائیں۔ وہ واقعی بہت پریشان لگ رہی تھی۔ اس کا چہرہ آج بھی سادہ تھا حالانکہ یونیورسٹی میں وہ بھی پتا

میک اپ کے نہیں آتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے چلتے نمایاں تھے اور ایک عجیب سی ویرانی اس کی آنکھوں میں نمایاں تھی۔ زرمین نے چند ساتیں اس کا چہرہ دیکھا پھر اس کے گال پر دو آنسو لڑھکے تھے۔ آتش نے چونک کر اسے دیکھا۔

"مائی گاڈ۔ رونے لگی ہو؟" وہ اب اس کی جانب مڑ چکا تھا۔ زرمین کے گالوں پر مزید کئی آنسو لڑھک کر اس کی گود میں پڑے ہاتھوں پر گرے تھے۔ آتش کی آنکھوں نے اس کی آنکھوں سے گالوں اور پھر ہاتھوں تک کا سفر کیا تھا۔

"اچھا آئی ایم سو ری۔ چپ ہو جانا ہوں میں۔ میرے چپ ہونے سے تمام مسائل حل ہو جائیں گے تو چپ ہو جانا ہوں میں۔" وہ نرم سے لہجے میں بولا تھا۔ آنکھوں میں تاسف چمکنے لگا تھا۔ زرمین اس کی وجہ سے کبھی روئے گی، یہ تو سوچا بھی تھا۔ آتش اس نے۔ زرمین چپ نہیں ہوئی تھی۔ اس کے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ آتش نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا پھر اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

"اس دن تمہاری کمی کے الفاظ نے دل چیر کر رکھ دیا تھا میرا۔ آج تمہارے آنسو بھی یہی کام کر رہے ہیں۔ چیر بھاڑ کا اتنا شوق ہے تم کو لوگوں کو۔ مجھے تو یقین ہو چلا ہے کہ تم لوگ بھی قصائی ہو۔ لیکن مجھے پھر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ میرا تعلق ایک باشعور گھرانے سے ہے۔ ہم کسی کو خود سے کمتر نہیں سمجھتے۔ تاہی ہمارے یہاں اس قسم کی فضول سوچ کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اس لیے میں دل دجان سے تمہارے ساتھ ساری زندگی بلی خوش گزارنے کو تیار ہوں۔" اس کا تسلی دینے کا بھی اپنا ہی انداز تھا۔

زرمین کے آنسو مزید تیزی سے بہنے لگے تھے۔

"کہہ تو رہا ہوں سو ری۔ کیوں کر رہی ہو اب۔" وہ بالا آخر زچ سا ہو کر بولا تھا۔ دل ہی دل میں آنسو بھی ہو رہا تھا۔ زرمین نے تھیلی کی پشت سے آنکھیں ساف کیں اور اس کی جانب دیکھا۔ سیاہ شلوار قمیض پہنے وہ بے حد فریٹ لگ رہا تھا جبکہ اس کی اپنی حالت بالکل

خراب ہو چکی تھی۔ اسے اپنا کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ اس بار وہ اپنی مٹی سے عمل مشورہ کر کے اس سے مل رہی تھی اور توقع کر رہی تھی کہ آتش اس کی باتوں کو غیر اہم سمجھتے ہوئے لا پرواہی بنا رہے۔ وہ اس سارے مسئلے کا ایک درمیانی حل ڈھونڈ کر لائی تھی اور چاہتی تھی کہ آتش اس حل کو قبول کرتے ہوئے اس کی کمی سے مل لے۔

"آتش! میں واقعی تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔ تمہیں پانچ سو گلی، یہ سوچ کر ہی میری جان ٹنگنے لگی ہے، سانس رکھنے لگی ہے۔ میں تمہارے علاوہ کسی کو قبول نہیں کر سکتی۔" وہ ایک بار پھر گلو گلو لہجے میں بولی تھی۔ اس بار آتش کو مزید شرمندگی ہوئی۔ وہ اپنے آپ کو نابل خاطر کرنے کے لیے یہ سب کر رہا تھا لیکن اس کی تدبیر اپنی ہو گئی تھی۔ زرمین کے اس دو جہ خدشات نے اس کے دل کو بھی بے چین کر ڈالا تھا۔ وہ اس قدر پریشان تھی اور وہ تسلی دینے کے بجائے غیر بنجیدہ گفتگو میں وقت ضائع کر رہا تھا۔

"ارے یار! ایسا کیوں سوچتی ہو۔ کیوں نہیں پاسکو گی تم مجھے بلکہ تم مجھے پا چکی ہو۔ میں تمہارا ہوں اور تمہارا ہی رہوں گا۔ تم میری نگرمت کرو اور تم اتنا پریشان مت ہو۔ ہمارے پیرنس بے وقوف نہیں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، غلط فہمیاں تو سب خاندانوں میں ہوتی رہتی ہیں پھر وہ دور ہو جاتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔" اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ زرمین نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تمہارے پیرنس مان جائیں گے نا؟" آتش نے کچھ حیران ہو کر اس کا چہرہ دیکھا۔ زرمین کے ہاتھ ابھی اس کے ہاتھ میں تھے۔

"میرے پیرنس مانے ہوئے ہی ہیں۔ اسی لیے تو تمہارے گھر آئے تھے۔ کھڑاک تو تمہاری کمی نے ڈالا ہے۔ تم بتاؤ وہ مان جائیں گی۔" زرمین نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ پھڑکایا تھا۔

"آتش! مٹی تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ بات کرتا چاہتی ہیں۔ ان کے کچھ خدشات ہیں۔ وہ تم سے اس متعلق بات کرنا چاہتی ہیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں

دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ انتہا نے کندھے اچکائے
 "ہاں تو ٹھیک ہے۔ کہہ تو رہا ہوں کہ کل لوں
 گا۔ ایک بار پھر کل لوں گا۔ اگر تمہیں بار بار ان کے
 ہاتھوں میرا ذلیل ہونا اچھا لگتا ہے تو یہ بھی کر لوں گا۔
 کیونکہ تمہاری خاطر تو کچھ بھی کر سکتا ہوں میں۔
 کالے پانی میں اتر سکتا ہوں، کرلیے جھنڈی تک کھا
 سکتا ہوں، اسے انیس بائیس کو توڑ سکتا ہوں۔ بی او نے
 اور ایڈمیل کے گمانے سننا چھوڑ سکتا ہوں اور تباؤ، حکم
 کردہ بندہ حاضر ہے۔" اس نے سڑک چھاپ
 عاشقوں کی طرح بات مکمل کی تھی۔ زرمینا اس کا چہرہ
 دیکھ رہی تھی اور مسکرائی تک نا تھی۔ اس نے دھیرے
 سے اپنا ہاتھ چھوڑ لیا تھا۔ انتہا کی نگاہوں میں استہتمام
 تاثر بڑھ رہا تھا۔ وہ مزید اس کی جانب مڑی اور بولی۔
 "اپنے ویڈیوس کچھوڑ سکتے ہو؟" انتہا سارکت
 رہ گیا تھا۔

"چل اے۔ مکھل پیری۔ اب تم سے ڈروں گا میں۔" انٹش نے دھبی آواز میں کہتے ہوئے ایک بار چمرا سے منہ چولایا اور پھر با آواز بلند بولا۔

"ای! میں باہر جا رہا۔ اختتام کے ساتھ ڈر کر لے آؤں گا۔ اس مکھل پیری کو ساتھ لے جاؤں؟"

یہاں تک کہہ کر اس نے آواز کو دوبارہ دھیمایا تھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

لیکن سویا کو حیرت ہوئی۔ وہ بالکل بھی ناچوکا تھا۔
سویا اس کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ وہ میسر کی گرل
کے قریب کھڑا سر پرٹ جلائے کھڑا تھا۔

☆ ☆ ☆
"زور میں آگئی؟" میڈم تہینہ نے گھر میں داخل ہوتے ہی بیٹی کے متعلق پوچھا تھا۔ پٹھان چوکیدار نے سر ہلایا۔ انہیں اطمینان ہو گیا تھا۔ لاؤنج میں آکر انہوں

نے اپنے شوہر کی جانب دیکھا تھا۔ وہ دونوں ایک ڈر میں مدعو تھے اور کافی تاخیر سے واپس آئے تھے۔

"آپ چلیں۔ میں ذرا زمین کو دیکھ کر آتی ہوں۔" انہوں نے کہا تھا پھر ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر تیز چل کر قدم اٹھائی وہ زمین کے کمرے کی جانب چل دی تھیں۔ انہیں بہت بے چینی لاحق تھی۔ انہوں نے ڈر کے دوران بھی اسے کال کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے کال یک نہیں کی تھی۔ وہ اس کے لیے پریشان تھیں۔ یہ لڑکی ان کی توقع سے زیادہ ضدی ثابت ہو رہی تھی۔ اسی کی خاطر انہوں نے ایک درمیانی راستہ نکالا تھا ورنہ وہ لڑکا تو انہیں ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ زمین اس سے ملنے والی تھی یہ تو پتا تھا انہیں لیکن اس ملاقات کا نتیجہ کیا نکلا تھا اس بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھیں۔ تیز تیز قدم اٹھاتیں وہ بیٹی کے کمرے تک پہنچی تھیں۔ اس کا کمرہ لاکھ تھا۔ انہوں نے دستک دی تھی لیکن اندر سے کوئی آواز سنائی نہ دی۔ ان کا دل لرزنے لگا تھا۔ زمین اس لڑکے کی محبت میں جتنی باطل نظر آ رہی تھی اس سے بعید تھا کہ وہ اپنے ساتھ کچھ کر رہی تھیں۔ وہ مزید پریشان ہو گئی تھیں۔ انہوں نے دروازہ دھڑ دھڑاٹا تھا پھر بھی کوئی جنبش سنائی نہ دی تھی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی؟" سونیا نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پریشان کن لہجے میں کہا تھا۔ وہ گرم صم سا تھا۔ اس نے اس کی جانب نہیں دیکھا تھا لیکن سونیا کو اس کے چہرے کے تاثرات گہڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔

"کیا لوگ یہاں سے جانے کے؟ کہہ تو رہا ہوں سب ٹھیک ہے۔" وہ ناک پر چھا کر بولا تھا۔ سونیا چند لمحے پھر اسی کی جانب دیکھتی رہی۔ اس کے اپنے دل میں جب کشش چل رہی تھی۔ دل کہہ رہا تھا کہ کچھ دیر یہاں بیٹھی رہے اور اپنے اس بدو ماغ کزن کو تسلی دے لے جبکہ دماغ کہہ رہا تھا کہ پرانے بچہ سے میں ناگ اڑانے کی ضرورت کیا ہے۔

"جانی کیوں نہیں ہو۔ جاؤ۔۔۔ کیا مصیبت

ہے انسان اپنے ہی گھر میں دو گھڑی سکون سے اکیلا نہیں بیٹھ سکتا۔" وہ پہلے سے زیادہ بدتمیزی سے بولا تھا۔ سونیا جھکے سے اپنی جگہ سے اٹھی۔

"تمہارے ساتھ جو بھی ہوا، اب مجھے اس پر ذرا بھی افسوس نہیں ہے۔ تمہارے ساتھ بھی ہوتا چاہیے تھا۔ تم اسی کے متعلق ہو۔" وہ بھی اسی کے انداز میں بولی پھر دھپ دھپ کرتی سیرجیوں کی جانب بڑھی تھی۔

"مجھے پتا تھا تم یہی کہو گی کیونکہ تمہاری بد دعاؤں کی وجہ سے ہی ہوا ہے یہ سب۔" اچھا بھلا سب ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ تمہارے قدم جس دن سے اس گھر میں پڑے ہیں، اسی دن سے کچھ نا کچھ برا ہی ہو رہا ہے۔" وہ اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے چلا کر بولا تھا۔ سونیا سیرجیاں اترنے ہی والی تھی، اس طےنے کو سن کر اس کا دماغ بھک سے اڑا تھا۔ وہ مزہ کر آتی تھی۔

"بد دعاؤں کے بیچے امیری وجہ سے سب ٹھیک ہونے والا تھا۔ میں نے تمہاری امی کو راضی کیا۔ سارا الزام اپنے سر لیا، جھوٹ بولا کہ میں کسی کو پسند کرتی ہوں اور تم کہتے ہو کہ میری بد دعاؤں کی وجہ سے ہوا یہ سب۔" وہ غرا کر بولی تھی۔ آتش کا مزاج مزید بگڑ گیا۔

"جھوٹ سچ تو تم نے بول رکھے تھے اس زمین سے۔ کیوں ظاہر کر رہا تھا اس کے سامنے کہ تم کسی نواب کی اولاد ہو۔ کیوں نہیں بتایا تھا اس کو کہ تم ایک ٹیلر ماسٹر کے بیٹے ہو۔ کیوں غلط بیانی کی تھی اس سے؟" سونیا اس کو بولنے کا موقع دیے بغیر مزید بولی تھی۔ وہ سامنے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتیں سن کر اس نے مزہ کر اس کی جانب دیکھا۔ سونیا کا خیال تھا کہ وہ اب کوئی سخت بات تو ضرور کہہ ڈالے گا لیکن وہ دوبارہ سے سامنے دیکھنے لگا تھا۔

"میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ میں نے اس سے فطرت نہیں کیا تھا، محبت کی تھی اور محبت میں جھوٹ کی محتاجش نہیں ہوا کرتی۔" اب کی بار وہ محکم

لہجے میں بولا تھا۔ اس کا انداز اتنا ٹوٹا ہوا تھا کہ سونیا پند لے کچھ بول ہی نہیں سکی پھر جیسے اسے اس شخص پر ترس آیا تھا۔ وہ دوبارہ دو قدم چلی اور پھر اس کے پاس جا گھڑی ہوئی۔

"آتش! چلو جاؤ اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ ابھی یہ سب بات کرنے کا وقت نہیں ہے۔ صبح کو اس موضوع پر اطمینان سے بات کریں گے اور کوئی حل نکال لیں گے۔ فی الوقت یہاں کھڑے ہو کر جلنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" وہ تسلی دینے والے انداز میں بولی تھی۔ اس کا اشارہ اس کے سر پر پھونکنے کی طرف تھا۔ آتش نے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔

"اب کسی بھی چیز کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ جل جاؤں یا مر جاؤں۔ سب ایک برابر ہے۔ ختم ہو گیا ہے سب۔" وہ کسی اور ہی کیفیت میں تھا۔ سونیا راج ہوئی۔ اسے لوگوں کے ایسے انداز سے ہمیشہ ہی اچھن ہوتی تھی جس میں مایوس ہو کر لوگ مرنے مارنے کی باتیں کرتے لگیں۔

"سب کچھ کبھی ختم نہیں ہوا کرتا۔ کچھ نا کچھ ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ قدرت امید جگائے رکھنے کے لیے کچھ نا کچھ ضرور چھوڑ دیتی ہے۔ پھر اسی "کچھ" سے بہار پھوٹ پڑا کرتی ہے۔ کوئی نا کوئی حل نکل آئے گا۔ صبح ہونے دو۔ محل جل کر کر لیں گے کچھ۔" وہ چاہتی تھی کہ وہ ابھی اپنے کمرے میں چلا جائے لیکن وہ اٹھنے کو تیار نہیں تھا۔

"نہیں۔ اب اس معاملے میں کچھ نہیں کرنا۔ یہ چہر کلوزڈ ہو گیا ہے۔ مجھے ابھی یا کل بھی اس معاملے میں کچھ نہیں کرنا۔ میں اپنے پیرس کو نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ سونیا نے اس کے جملے سے کچھ اخذ کرنے کی کوشش کی تھی۔ بات کچھ کچھ تو سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ اس کے مزید قریب ہوئی تھی حالانکہ غصہ تھا کہ اگر مرمانی یا ماسٹر جی میں سے کوئی اٹھ گیا اور باتوں کی آوازیں سن کر ادھر آ گیا تو اچھا نہیں ہوگا لیکن پھر بھی وہ رسک لے رہی تھی۔

"زمین نے تم سے کہا۔ وہ چاہتی ہے کہ تم اپنے پیرس کو چھوڑ دو۔" وہ پوچھ رہی تھی۔ آتش نے اس کی جانب دیکھا پھر ٹپکی میں سر ہلایا۔ سونیا نے چو کر اسے دیکھا۔ وہ بات مکمل کرنے میں کس قدر تاخیر سے کام لے رہا تھا۔

"تو پھر۔۔۔؟"

"وہ اتنی خود غرض نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کی ماں یہی چاہتی ہے اور وہ اپنی ماں کی زبان بول رہی تھی۔ ورنہ اتنے آرام سے اتنی بڑی بات بھی نا کہتی۔" وہ ایک بار پھر جیسے اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا تھا۔ "آتش! میری بات سنو۔ تم یہاں بیٹھو۔ مجھے بتاؤ تفصیل سے کیا بات ہوئی ہے تمہاری زمین سے۔" وہ اسے ایک جانب بڑی چارپائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی تھی۔ آتش اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔ وہ جیسے خود گھائی میں گن تھا۔

"زمین چاہتی ہے میں اور وہ آسٹریلیا چلے جائیں۔ اس کے پیرس نہیں اسپانسر کر دیں گے۔ ہم وہاں جائیں اور وہاں جا کر شادی کریں۔ پانچ سات سال دو ہیں رہے تا کہ اس کے خاندان والوں کو یہ تاثر دیا جاسکے کہ زمین نے وہاں آسٹریلیا میں کسی ایسے وائے زبرد کے سے شادی کر لی ہے۔ یہ سب قبول ہے اسے لیکن وہ یہ نہیں چاہتی کہ میری اور اس کی شادی کے بارے میں ابتدا میں کسی کو پتا چلے۔ اس کے خاندان والے کسی ٹیلر ماسٹر کے بیٹے سے شادی پر اس کا مذاق اڑائیں گے اور وہ یہ بات برداشت نہیں کر سکے گی۔ چند سال گزر جائیں گے تو بات پرانی ہو جائے گی اور پھر ہم واپس آ جائیں گے۔ وہ کہتی ہے پانچ سات سال تو بس یوں ہی گزر جائیں گے۔ پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"تم نے کیا جواب دیا؟" سونیا نے سوال کیا تھا جیسے اسے ساری بات جاننے کی بے چینی ہو۔ آتش کی گفتگو میں غیر ضروری وقفے اسے بچھ رہے تھے۔ آتش نے مزہ کر اسے دیکھا۔

"پانچ سات سال ایسے ہی گزر جاتے ہیں

دل و عشق



بات نہیں ہے۔ میں اس کو اپنے لیے اعز از سمجھتا ہوں جس سے میں بھی سبکدوش نہیں ہونا چاہوں گا۔ میں ساری زندگی اس بات کو تحفے کی طرح سینے پر سجا کر رکھوں گا کہ میرا باپ ایک درزی ہے۔ میں تو پانچ سات سات اس بات کو نہیں بخلا سکتا اور وہ پانچ سات سال کا کہہ رہی ہے۔ تمہیں پتا ہے سونیا۔" وہ اب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"میرے بیٹے جیسے بیٹے کو بھی کتنے فخر سے اون کرتے ہیں۔ جس نے ابھی تک ان کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ اتنے سال ہو گئے صرف ان سے لے ہی رہا ہوں۔ دیے کا تو سوچا بھی نہیں سچی اور اسی بیٹے کی کمائی سے کھایا پیا ہے۔ اوڑھا پہنا ہے۔ تعلیم حاصل کی ہے۔ زندگی کی ہر نعمت کو انجوائے کیا ہے۔ یہ جو سرائی کر غرور سے گردن اڑا کر کہتا ہوں نا۔ اتش ہوں میں۔ سب جتنا ہے مجھ پر۔ یہ سب اسی لیے جتنا ہے مجھ پر کہ میرے باپ نے خلال کی کمائی سے جو بھی حاصل کیا۔ مجھ کو بخت رنگا دیا اور بھی جتنا بھی نہیں۔ اسی نوک و پستی ہیں اکثر لیکن ماسٹر جی نے تو بھی کچھ بھی نہیں کہا۔ سچی کوئی شکوہ بھی نہیں کیا بلکہ ہمیشہ دیا ہی دیا ہے۔ سچی ان کے لیے پانچ روپے کی چٹائی بھی لے آؤں تو اگلے ہی دن پانچ سو روپے دے دیتے ہیں کہ رکھ لے اتش! کام آئیں گے۔ اسی بیٹے نے یہ بہار دکھائی ہے اتش کو اور اتش یہ سب بھول نہیں سکتا سونیا۔ مجھے فخر ہے انے باپ پر۔ ایک میڈم تہیز کی خاطر میں اپنے باپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کیوں چھوڑ دوں۔ اس لیے بہتر ہے کہ زمین کو چھوڑ دیا جائے۔" وہ کرب ناک لہجے میں کہہ رہا تھا۔ سونیا کے پاس الفاظ ہی ختم ہو گئے تھے۔ وہ اسے تسلی کیا دیتی۔

☆☆☆

دوستو! اب اس مقام پر انسان اپنی اولاد کو تسلی دے یا قہے سناتا پھرے اور آپ چاہتے ہیں کہ فائٹ سب آپ کے گوش گزار کر دوں۔ نا بھی۔ اس ماسٹر سے نہیں ہوگا یہ سب، کرو جو کرنا ہے۔

باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

کیا؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ سونیا کو دھچکا سا لگا۔ اس اونچے لیے لڑکے کی آنکھیں پھٹکی پھٹکی سی تھیں۔ جب دل ٹوٹا ہے تو کر چیاں آنکھوں سے باہر نکلا کرتی ہیں۔ وہ رو نہیں رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں چمکتی تھی تاریکی میں بھی نظر آرہی تھی اور باور کر دار ہی تھی کہ دل پر پڑنے والی ضرب بے حد کاری تھی۔

وہ خود کو کسی شہزادے سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ اسے ہمیشہ اپنی ذات پر کیسا غرور رہا تھا۔ وہ اپنی ذات کی نفی برداشت نہیں کرتا تھا آج اسے سمجھ میں آئی تھی کہ دکھ کا ذائقہ ہر ایک کے لیے ایک جیسا ہوتا ہے۔ تلخ اور چھپتا ہوا۔ سونیا سے اگلا سوال نہیں کیا گیا تھا۔

"نہیں گزن! اتنی آسانی سے نہیں گزرتے پانچ سات سال۔ میں پانچ بیجے واپسی کا کہہ کر جاؤں اور پانچ بج کر سات سات پر واپس آؤں تو میری ماں کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہوتی ہیں۔ اتنی سی دیر میں سات چکر گھٹ کے لگا آتی ہیں کہ اگلوں بنا جانے کہاں رہ گیا ہے اور ماسٹر جی! وہ تو گھر آ جانے کے بعد پانچ گھنٹے میں دس بار میرے کمرے میں جھانک کر جاتے ہیں کہ اتش کیا کر رہا ہے۔ اپنے ان ماں باپ کو چھوڑ کر میں زمین کے ساتھ چلا جاؤں جنہوں نے میرے علاوہ کسی کا خواب بھی نہیں دیکھا۔ جن کا جائزنا سونہ میں، جن کا اوڑھنا پچھونا میں، جن کا ہونا اور نا ہونا میں۔ میرے علاوہ تو کسی کے متعلق سوچتے بھی نہیں ہیں وہ۔ میرے علاوہ ان کا ہے کون؟ ان کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ اتنا کمینہ نہیں ہوں میں۔ اولاد ہوں، منڈ پر پریشا کو انہیں ہوں، کھایا پیا اور اڑ گیا۔" وہ نہایت نرم زبان کر بولا تھا۔ سونیا کو اس کا انداز برا نہیں لگا تھا۔ اتش کے لہجے کی ناگواری اس کے لیے نہیں تھی۔ زرین کے لیے تھی۔ وہ تسلی کے لیے الفاظ ہی ڈھونڈ رہی تھی کہ وہ بولا۔

"اسے اعتراض ہے کہ میرا باپ ایک درزی ہے۔ یہ اعتراض تو زندگی بھر ختم نہیں ہوگا کیونکہ میرے لیے میرے باپ کا درزی ہونا کوئی شرم کی

اسد بچن میں ہانڈی بھونٹے ہوئے مصروف انداز میں گنگنا رہا تھا
”تو لیا دے مینوں گولڈن جھکے میں کنناں وچ پاواں چم چم کے“

ساتھ ساتھ لہک بھی رہا تھا۔ جبکہ مناجو صرف نام کا ہی منا تھا بے زاری سے صبح ناشتے میں بننے والے برتنوں کے ڈھیر سے نبرد آزما تھا جبکہ باہر عادل اپنی بائیک کو دھو رہے تھے اسد کے گانے پر باقاعدہ جموم رہا تھا صرف ایک واحد شیری تھا جو آرام سے صحن میں آرامتہ تخت پوش پر گاؤں کیلئے سے ٹیک لگائے میگزین کی ورق گردانی کم اور ٹاپ کلاس ماڈلز کے ہوشی رہا منظر میں زیادہ کم تھا۔

جی دروازے پر زوردار دستک ہوئی تھی۔ سب بیک وقت چونکے تھے کیونکہ گیتی آرا بیگم ابھی ایک گھنٹہ پہلے تو باہر تھیں اور دو جب بھی محلے کے دورے پر نکلتی تھیں تو پھر ہر گھر کی مکمل رپورٹ کے ساتھ ہی نازل ہوتی تھیں یوں بھی دستک کا انداز نا آشنا تھا۔

”جا عادل! دیکھ تو کون ہے؟“ شیری سب سے بڑا تھا اس لیے اس کا انداز بھی اکثر حکم اور نوک ہوا کرتا تھا۔

”میں نہیں جا رہا ہوں مناس مرض کی دوا ہے اس سے کہو۔“ عادل نے برا سامنہ بنا کر کہا تھا۔
”ٹھیک ہے پھر تم آکر برتن دھولو۔“ منا کون سا کم تھا حاضر جوانی تو منار پر ہی ختم تھی۔

قبل اس کے کہ مزید بحث طول پکڑتی شیری نے میز بین ایک جانب باقاعدہ اچھال کر پھینکا تھا اور پاؤں میں چپل اڑس کر مین گیٹ تک آیا تھا۔ اس نے ٹھٹ سے دروازہ کھولا تھا۔ اور کھولتے ساتھ ہی منہ بھی کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

سامنے ہی ایک خوب صورت دھیزرہ کھڑی تھی اس کے ہاتھوں میں ایک ٹرے تھی جسے اس نے ایک کپڑے سے ڈھانپ رکھا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شیری کی ساری توجہ کھانے کی طرف مبذول ہوتی

کہ وہ کھانے کا رستہ تھا اور مفت کے مال پر ٹوٹا اپنا عین فرض سمجھتا تھا مگر یہاں تو کہانی ہی الٹ تھی ساری توجہ اس حینہ نہ جبین کی طرف مبذول تھی جو مسکرا کر اس کے دل پر بجلیاں گرا رہی تھی آج سے قبل کسی لڑکی نے اسے یوں مسکرا کر نہیں دیکھا تھا ہمیشہ وہ ہی دیکھا کرتا تھا اپنے دانتوں کی بھرپور نمائش کے ساتھ۔ وہ اس کا یا پلٹ پر تھیر زدہ بھی تھا اور بے پناہ مسرت محسوس کر رہا تھا۔

”یہ میں بریانی لانی ہوں ہم یہاں نئے نئے شفٹ ہوئے ہیں تو اماں کہنے لگی ہم سے تو کسی نے پوچھا نہیں مگر ہمارا تو فرض بنتا ہے محلے داروں کا خیال رکھیں۔ سامنے سے نہیں بھی۔ کیا سیسہ پلائی دیوار بن کرتی گئے ہیں۔“ اس لڑکی کی جرب زبانی دیکھ کر وہ حواس باختہ سا ایک جانب ہو گیا تھا۔

وہ سیدھا اندر کھینچ چلی گئی تھی سامنے ہی صحن پانی سے بھرا ہوا تھا اور اس کے عین سامنے ہی بچن تھا جہاں سے برتنوں کی کھنک دار آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

”گھر میں کوئی عورت نہیں ہے کیا؟“ اس نے اپنی گول گول آنکھیں گھما کر اطراف کا طائرانہ جائزہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

”جی اماں باہر گئی ہیں۔“ عادل نے جھٹ سے اس لڑکی کو جواب دیتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا اس لڑکی نے بھی اب عادل کی طرف دیکھا تھا۔ شیری جو اس لڑکی کے ساتھ محبت بھرا ایک طویل سفر سوچ ہی سوچ میں ملے کر چکا تھا اس طرح عادل کی دخل اندازی پر سخت بد مزہ ہوا تھا۔

”جی پھر یہ آپ ہی لے لیں میں پھر آ جاؤں گی برتن لینے، دیے یہ سامنے والا گھر ہمارا ہی ہے وہ نیلا رنگ کا گیٹ۔“ وہ ادائے دلبری سے بولتی وہاں سے چل دی تھی اور عادل اور شیری جیسے سکتے سے باہر نکلے تھے۔

اور شیری نے عادل سے ٹرے چھین لی تھی باقاعدہ طور پر اور بریانی برٹوٹ پڑا تھا۔ بریانی واقعی بے حد لذیذ تھی، وہ بریانی کھاتے ہوئے مسلسل اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

”بڑے بے مروت ہو، تھوڑی سی مجھے بھی دے دو۔“ عادل نے لچائی نظروں سے کہا تھا تو شیری نے بڑا سا ڈکار مارتے ہوئے وہ بریانی کی پلٹ اور ٹرے عادل کی طرف بڑھا دی تھی۔

”کھانے کے بعد یہ دھو دینا اور ہاں آج کچھ اچھا سا پکنا چاہیے پھر میں جا کر کچھ دے کر آؤں گا۔“ شیری کے چہرے پر خوب صورت مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ عادل جو نگاہوں ہی نگاہوں میں اس لڑکی کو اپنا بنانے کی تک دو میں بلکان ہو رہا تھا اس کا موڈ ایک دم سے ہی غراب ہو گیا تھا کیونکہ شیری کے الفاظ سے صاف ظاہر تھا کہ اب وہ اس لڑکی کے ساتھ اپنا معاملہ فٹ کرنے کے چکر میں ہے اس لیے عادل کو چپ کا گڑ کھانا ہوگا۔

☆ ☆ ☆

شیراز احمد، عادل احمد، اسد اور پھر منور احمد یہ چار اولادیں تھیں گیتی آرا بیگم کی۔ ہر مرتبہ بیٹی کی پیدائش کا اربابان دل میں جگائے وہ باقاعدہ بیٹی کی شاپنگ کرتی تھیں مگر ہر مرتبہ ہی صحت مند گول گول ہوتی

سایہ ان کو تھکا دیا جاتا تھا۔ جب قدرت کی طرف سے انہیں بیٹی ملی تو وہ اپنے دل کے ارمان چھوٹے اسد اور منا کو بچپن میں فراک پہنا کر پورے کیا کرتی تھیں اور منا کے بالوں کی تو باقاعدہ طور پر دو دو پونیاں بناتی جاتی تھیں جب تک وہ اسکول جانے کے قائل نہیں ہو گیا اس کے ساتھ یہ سلسلہ جاری و ساری رہا۔ یہی نہیں سب بھائیوں کو کھانے پکانے میں طاق کر دیا تھا۔ گیتی آرا کو کبھی اب عملاً بیٹی کی کمی محسوس نہ ہوتی تھی اگر اسد جھاڑو لگا رہا ہے تو عادل بچن میں چائے بنا رہا ہے منار اکثر برتن دھونے کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ سب سے چھوٹا بھائی تھا اور اماں کا سب سے لاڈلا منا تھا اور خود شیری کی ماہر شیف کی طرح بہترین کھانے بناتا تھا کبھی حکیم تو کبھی کڑا ہی گوشت کبھی فرانی فٹش اور کبھی پلاؤ اس کے ہاتھوں میں واقعی لذت تھی۔

گیتی آرا کی ایک نگاہ جنبش سے سب بے منتوں میں گم کو پکا سنوار دیتے تھے۔ گھر کا کونا کونا چلنے لگانے

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

چلمن دل ایک کلشن دست و پاؤں



ندیم تاجپر کی کہانی



فوزیہ بیگم



رضیہ جمیل



نادرہ خاتون

قیمت - 400 روپے

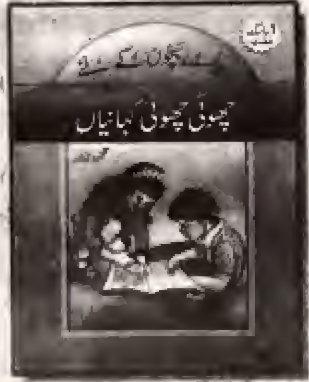
قیمت - 750 روپے

قیمت - 300 روپے

قیمت - 300 روپے

مکتبہ عمران فون نمبر 32735021

پیارے بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

محمود خاور

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں
پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے
آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 1 مارک مفت

قیمت - 300/- روپے

ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

”اے لوبہ نہیں کرتی تو اپنی زویا کس مرض کی
دوا ہے کیا یہ کام نہیں کرتی ہے۔“ لیتی آرا کی بات پر
حائے تک مسک سے تیار زویا نے کسماس کے اپنی جگہ
پہلو بدلا تھا اور نصیرہ بیگم تو باقاعدہ شپٹا کر رہ گئی
تھیں۔ کیسے کہتیں کہ بیٹی تو سارا دن رپورٹنگ میں
ان رہتی ہے جس وقت ساس کی آنکھیں عینک کے
تھک جاتی تھیں بہو کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھ کر
پھر اپنی ماں کی گدی سنبھال لیتی تھی۔

”اے زویا تو منٹوں میں سارے کام بننا لیتی
ہے جاؤ زویا جا کر کچن میں ہمارے لیے پکڑے بنا
اور ساتھ چائے کا پانی بھی رکھ دینا چوبیس پر۔“
نصیرہ بیگم کی بات پر زویا نے ایک خشکیں نگاہ ماں پر
الٹی مٹی جیسے ماں نے سرے سے نظر انداز کر دیا تھا۔
مرئی کیا نہ کرتی کہ مصداق وہ بل کھاتی ندی

لی ماں اندھ کھڑی ہوئی تھی۔ امور خانہ داری سے اس
کی جان جاتی تھی مگر جب سے وہ لوگ آئی تھیں۔
نصیرہ بیگم اس کی اتنی تعریفیں کر چکی تھیں کہ بس اور
بہاں اس کا مظاہرہ دکھانے پر بھی مل گئی تھیں۔

اصل حقیقت حال یہ تھی کہ وہ پچھلے ایک گھنٹہ سے
ماں نشینی ہوئی تھیں مگر کسی نہ جی مروتا بھی کھانے
کا کٹ نہیں پوچھا تھا۔ شیریں اور عادل کی ابھی آفس
دوائی ہی نہیں ہوئی تھی اور مٹائش پڑھنے گیا تھا

نصیرہ بیگم کا آج کرکٹ ٹیم کا بیچ تھا وہ اپنے دوستوں
ساتھ گیا ہوا تھا۔ ایسے میں لیتی آرا بیگم اکیلی تھیں
تھی ان کا خیال تھا کہ دو قدم کا فاصلہ طے کر کے
والی مٹائی کو کیا تو مزاح کرتی پھریں اب۔ مگر

وہ آنے کے بعد واپسی کے لیے جیسے آمادہ ہی نہیں
تھیں۔ اب جبکہ زویا خود ہی کچن کی جانب چل دی
تھی لیتی آرا بیگم کو اسے نوکنا اچھا نہیں لگا تھا۔

ادھر کچن میں کھڑی زویا نگاہیں سے دو جا رہی
تھی پکڑے کے لیے پیاز اور آلو کا شاردع کے
دھواں سارا باہر کی جانب تھا کیونکہ نصیرہ بیگم کی
والی لیتی کسی بھی وقت عود کر سکتی تھی۔
تب ہی دروازے پر آہٹ ہوئی اور شیریں نے

کے دودھ کی چوری بھی پکڑ لیتی تھیں۔ گلاس کو مین
آنکھوں کے سامنے لہراتے یہی سوال پوچھنے لگی تھیں۔
”یہ دودھ کس نے پیا ہے اس گلاس میں۔“ بہو
بیگم بھی ماہر تھیں دودھ کی کرگلاس دھو کر اس کے اصل
ٹھکانے پر رکھنے لگی تھی۔ مگر دینی میں دودھ کم ہوتا تو
سوال ساس صاحبہ کا جوں کا توں قائم و دائم تھا۔ اس کا
بھی حل مریم نے نکال لیا تھا دودھ میں پانی ڈال کر
چلتی بنتی تھی۔ مگر نصیرہ بیگم نے بھی گھاس گھاس کا پانی
پی رکھا تھا سو دودھ کی دینی تخت کے قریب پڑی میز
پر پاس رکھ کر سونے لگی تھیں کہ ملی دودھ میں منہ نہ مار
دے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ بہو کے دل میں
ساس کے لیے نفرت گہری ہوتی چلی گئی تھی۔ مگر گھر
آباد رکھنے کے لیے دلوں کو دیران کرنا پڑتا ہے۔ دل
کی قبر پر ایک شادی شدہ گھر تعمیر ہوتا ہے۔

ان دنوں سب زویا کے رشتے کے لیے بہت
پریشان تھے کیونکہ پورے محلے میں نصیرہ بیگم کی زنانہ
کم مردانہ آواز کی دھوم تھی وہ اپنی پاٹ دار آواز سے
کمر پر ہاتھ رکھے جب طبیعت صاف کرتی تھیں تو
اچھے اچھوں کے ہوش ٹھکانے آ جاتے تھے اس قدر
زبان دراز عورت کی بیٹی سے شادی کرنے پر کسی بھی
بٹنے کی ماں آمادہ نہ تھی۔ کسی عقل والے نے محلہ
تبدیل کرنے کا مشورہ دیا تو فوراً عمل بھی کر ڈالا تھا

یوں نصیرہ بیگم ان کا بیٹا فہد اور بہو مریم کے ساتھ بیٹی
زویا بھی ادھر ہی آ گئے تھے۔ جبکہ عابد صاحب کی
بات کی تو گھر میں کوئی وقعت ہی نہ تھی سارے فیصلے
بالاعی بالا طے کر لیے جاتے تھے۔ اب سب کے دل
میں جہاں زویا کے رشتے کی آس بندھ گئی تھی وہاں
مریم بھی تیز طرار قند ساز نند سے خلاصی کی تمنا کی تھی۔

☆☆☆

”بہن ماشاء اللہ گھر تو جنگل کر رہا ہے تمہارا
ایک ہماری بہو ہیں بھائی ہے جو بنا کہے کام کر لے ہر
ہر کام کے لیے یکار پڑتی رہے تو کام ہوں گے ورنہ
نہیں۔“ نصیرہ بیگم نے طے دل کے پیچھو لے
پھوڑے تھے۔ چہرے کا زوئیہ بھی کچھ بگڑ گیا تھا۔

تھا۔ پھر بھی بنانے کون سی غلطی تھی جو ابھی بھی گیتی آرا
بیگم کے دل میں پچاس بن کر انگ کی تھی۔ ان کا عیب و
دبدبہ تھا۔ سارے بیٹے ان سے ڈرتے تھے چند سال قبل
احمد صاحب کا انتقال ہو گیا تھا اس کے بعد ان بیٹوں نے
ماں کے مطابق زندگی بسر کرنا لازمی قرار کر لیا تھا۔

اس گھر کی شہرت دور دور تک تھی ساری محلے کی
عورتیں تعریف کرتے نہ مٹھتی تھیں کہ لیتی آرا نے
اپنے بیٹوں کی کیا عالیشان تربیت کی ہے مگر ان ہی
خوابین کی بیٹیاں منہ بھر کر ان سب کو دیکھ کر کھی کھی
کرتی تھیں کوئی بھی عملاً اس گھر میں اپنی بیٹی نہ دیتا تھا
جبکہ شیریں اور عادل ہی نہیں اسد بھی اب شادی کے
قابل تھا مگر سب جانتے تھے کہ یہ لڑکے گھر گرہستی
میں تو طاق تھے مگر اپنی اماں کے سامنے بیگم جلی بن
جاتے تھے اور ماں کے سامنے کسی غلط بات سے بھی
انکار کرنے کی جرات و جسارت نہ کر پاتے تھے۔ یہی
وجہ ہے کہ سب اپنی بیٹی یہاں دے تے پچھا پٹ کا شکار
تھے آنکھوں دیکھی بھی کون نگہنا پسند کرتا ہے۔

اس لیے وہ سب مصیبت کا شکار تھے اب اس
لڑکی کو دیکھ کر شیریں کے دل میں کچھ روپکائی کروں
والے خواب تو جاگے تھے مگر ان کو شاید پایہ تکمیل تک
پہنچانے سے پہلے ہی اپنی موت آپ مر جانا تھا۔

☆☆☆

مریم نے ایک ناگوار سی نگاہ اپنی ساس نصیرہ بیگم
پر ڈالی تھی جو اس عمر میں بھی اپنی ہونٹوں کو لال لب
اسٹک سے رنگے کانٹوں میں موتیا کے پھول اڑے
آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے ہولے ہولے مگلتا بھی
رہی تھیں کچھ مگر مریم نے یہ سننے کی کوشش نہیں کی تھی۔
اسے اور بھی بہت سے کام تھے۔ اوپر تلے کے پیشتر کام
بنانے کے علاوہ ساس صاحبہ کی جیسے دار زبانی کی خاطر
کچھ ان کی من پسند پوش بھی بنانی تھی۔

نصیرہ بیگم کو اس عمر میں بھی اللہ اللہ کرنے کے
بجائے صرف بہو بیگم کی ٹوہ لینے کی بری عادت راسخ تھی
بہو کی پکار ہی ہے کیا کھار ہی ہے کیا اوڑھ پہن رکھا ہے۔
اس کی ترجیحات کیا ہیں۔ وہ تو چھپ کر پسے گئے بہو

زوردار سلام جھاڑا تھا اس کا ہاتھ کٹ گیا تھا خون کی
دھاری نکلی تھی۔ وہ چیخ مار کر رہ گئی تھی۔
”کیا ہوا زویا!“

ماں کا تودل ہی دہل گیا تھا۔ جبکہ شیریں قتل اس
کے کہ وہ ہماری بھر کمزور تھی تو قتل کی مالک تھیں اپنا
وجود سنبھالنے اٹھیں وہ چکن کی جانب جہاں سے زویا
کی چیخ سنائی دی تھی لپکا تھا۔
سامنے ہی وہ مدھم مدھم دھنیں نین کنوڑے
آنسوؤں سے لبالب بھرے شکوہ کنال لگے ہوں سے
دیکھ رہی تھی۔ وہ تو ان لگا ہوں کی لہر میں خود کو ڈوبتا
ہوا دیکھ رہا تھا۔

”میں سب کے لیے پکڑے بنانے آئی تھی
اچانک ہی ہاتھ کٹ گیا ہے۔“ وہ مدھم مدھم بولی تھی۔
شیریں نے دیکھا اس کے پاس ہاتھ کی پہلی
انگلی کٹ گئی تھی۔ کٹ کچھ گہرا ہی تھا۔ بھی وہ خاموشی
سے پلٹ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی فرسٹ ایڈ کے
ساتھ نمودار ہوا تھا دم پکڑے سے خون دبا کر اس نے
اسے صاف کیا تھا پھر مرہم لگا کر پٹی کرنے لگا تھا۔
”میرے ہوتے آپ کو کیا ضرورت تھی چکن
میں کام کرنے کی۔“ وہ بے ساختہ اندھے جذبات
کے تحت بولا تھا۔ وہ تھوڑے ہی ایک تک اسے دیکھ کر رہ
گئی تھی۔ محبت نے بیک وقت دونوں کے دروں پر
دستک دی تھی۔ وہ شرماسر جھکا گئی تھی۔

پتی باندھے وہ باہر نکلی تو دونوں خواتین کی جان
میں جان آنی تھی۔ اس کے احوال سے کام کو پھر شیریں
نے کسی ماہر کھنڈ خاتون کی طرح پورے کیے تھے
پکڑے اور بینک کا حلوہ ساتھ میں گرم مارگم بھاپ
اڑاتے جائے کے کپ۔ وہ چھکن سے چور گھر لوٹا تھا
دل میں مقسم ارادہ باندھے کہ سارے کام وہ چھوٹوں
سے کر دے گا مگر یہاں آکر اس کی چھکن جیسے اڑن
چھو ہو گئی تھی۔ جھپٹ پٹ سارے کام کرتا چلا گیا تھا۔
گنتی آرا گھاگ تھیں بیٹے کے بات بے بات کھلتے
لب انہیں اس وقت سخت اشتعال دلا رہے تھے۔ اس
وقت تو گنتی آرا کا غصہ سوانیزے پر پہنچ گیا تھا جب

شیریں نے ان کے کھانے کھانے میں ہی اندر پلاؤ
پر لگا دیا تھا ساتھ فرج میں فریز کیے کباب بھی تھے
صبح رات یہ کھانا تیار کر چکا تھا۔

”آخری میں آپ کو جانے نہیں دوں گا۔ کہ
کھا کر ہی جائے گا۔“
نظر میں ہنوز زویا پر مرکوز تھیں جو اس وقت
شیریں کے ہاتھوں کے بنے ہوئے بے حد لفظ
پکڑوں سے انصاف کرتے ہوئے ساتھ ساتھ
چائے کی چسکیاں بھی لے رہی تھی۔ لگا ہوں کا تصادم
ہوا تو وہ بھر پور جوانی مسکراہٹ لٹائی ہوئی دل سے
کتنے پاس پاس لگ رہی تھی۔ پھر وہ رنگین شام نصیب
تیکم اور زویا کے جانے کے بعد وہ اپنی رنگین ہو گئی تھی
گنتی آرا اپنی چپل سے شیریں کو پتلی اس کی درگاہ
بنائی رہیں اور وہ کسی مجنوں کی مانند عشق میں مارا
ہنس کر کھاتا رہا۔ گنتی آرا تو شاید جان سے ہی
ڈالیں اگر عادل اور اسد آکر صلی صفائی نہ کر دیتے
”میں کہہ دے رہی ہوں سب کی شادیاں میرے
پہنہ سے ہوں گی اس گھر میں شادیانے میری منشا
بہیں گے خیر دارا جو کسی اور نے بھی من مانی کرنے
کو شش بھی کی تو اس کا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔“ سب
شیریں سے دلی ہمدردی تھی اس کے بعد گھر میں
خاموشی چھا گئی تھی۔ شیریں کی نگاہوں سے اس زویا
چہرہ جدا نہ ہوتا تھا ایک پل کے لیے بھی۔

☆☆☆

”کیوں اماں سے ضد لگ رہی ہے۔ رات
کھانا نہیں کھایا صبح ناشتا نہیں کیا اور اب آفس
لوٹے ہو تو پھر کھانا نہیں کھا رہے خود کو اس
کمرے تک مقید کر لیا ہے ایسا کیا طوفان آگیا ہے
اماں کی بات ماننے میں ہی عافیت ہے۔“ جا
اسے ناصحانہ انداز میں سمجھا رہا تھا۔

عقب میں اپنے بیٹے کے دل میں کیا چل رہا
جاننے کے لیے گنتی آرا تیکم کان لگائے کھڑی تھیں۔
”عادل میں اماں کے خلاف نہیں جارہا ہوں
محبت نے میرے قدموں میں زنجیر باندھ دی ہے

دل پر قابو نہیں ہے اور اماں کب تک ہمیں بیٹیاں
رہیں گی۔ کل تم نے سنا تھا کہ میری تھیں یہ میرا نام
اماں گے۔ اور ہم لڑکے ہیں یہ ہماری تربیت ہے
اماں کے ہاتھوں چپ چاپ مار کھا لیتے ہیں۔
وہ لڑکوں کو دیکھوان کی مائیں ان کے سامنے ناپ
لالہ لڑکائی ہیں کہ کماؤ پوت بیٹے خاندان ہو جائیں۔ اماں
ہماری عمر ہمیں اپنے اشاروں پر چلانا چاہتی ہیں۔ میں
نے سوچ لیا ہے میں یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا یوں بھی
اماں نے کبھی ہماری شادیاں نہیں کرنی ہیں۔ میں اس
سوسائٹس کا ہو گیا ہوں اور تم بھی سوچ لو۔ یہاں جب
اماں اٹلی رہ جائیں گی تو معلوم ہوگا کہ میرے جیسے
بچے کو اپنے زعم وانا کی بیعت۔“

گنتی آرا دیوار کو تھام نہ لیتیں تو چکر کر گر
جائیں۔ ساری رات اس گھر کی چھت تلے سب
ہوں وہ پائے تھے سب کے ذہن چل رہے تھے مگر
حرف جدا تھا فیصلے الگ الگ تھے۔
صبح بے حد روشن اور اچلی اچلی سی تھی۔ جب
گنتی آرا اس جانے کے لیے تیار کھڑا تھا تو گنتی آرا
نے ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

”اس سے کچھ شام کو جلدی آجائے میں نے
اس کی اور زویا کی شام کو مکتفی طے کی ہے۔ صبح
میں گئی تھی نصیرا کی طرف، اس کے ساتھ
اس کے بعد اگلے ہفتے شادی کے دن بھی رکھ
ہیں آفس سے چھٹی لے لے۔“

گنتی آرا نرودھے پن سے بولی تھیں اور وہ نہال ہو
کھانا اماں کے گلے جا لگا تھا۔ دنیا کی کوئی بھی ماں اگر یہ
دیکھ لے کہ اس کی اولاد کی خوشی ہی اس کی اپنی خوشی ہے تو
اس کی ہون کے شیرازے نہ ٹھہریں۔ شام بے حد خوب
گنتی آرا شیریں اور زویا مکتفی کے بعد ان گھنوں سے ایک
لو کچھ کر رہی تھی میں مکرار ہے تھے۔

☆☆☆

پھر زویا اس کی زندگی میں پہلی بھار کے
لے کی طرح داخل ہو گئی تھی۔ عادل، اسد، مناور
اماں کے آنے کے بعد بہت خوش تھے ان کے

سارے دوستوں کی بھابھیاں ان کے دیواروں کو من
پہنہ پکوان بنا کر کھلائی تھیں۔ فرمائش کی جاتی تھی اور
بھابھی من دمن پورا کر دیتی تھی۔

کچھ دنوں بعد عید بھی سب ہی بہت زیادہ پر جوش
تھے اس عید کی صبح ان کے نام کی پکار نہیں پڑتی تھی سارے
کام بھابھی نے جو بنائے تھے۔ مگر ان کے خواب چنکا چور
ہو گئے چپ عید کی صبح بھی بھابھی صاحبہ اپنے ہسٹر پر کھو
استراحت تھیں۔ گھر اندر جا رہا تھا رات کو بارش اور آندھی
سے گھر کا نقشہ بگڑ گیا تھا۔ چکن میں رات کے کٹے برتنوں
کا ڈھیر جوں کا توں رکھا تھا چرن پر گندھی کھیاں۔ جھنجھنار سی
تھیں۔ بد بو کی ہلک ہوئی تھی۔

شیریں چار دفعہ زویا کو جگانے کی سعی کر چکا تھا
پانچویں مرتبہ تھک مار کر باں کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔
”اماں زویا کو ڈانٹتی کیوں نہیں ہیں۔“ لہجہ بے
زار سا تھا۔

”یہ تم میاں بیوی کا ذاتی معاملہ ہے اور جاؤ،
شباباش گھر جلدی سے صاف کرو۔“

وہ گہری مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھیں۔ اسد
فرش دھو رہا تھا۔ عادل نے گھر سمیٹا تھا، مناور برتن دھو رہا
تھا جبکہ خود شیریں سب کے لیے خستہ پراٹھے تیزی سے
تل رہا تھا کہ اب ایک مزید فرد کا اضافہ ہوا تھا اور زویا
کھاتی بھی تو بہت تھی۔ جب تک گرم مارگم ناشتا میز پر لگا
اس وقت تک زویا نہ پانی دھوئی گھری سی باہر نکلی تھی۔
”عید مبارک ہو آئی!“

جبکہ گنتی آرا بھی خوش دلی سے عید مبارک کا جواب
دیتے ہوئے یہ سوچ رہی تھیں۔ یہ ہجرت تاک مثال بائی
بیٹوں کے لیے کافی ہوگی مگر من پسند شادی کے بجائے
ماں کے فیصلے کو تسلیم کرتے ہوئے اس کو ترجیح دیں گے۔

”ابھی ایک اور پر اٹھا تو لادیں یہ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔“
زویا نے زوردار آواز میں کہا تو ایک پل کے لیے شیریں کو
لگا وہ کل بھی وہیں کھڑا تھا جہاں آج کھڑا ہوا ہے فرق
صرف اتنا تھا کہ گنتی آرا کی جگہ زویا نے سنبھال لی تھی۔

☆☆☆

یہ تارا اور ایک تھکے کوکے

”نمین تارا“

..... آنکھوں کے پار دھندھی جیسے میں بار بار پلکیں جھپک کر روکنے کی کوششوں میں بھی مگر بے سود۔ غصہ سانس بھر کر رہ گئی تھی..... میرا رین کوٹ میرے پیروں میں پڑا تھا اور میرا شولڈر بیگ سامنے..... جس میں سکوں کے سوا کچھ بھی تو نہیں تھا۔
نینی تیز قدموں سے مجھے اپنی طرف آدکھائی دی تھی..... اس نے گولڈن ڈارک میکسی برا کی لمبا سا منظر لے رکھا تھا اور کانوں میں چینی

چھ سال دس مہینے بعد بھی اس آواز نے مجھے پتھر کر دیا تھا۔ یہی تو وہ آواز تھی، لہجہ تھا جو نین تارا کو راہ سے ہٹکا دیتا تھا..... سلور مون کی سیرھیوں کے آخری اسٹپس پر میں بیٹھی تھی..... رنگ، نور، روشنیاں، تھقے کچھ بھی تو متاثر کن نہیں تھا واقعی نہیں تھا..... یا پھر میں ہی دل مردہ کے بیٹھی تھی..... جب دل مردہ ہوتے ہیں تو انسان زندہ کیسے رہتے ہیں؟ کتنی عجیب بات تھی کہ میں زندہ تھی



kiBooks.site

پھولوں کے بڑے بڑے بالے تھے۔ وہ بیس سال کی عمر کی بھی مقابل سے بات کرتے وقت وہ کانوں کے بالوں کو گھمانی رہتی تھی..... دو طلاخوں اور بے شمار بریک اپس کے بعد وہ آج کل فری تھی..... وہ آتے۔ نہی جھکڑا مارے پیرے قریب بیٹھتی تھی۔

”کون سی دو چیزیں پر“ قادر بش کینڈل
اسٹینڈ تھا مے سامنے سے گزرتے ہوئے ٹھکرائے
تھے۔

الہ! یہ نظر جمائی میں پھر نکلتی تھی..... میرا وہ ہم میرا کب
 نہیں ہو چکا تھا..... وہ آواز، وہ کاندھے پر پڑا ہاتھ
 وہ کس تو میں بر کبھی نہیں بھول سکتی تھی..... کبھی
 ہی نہیں.....!

تھا۔ میری رازدار دوست..... حق ہامیری زندگی۔
 ”کو کب فیاض.....“

اثرات نمودار ہونے تھے۔ وہ آگن میں لگے نیم کے بیڑ کے نیچے لگے جھولے پر پاؤں پیارے بیٹھ گئی تھی۔ ہر عمل کے جواب میں ایک رد عمل ضرور سامنے آتا ہے۔

سب سے پہلے دادی کا سکتہ ٹوٹا تھا۔ ”تانیہ، ٹی وی کھولو۔“

اون کے دھماگوں سے الجھتی، منہمکتی تانیہ بمشکل ٹی وی تک رسائی حاصل کر سکی تھی۔ منظر سامنے تھا۔ ڈاکٹر پر اعتماد انداز میں تقریر کرتی بلاشبہ وہ کوکب فیاض ہی تھی۔ سلیتے سے سر پروٹا جھانے، ڈاکٹر والی کھڑی بیٹے، اسکول یونیفارم میں لمبوس، وہ ہاتھ پیرا ہوا کر مقابل کے جھکے چڑھ رہی تھی۔ اس کی گونج دارا دار آواز کا زبردست سہا جھن کو محسوس کر چکا تھا۔

”آپ چاہتے ہیں ایک اور جناح آئے آپ کی سستی، کاٹلی اور سہل پسندی کا حل ڈھونڈے۔“ آپ غلط ہیں۔ جناح نے جو آپ کو دینا تھا وہ دے گئے۔ اپنی شخصیت برائیوں کی جنگ آپ کو خود ہی کوڑنا ہوگی۔

پاکستان یہ۔ پاکستان وہ۔ یہ کیا ہے؟ ہر الزام پاکستان کے منہسے کیوں مار دیا جاتا ہے؟ صاحب صدر ایہ غلط رویہ ہے، اس کی مذمت کی جانی چاہیے۔ تالیوں کے شور میں کوکب فیاض چند لمحوں کو خاموش ہوتی تھی۔ ٹرائی کیمرے گھومتے سامنے آگئے۔ فلیش لائٹس وہ اسی حکمت اور وقار کے ساتھ کھڑی تھی۔ ٹشو باکس سے اب وہ ٹشو کھینچ کر ماتھے کا پسینہ صاف کر رہی تھی اور گھبراہٹ ہوئی ہرگز بھی نظر نہ آتی تھی۔ اس کا مکاؤ اس کے فارمیکا پر زور سے پڑا تھا۔

”دھرتیاں خون مانگتی ہیں۔ خون سیال سے وجود میں آتی ہیں۔ سرتن سے جدا ہوتے ہیں۔ سن ریزہ ریزہ ہوتے ہیں۔ اوڑھنیاں پھٹ کر تار تار ہوتی ہیں۔“ تب اس کی آواز بھر آئی تھی ”پھر جا کر پاکستان ملا کرتے ہیں۔“ چند منٹ بعد وہ ڈاکٹر چھوڑ چکی تھی مگر تالیوں کی مسلسل گونج میں ذرا بھر بھی کمی

واقع نہ ہوئی تھی۔ وہ فاتح تھی۔ جیتنے آتی تھی۔ نڈر بے باک اور اسلاف پسند ہی تو کوکب فیاض تھی۔ اس گھر میں موت کی سی خاموشی تھی ایسا ناگہم کی رگیں ٹوٹی تھیں۔

”صفیہ۔ یہ لڑکی چونڈے میں راکھ ڈال رہی ہے۔“ پان کے بچے تخت سے اڑ کر پرے جا پڑے تھے۔ صفیہ خود بھی ہوئی کیفیت میں تھیں۔

”اماں قسم لے لیں مجھے خبر نہیں تھی کہ کوکب کرے گی۔“

”لڑکیوں کی عزت کچے گھر سے ہی ہوتی بار بار پار نہیں لگتی۔“

”اسکول میں تو تقریریں کرتی تھی مگر یہ۔“ سہل گنگنی صفیہ۔ میرا فیاض کسی کو دکھانے جو گناہ نہیں رہے گا۔ لوگ کیا کہیں گے فیاض کی لڑکیاں اب ٹی وی پر آئیں گی۔ مردوں سامنے بڑھ بڑھ بولیں گی۔ تعریف وصول کی ہے ناں کہ ایسے کام کن کے ہوتے ہیں؟“ وہ سہل شعلوں کو ہوا دے گیا تھا۔

تانیہ گم سم سی بیٹھی تھی وہ بڑی خاموش تھی۔ کام کی بات کرنے والی ناپ تول کر بول والی ہوا کا شور تک اسے ڈراتا تھا۔ اور وہ ”وہ“ تھی چپ نہ رہنے والی۔ ہر بات کا پردہ لیکر چوٹ لگانے والی۔ مقابل کو لا جواب کر دیتی تھی۔

”اماں۔ ایسے تو مت کہیں وہ پوٹی ہے آ کی۔“

”میں تو تین میں نہ تیرہ میں۔ باتیں تو نہ کرے گا۔ کس کس کا منہ بند کرو گی۔“

ٹی وی پر اشتہار ختم ہوا تھا۔ وہ خرابی تھا۔ اعتمادی ایجنسی کی سٹریٹیاں اتر رہی تھی ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ کھیل ختم ہوا تھا اور وہ بازی جیت بھی چکی تھی۔

☆☆☆

دیکھ کر۔۔۔۔۔ ہائے میرے بھائی کی عزت دل گئی۔ چھناک بھڑکی لڑکی زمانہ تھوٹھو کرے گا۔۔۔۔۔ ارے صفیہ کیسے ترتیب سے چال چلی ہے، تانیہ نے۔۔۔۔۔ ٹی وی پر تو ادا کارائیں آتی ہیں۔ پچھو پچھو سترہ منٹ سے داویلا بچا رہی تھیں۔

تانیہ تو توں کو پانی ڈال رہی تھی۔ موی دوبارہ پاز کاٹ رہی تھی۔ دھوپ نیم کے بیڑ سے چمن چمن کر نیچے اتر رہی تھی۔ صفیہ نے کبھی کی انتہا پر نہیں۔۔۔۔۔ دماغ کی سٹی گم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ برآمدے میں انتظار ابی کیفیت میں مسلسل ایک گھنٹے سے ٹپ رہی تھیں۔

”ہائے کوئی۔۔۔۔۔ تجھے اللہ پوچھے۔ آج تو دل پر گھر واپس نہ آئے۔“

”اماں میرا ظفر تو اتنا ڈال ہو رہا تھا۔ جوان نمون ہے گھر کی عزت کو یوں ٹی وی پر دیکھ کر کھول الما۔۔۔۔۔ بہت سمجھا بچھا کر اسے ٹھنڈا کیا ہے۔“

”آپا۔۔۔۔۔ مجھے تو اس بات کی خبر اب ہوئی پہلے ہوتا تو نوبت ہی نہ آئے دیتی۔ میں تو بھی پہلے لی طرح ہی اسکول میں کوئی تقریری مقابلہ ہو گا۔“ دادی نے بات پکڑ لی تھی اور غصے سے خوب آگ بگولا ادا کی تھیں۔

”ساری تمہاری شہ دی ہوئی ہے۔ ایک تو ہار بیٹیاں میرے بیٹے کی جان کو آئیں۔ ایک مہارانی ہر روز روٹھ کر آ جاتی ہے اور تین یہاں بیٹے پر ٹوک دل رہی ہیں۔“ تانیہ کا ٹکٹین آسودہ بیٹے میں گم ہوا تھا۔ موی پر ٹیکنیکل کی کاپی تھاے بیٹھی تھی۔ اسے ابھی کچھ ڈائیکٹرا مز اور چارٹ بنانے تھے۔ مگر اماں اس سارے ہنگامے نے تھکا کر رکھ دیا تھا۔

دردازہ دھار سے کھلا تھا۔ دھوپ سمت کر اداوں پر آگئی تھی سائے ابھی طویل نہ ہوئے تھے۔ غصہ د غصہ میں بھرے فیاض احمد اداازے کو ٹھوکر مارتے اندر آئے تھے۔ ان کی طبیعت میں ہمیشہ سے غصہ، طیش اور جلد بازی تھی۔ ہر بات پر فوری طور پر رد عمل کا اظہار کرنے

والے اور کسی حد تک قدامت پسند واقع ہوئے تھے۔ تانیہ ابھی بھی باجرے کی تھیل تھاے ہوئی تھی جسے اسے کسی نے جادو سے منجھ کر دیا تھا۔ پنیلینس تراشی موی بھی دل گئی تھی۔ پچھو جا چکی تھیں۔ دادی نے ابھی دوایں لی تھی۔

”صفیہ، صفیہ باہر آؤ۔“ صفیہ ہانپتی کا پتی ہوئی بیڑھیوں پر آن کھڑی ہوئی تھیں۔

”جی۔۔۔۔۔“

”یہ میں کیساں کر رہا ہوں۔“

”وہ۔۔۔۔۔ میں۔“ وہ تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ پاؤں کی ٹھوکر سے گلا ٹوٹ چکا تھا اور مٹی آگن میں بجھ گئی تھی۔ تانیہ کے دل پر ہاتھ پڑا تھا۔ آج ہی تو اس پر پھول آیا تھا۔ جس کا انتظار وہ پچھلے بیس دنوں سے کر رہی تھی۔ وہ جب چاہ دیکھے گی۔ آنکھوں میں جیسے کوئی کالج ٹوٹا تھا۔ ایسا زور زور سے چلا رہے تھے۔

”لغت ہو فیاض احمد تم پر۔۔۔۔۔ آج لوگ مجھے مبارک بادیں دے رہے ہیں کہ میری بیٹی ٹی وی پر آ رہی ہے۔ تم نے اور تمہاری بیٹیوں نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔“

”میری بیٹیاں۔۔۔۔۔؟“ وہ سسکی تھیں۔

”ہاں۔۔۔۔۔ تمہاری بیٹیاں۔۔۔۔۔ تم نے میری زندگی تباہ کر دی ہے ایک وارث تک نہیں دے سکیں۔ کم از کم ان کی تربیت تو اچھے سے کی ہوئی۔“ اماں دو پٹامنہ پر رکھے بیڑھیوں پر بیٹھ گئی تھیں۔

”وارث پیدا کرنا میرے ہاتھ میں تھا۔؟“ وہ سوال ابا کو چاہک کی طرح لگا تھا اور وہ بلبل کر رہ گئے تھے۔

”انہیں پیدا کرنا تو تمہارے ہاتھ میں تھا۔“

”میں نہ کہتی تھی فیاض احمد اس عورت کو اور ان بیٹیوں کو لگام ڈالو۔ کہیں کا نہیں رہنے دیں گی تمہیں۔ مگر جب ماں کی بات نہ سنی۔ اب بھگتو۔“ آگ لگانے کے لیے دادی کو بھی بھی ماس کی ضرورت نہیں پڑی تھی مگر ابا کو ضرورت پڑ گئی تھی۔

اثرات نمودار ہونے تھے۔ وہ آنگن میں لگے نیم کے بیڑ کے نیچے لگے جھولے پر پاؤں پیارے بیٹھ گئی تھی۔ ہر عمل کے جواب میں ایک رد عمل ضرور سامنے آتا ہے۔

سب سے پہلے دادی کا سکتہ ٹوٹا تھا۔ "تادیہ، ٹی وی کھولو۔"

اون کے دھماگوں سے الجھتی، سنبھلتی تادیہ بے شکل ٹی وی تک رسائی حاصل کر سکی تھی۔ منظر سامنے تھا۔ ڈاکٹر پر اعتماد انداز میں تقریر کرتی بلاشبہ وہ کوکب فیاض ہی تھی۔ سلیقے سے سر پر دوپٹا چٹائے، ڈائل والی گھڑی پہنے، اسکول یونیفارم میں ملیں، وہ ہاتھ ہر الہامی مقابل کے جھکے چھڑا رہی تھی۔ اس کی گونج دار آواز کا زیر و بم سامعین کو مسحور کر چکا تھا۔

"آپ چاہتے ہیں ایک اور جناح آئے آپ کی سستی، کالی اور نیکل پسندی کا حل ڈھونڈے۔ آپ غلط ہیں۔ جناح نے جو آپ کو دینا تھا وہ دے گئے۔ اپنی شخصی برائیوں کی جنگ آپ کو خود ہی کوڑتا ہوگی۔"

پاکستان یہ۔۔۔ پاکستان وہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟ ہر الزام پاکستان کے منہ کیوں مار دیا جاتا ہے؟ صاحب صدر! یہ غلط رویہ ہے، اس کی خدمت کی جانی چاہیے۔" تالیوں کے شور میں کوکب فیاض چند لمحوں کو خاموش ہوئی تھی۔ ٹرائی کیمرے گھومتے سامنے آگئے۔ فلیش لائٹس وہ اسی حکمت اور وقار کے ساتھ کھڑی تھی۔ نشوونما کس سے اب وہ نشوونما کر ماتھے کا پسینہ صاف کر رہی تھی اور گھبراہٹ ہوئی ہرگز بھی نظر نہ آئی تھی۔ اس کا مکا ڈاکٹر کے قادمیک پر زور سے پڑا تھا۔

"دھرتیاں خون مانگتی ہیں۔ خون سیال سے وجود میں آئی ہیں۔ سترن سے جدا ہوتے ہیں۔ سن ریزہ ریزہ ہوتے ہیں۔ اوڑھتیاں بھٹ کر تار تار ہوتی ہیں۔" تب اس کی آواز بھرا آئی تھی "پھر جا کر پاکستان ملا کرتے ہیں۔" چند منٹ بعد وہ ڈاکٹر پھوڑ چکی تھی مگر تالیوں کی مسلسل گونج میں ذرا بھر بھی کمی

واقع نہ ہوئی تھی۔ وہ فارغ تھی۔۔۔۔۔ جیسے آتی تھی نڈر بے باک اور انسانیت پسند وہی تو کوکب فیاض تھی۔

اس گھر میں موت کی سی خاموشی تھی۔ ایسا سنا جسم کی رگیں ٹوٹتی تھیں۔

"صفیہ۔۔۔۔۔ یہ لڑکی چونڈے میں راکھ ڈال ہے۔" "پان کے پتے تخت سے اڑ کر پرے جا پڑے تھے۔ صفیہ خود بھی ہوئی کیفیت میں تھیں۔

"اماں قسم لے لیں مجھے خبر نہیں تھی کہ کوکی کرے گی۔"

"لڑکیوں کی عزت کچے گھڑے سی ہوتی۔ بار بار پارتی نہیں گئی۔"

"اسکول میں تو تقریریں کرتی تھی مگر یہ۔۔۔۔۔" "سینہ لگ گئی صفیہ۔۔۔۔۔ میرا فیاض کسی کو دکھانے جو گناہ نہیں رہے گا۔ لوگ کیا کہیں گے فیاض کی لڑکیاں اب ٹی وی پر آئیں گی۔ مردوں سامنے بڑھ بڑھ بولیں گی۔ تعریف و موصوفی کی ہے ہاں کہ ایسے کام کن کے ہوتے ہیں؟" وہ سہ شعلوں کو ہوا دے گیا تھا۔

تانی گم صم سی بیٹھی تھی وہ بڑی خاموش تھی۔ کام کی بات کرنے والی ناپ تول کر بولی ہوئی ہوا کا شور تک اسے ڈراتا تھا۔ اور وہ "وہ" تھی چپ نہ رہنے والی۔ ہر بات کا پردہ لیل چوٹ لگانے والی۔ مقابل کو لا جواب کر دیتی تھی۔ "اماں۔۔۔۔۔ ایسے تو مت کہیں وہ پونی ہے آ کی۔"

"میں تو تین میں نہ تیرہ میں۔۔۔۔۔ ہاتھیں تو نہ کرے گا۔ کس کس کا منہ بند کر دو گی۔"

ٹی وی پر اشتہار ختم ہوا تھا۔۔۔۔۔ وہ ڈرائی تھا۔ اعتمادی اسٹیج کی میز چٹیاں اتر رہی تھی ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ کھیل ختم ہو تھا اور وہ بازی جیت بھی چکی تھی!

☆☆☆

"اماں مت پوچھیں کیا حال ہوا کوکب کوئی

دیکھ کر۔۔۔۔۔ ہائے میرے بھائی کی عزت دل گئی۔ چھٹانک بھڑکی لڑکی زمانہ تھوکتو کرے گا۔۔۔۔۔ ارے صفیہ کسی ترتیب سے چال چلی ہے، تاہم نے۔۔۔۔۔ ٹی وی پر تو ادا کارا میں آئی ہیں۔" پچھو پچھلے سترہ منٹ سے وہ بلا چار رہی تھیں۔

تانی تو توں کو پانی ڈال رہی تھی۔ موی دوبارہ باز کاٹ رہی تھی۔۔۔۔۔ دھوپ نیم کے بیڑ سے چھن کر نیچے اتر رہی تھی۔ صفیہ نے کسی کی انتہا پر نہیں۔ دماغ کی سٹی گم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ برآمدے میں اضطرابی کیفیت میں مسلسل ایک گھنٹے سے ٹپ رہی تھیں۔

"ہائے کوکی۔۔۔۔۔ تجھے اللہ پوچھے۔۔۔۔۔ آج تو دیں پر گھر واپس نہ آئے۔"

"اماں میرا ظفر تو اتاؤلا ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ جوان نون ہے گھر کی عزت کو یوں ٹی وی پر دیکھ کر کھول اٹھا۔ بہت سمجھا بھجا کر اسے ٹھنڈا کیا ہے۔"

"آپا۔۔۔۔۔ مجھے تو اس بات کی خبر اب ہوئی پہلے ہوتا تو تو بت ہی نہ آنے دیتی۔ میں تو بھی پہلے کی طرح ہی اسکول میں کوئی تقریری مقابلہ ہو گا۔" دادی نے بات پکڑ لی تھی اور غصے سے خوب آگ بگولا ہوئی تھیں۔

"ساری تمہاری شہ دی ہوئی ہے۔ ایک تو چار بیٹیاں میرے بیٹے کی جان کو آئیں۔ ایک مہارانی ہر روز گھر گھر آ جاتی ہے اور تین یہاں سینے پر مونک دل رہی ہیں۔" تانی کا ٹنگن آنسو دوڑنے میں گم ہوا تھا۔ موی پر کینیکل کی کاپی تھا اسے بیٹھی تھی اسے ابھی کچھ ڈائنگ روم اور چارٹ بنانے تھے۔ مگر اماں اس سارے ہنگامے سے تھکا کر رکھ دیا تھا۔

دروازہ دھاڑ سے کھلا تھا۔۔۔۔۔ دھوپ سٹ کر اندرون پر آ گئی تھی سائے ابھی طویل نہ ہوئے تھے۔ غصے و غضب میں بھرے فیاض احمد دروازے کو ٹھوکر مارتے اندر آئے تھے۔ ان کی طبیعت میں ہمیشہ سے غصہ، طیش اور جلد بازی تھی۔ ہر بات پر فوری طور پر رد عمل کا اظہار کرنے

والے اور کسی حد تک قدامت پسند واقع ہوئے تھے۔ تانی ابھی بھی باجرے کی کھلی تھا اسے ہوئی تھی جسے اسے کسی نے جادو سے منجھ کر دیا تھا۔۔۔۔۔ پشلیں تراشتی موی بھی دہل گئی تھی۔ پچھو بھا چکی تھیں۔ دادی نے ابھی دوا لی تھی۔

"صفیہ، صفیہ باہر آؤ۔" صفیہ ہانپتی کانپتی ہوئی میز چٹوں پر آن کھڑی ہوئی تھیں۔

"جی۔۔۔۔۔"

"یہ میں کیا سن کر آ رہا ہوں۔" "وہ۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ وہ مقررہ کانپ رہی تھیں۔۔۔۔۔ پاؤں کی ٹھوک سے گلا ٹوٹ چکا تھا اور مٹی آنگن میں بکھر گئی تھی۔ تانی کے دل پر ہاتھ پڑا تھا۔ آج ہی تو اس پر پھول آیا تھا۔ جس کا انتظار وہ پچھلے تین دنوں سے کر رہی تھی۔ وہ جب چاپ دیکھے گی۔۔۔۔۔ آنکھوں میں جیسے کوئی کالج ٹوٹا تھا۔ ابا زور زور سے چلا رہے تھے۔

"لعنت ہو فیاض احمد تم پر۔۔۔۔۔ آج لوگ مجھے مبارک بادیں دے رہے ہیں کہ میری بیٹی ٹی وی پر آ رہی ہے۔ تم نے اور تمہاری بیٹیوں نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔"

"میری بیٹیاں۔۔۔۔۔؟" وہ سسکی تھیں۔

"ہاں۔۔۔۔۔ تمہاری بیٹیاں۔۔۔۔۔ تم نے میری زندگی تباہ کر دی ہے ایک وارث تک نہیں دے سکیں۔ کم از کم ان کی تربیت تو اچھے سے کی ہوئی۔" اماں دوپٹا منہ پر رکھے میز چٹوں پر بیٹھ گئی تھیں۔

"وارث پیدا کرنا میرے ہاتھ میں تھا۔۔۔۔۔؟" وہ سوال ابا کو چاک کی طرح لگا تھا اور وہ ہلبلا کر رہ گئے تھے۔

"انہیں پیدا کرنا تو تمہارے ہاتھ میں تھا۔" "میں نہ کہتی تھی فیاض احمد اس عورت کو اودان تینوں کو لگام ڈالو۔ کہیں کا کھیل رہے ہیں ان کی کہیں۔ مگر تب ماں کی بات نہ سنی۔ اب بھگتو۔ آگ لگنے کے لیے دادی کو بھی بھیجاں گی ضرورت نہیں پڑی تھی مگر ابا کو ضرورت پڑ گئی تھی۔"

”پڑھائی لکھائی نے ان کے دماغ میں فتور بھر دیا ہے۔ میں آج ہی بندوبست کرتا ہوں۔“ وہ بچن کی طرف بڑھے تھے۔ باجس کی ڈیپا تھا۔ وہ باہر آئے اور موی کے آگے رکھی پر ٹیکٹیکو کی کاپیاں بچھت لیں۔ موی کا سانس حلق میں انک گیا تھا۔ دھوپ تماش بین ہو گئی۔ نیم کا بیڑ دم سا دھ کھڑا رہا۔ دیوار سے لگے چار بانس کے تے بڑھنے لگے۔ ہولے سے۔ باجس کا شعلہ روشن ہوا تھا۔ پر ٹیکٹیکو کی کاپیاں دھڑ دھڑ جل رہی تھیں۔

”اب پڑھو۔۔۔۔۔ ٹی وی پر آؤ۔۔۔۔۔ بہت شوق ہے ناں تمہیں۔۔۔۔۔ اب سارے شوق پورے کرو۔“ اماں توب کرا بھی تھیں۔

”قیاض۔۔۔۔۔ اللہ کے واسطے ایسا نہ کریں۔“ ایک دھکے سے وہ دروازہ جا گری تھیں اب اٹھنے کی ہمت ان میں بھی نہیں تھی۔ موی روٹی پختی آگ کے شعلوں کے پاس کھڑی تھی۔

”اللہ کا واسطہ پا۔۔۔۔۔ ایسا مت کریں۔“

”اور تم لوگوں کا جودل چاہے تم وہ کرو۔۔۔۔۔ باپ کی عزت کا تو خیال تک نہیں تمہیں نا فرمان اولاد۔“ وہ بیڑوں میں گری تھی۔

”خدا کا واسطہ پا۔۔۔۔۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔“

تانی خالی خالی نظروں سے سب دیکھ گئی۔ جیسے وہ تو وہاں تھی ہی نہیں، اس کا بت تھا۔ بے جان سانس سے عاری، موی ابھی تک ہاتھ جوڑے رو رہی تھی۔

”ابا رحم کریں۔۔۔۔۔ میرا سال ضائع ہو جائے گا۔“

”تم رجم کھاؤ مجھ پر دفع ہو جاؤ میری زندگی سے اپنی ماں کو بھی لے جاؤ۔“ ابا نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ کاغذ جل جل سیاہ ہونے لگے۔ ہوا رکھ اڑانے کو بے تاب تھی۔

موی اتر کے پیچھے دے چکی تھی بس پر ٹیکٹیکو

چلتے کاغذوں پر ہاتھ مارتی روٹی ہلکتی موی رہ گئی تھی۔۔۔۔۔ بت میں جان بڑھ گئی تھی وہ ہولے ہولے چلتی موی کے پاس آئی تھی۔ کچھ بھی تو باقی نہ بچا تھا۔۔۔۔۔ سب جل چکا تھا۔

”یہ کیا ہو گیا مومنہ؟“ تانی کی سرکشی موی تک نہیں پہنچی تھی۔ موی تو جیسے حواسوں میں نہیں تھی وحشت کے دہانے پر کھڑی تھی۔ صفہ بیگم اندر جا چکی تھیں۔ تماش بین دھوپ، تماشے کے اختتام پر دیواروں سے اتر آئی تھی۔ نیم کے پور کو کچھ چڑیاں ٹونگ رہی تھیں۔ اب کے ایسی خاموشی تھی کہ قیامت تک رہنے والی تھی۔ ہوا کاغذوں کی راکھ اڑانے لگی تھی۔ موی بلک کر رو رہی تھی۔

”اللہ کرے کوکب تم سر جاؤ۔“ تانیہ کی نظر غیر ارادی طور پر اٹھی تھی کھلے دروازے کے بچوں کی شڑائی تھا۔ کوکب فیاض کھڑی تھی۔

☆☆☆

ریلوے اسٹیشن کے سنگی چار بیگ تھے بیٹھی ہیں ادھر ادھر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔ بھانت بھانت کے لوگ تھے۔۔۔۔۔ بچے، بوڑھے، جوان، مرد، عورتیں سب۔۔۔۔۔ قلی سامان کی ٹرالیاں گھنٹے آدائیں لگاتے پھر رہے تھے ہر کوئی جیسے اپنی زندگی میں سکن اور خوش تھا۔۔۔۔۔ زرد بلبوں کی روشنی میں ریلوے کی عمارت سونے میں نہائی ہوئی دکھائی دیتی تھی پتیل کے گھنے بیڑوں تلے اندھیرا تھا۔۔۔۔۔ ایک دوسرے سے قطعی انجان لڑکے اور لڑکیاں اک دو بے کوکبہ کرڈرا کی ذرا سکر بھی لے تھے جانے انہیں کسی تسکین ملتی تھی۔۔۔۔۔ میں نے موی میں دبائے ہوئے اس کاغذ کو کوئی بیسویں بار دیکھا تھا۔ اور گہری سانس لی تھی۔

”تو زندگی بھی ریل کی طرح ہوتی ہے جھکھڑ ہلتی رہتی ہے۔“

ننگے سے شرشر پانی نکل رہا تھا مسافروں کو لائن تھی جو پانی سے خالی بوتلیں بھرنے کو کھڑے۔

”خود تھی۔۔۔۔۔ جانے کیوں وہیں بیٹھے مجھے منورہ چچی کی نہیں یاد آئی تھیں اور میری آنکھیں بس برے گئے تھیں۔“

”دیکھو نین تارہ۔۔۔۔۔ یہ دنیا گندہ جاتوں کی ہے مہوڑنے کو تیار بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔ تجھے اسکے بیچے کودل نہیں چاہتا مگر میری بھی تو مجبوری ہے کلیجے پر ہاتھ پڑتا ہے۔ تیری ماں بڑی اچھی عورت تھی، جانے کیسے ان بچوں کے چکر میں پڑ گئی۔ گھر بار چھوڑ دیا یہ محبت میں ہی ایسی ہے بندے کو اپنے جوگا بھی نہیں رہنے دیتی۔“

جانے منورہ چچی کی باتوں میں زندگی کا کیا بول رہا تھا۔ کیا واقعی محبت ایسی ہوتی ہوگی؟ سب چھوڑنے پر مجبور کر دینے والی گھر بار والدین تک لہائی نے بھی کبھی کیا تھا اور انہیں کیا ملا تھا؟ غربت لہنے لہت اور پھر زندگی کی سب سے بڑی حقیقت یعنی موت بابا کے گزر جانے کے بعد اسی بھی جب تک بات رہیں بیماری سے لڑتی رہیں۔۔۔۔۔ میں کتنی بحث کرتی تھی ان سے جھگڑا اور بھی کتنی باتوں کو اٹھ اٹھ

”ای۔۔۔۔۔ آپ کو ضرورت کیا تھی محبت کرنے کی؟“

”ضرورت کی بات نہیں ہوتی لاڈلی۔۔۔۔۔“

”پھر کیا بات ہوتی ہے؟“

”بے بسی کی بات ہوتی ہے۔۔۔۔۔ بندہ ذخیرہ ہو جاتا ہے۔ اندھا کر دیتی ہے محبت پھر اندھے کو نور صرف ایک ہی شخص سے ملتا ہے۔“

”کتنی خود غرضی کی بات ہے ایک شخص کے پیچھے ال باب جیسے رشتوں کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔“

”لاڈلی تو نہیں سمجھ گئی کبھی نہیں۔“ جانے میری بھ بیوی تھی یا انہیں سمجھانا ہی نہیں آتا تھا یہ بات میری زندگی میری عقل میں نہ ساکن تھی۔۔۔۔۔ سارے نکل سوال جانے میرے حصے میں ہی کیوں آتے تھے۔

”نانا کو آپ کی ابو سے شادی پر راضی ہو جانا

چاہیے تھا۔“ وہ نفی میں سر ہلاتی ہوئی ہنس دی تھیں۔

”بھی نہیں۔۔۔۔۔ سکندر کے پاس انٹیس نہیں تھا اور پھر برادری بھی الگ۔۔۔۔۔ ذات کا مسئلہ تھا۔“

میں نے انڈہ توڑتے افسوس سے کہا تھا۔

”مگر امی یہ اتنی بڑی وجوہات تو نہیں تھیں۔“

”نین تارہ۔۔۔۔۔ یہ باتیں تم آج کے بچوں کو تو سمجھ میں آتی ہیں مگر پچھلے لوگوں کی سمجھ سے باہر ہیں۔۔۔۔۔ انہیں پرانی روایات، اور رواجوں سے عشق ہے۔ وہ ان باتوں کو ہرگز نہیں سمجھیں گے۔“ انہوں نے کچ کہا تھا نانا کے گھر سے امی کی بس ڈولی ہی اٹھی تھی پھر راستے الگ الگ ہو گئے تھے۔ زندگی واقعی ریل کی طرح جھکھڑ ہلتی رہتی تھی۔

دور سے آتی ریل کی سینی نے مجھے خیالوں کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں لا کھڑا کیا تھا۔ میں بیٹھ بیگ اٹھاتی ریل کی بوکی کی طرف بڑھ آئی تھی۔ کچھ منٹ کے بعد میں کھڑکی کے قریب والی نشست پر بیٹھ چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے کا تاروں بھرا آسمان اب بادلوں سے ڈھک چکا تھا، بارش کی بوندیں کھڑکی سے اندر کوونے لگی تھیں اندر دو زرد بلب جل رہے تھے۔ کچھ عورتیں اور بچے تھے جو کسی شادی سے واپس لوٹ رہے تھے۔ اور وہ قصے زیر بحث لا رہے تھے میں اپنی کسی نظر ان پر ڈالے باہر کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ کانوں میں امی کی کبھی باتیں بازگشت ہو گئیں۔

”تارہ۔۔۔۔۔ زندگی کبھی کسی کی نہیں ہوتی یہ صرف اور صرف موت کی ہوتی ہے تمہارے نانا مجھ پر غصہ ہو سکتے ہیں، تعلقات ختم کر سکتے ہیں مگر تمہیں دیکھ کر بے بس ہو جائیں گے۔۔۔۔۔ اولاد کی اولاد بڑی پیاری ہوتی ہے۔ پھر موسم میں ڈھال جاتے ہیں“ اور امی کے گزر جانے کے بعد میں نے ان کی بات پر بھروسہ کر لیا تھا جانے یہ فیصلہ ٹھیک بھی تھا یا۔؟ برساتی پٹنگ کھڑکی کے راستے بلبوں کے گرد چکر کاٹنے لگے تھے۔ دور کہیں سے ریڈ یو کی آواز ابھری تھی۔

”ای۔۔۔۔۔ آپ کی نین تارہ بہت بزدل

وہ ایک پوش ابریا تھا۔ لائن میں سارے جنگل تھے اور سب کے سب ایک سنے بڑھ کر ایک تھے۔ سانسے روش کے گرد درختوں کی قطاریں تھیں۔ کچھ بچے تھے جن پر چتر لڑکیاں ناول کے مطالعے میں مشغول تھیں۔ کچھ بوڑھے انکل بوگا میں مصروف تھے اور بچے فٹ بال کھیل رہے تھے پانچ منٹ کی تلاش و پسار کے بعد وہ اپنے مطلوبہ گھر کے سامنے موجود تھی۔ جدت اور قدامت کا اک حسین امتزاج لیے وہ ایک منفرد سی کوٹھی تھی۔ جس کی دیواریں سویت پی اور ابرو کیریا سے ڈھکی تھیں۔ دو منزلہ کوٹھی کی عمارت کے شیشے ہلکی دھوپ میں چمک رہے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ نانا کا گھر اتنا خوب صورت ہوگا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ آخر اس نے حواس بحال کرتے ہوئے نیل بجائے کو ہاتھ بڑھایا تھا۔

☆☆☆

میں نے سر اٹھا کر سامنے کھڑے شخص کو دیکھا تھا اور عقل کو کوسا تھا کہ میں کہیں غلط پتے پر تو نہیں آ گئی تھی۔ میرے سامنے وہی لڑکا کھڑا تھا۔
 ”اوہ..... مائی گاڈ..... تو آپ میرا چچا کرتے کرتے یہاں تک آ پہنچے ہیں۔“ میں لڑ پڑاتی تھی۔
 ”جی نہیں اب میں اپنی پاگل بھی نہیں اور نہ ہی میرا دام خراب ہوا ہے۔“
 ”تو کیا میں خوب صورت نہیں ہوں؟“ سامنے والے کی آواز دکھ سے پھٹ گئی تھی۔
 ”کیا مطلب؟“
 ”مطلب یہ کہ کیا میں اتنا پینڈسم بھی نہیں کہ لڑکیاں میرا چچا کریں۔“ بے چارے کو نئے سرے سے غلط ہوا تھا۔
 ”یہ تو آپ لڑکیوں سے پوچھیں۔“
 ”تو کیا آپ لڑکی نہیں ہیں؟“ اسل مسکرایا تھا۔ مجھے اس بد تمیز شخص پر بے تحاشا غصہ آیا تھا۔
 ”جہنم میں جاؤ۔“ میں آگے بڑھی تھی کہ وہ چپے سے پکارا رہا گیا۔

”ارے..... سنیں تو۔“ میں رکنے والی نہیں تھی مگر اسی وقت ایک گاڑی میرے پاس آ کر رکی تھی۔ شیشے نیچے ہوئے تھے اور ایک گرہیں فل سی شخصیت نے باہر بھاگنا تھا۔ ”بینا آپ کو کس سے ملنا ہے؟“ میں نے پتا نہیں بتایا تھا۔
 ”یہی گھر ہے آپ اندر آ جائیں۔“
 سرخ اینٹوں سے بنے فرش پر ہونے سے پاؤں رکھتی، ہینڈ بیگ مضبوطی سے پکڑے میں آگے بڑھ آئی تھی۔

”جشید انہیں بابا کے پاس لے جاؤ۔۔۔۔۔ وہ لاہری میں ہوں گے۔“ ان کا ملازم جشید مجھے لاہری میں لے آیا تھا۔ آہنی قد آدم الماریوں میں درجنوں کتابیں پڑی تھیں۔۔۔۔۔ فرش عاچوں سے مزین تھے۔ دیوار گیر جالی گھڑی صبح کے آٹھ بج رہی تھی۔ وہ جو بھی تھے ریڈنگ چیز پر آہستہ جھولتے ہوئے کتاب پڑھ رہے تھے کتاب کا سرورق میرے سامنے تھا۔۔۔۔۔ میں حیران رہ گئی تھی وہ میری بھی فیورٹ کتاب تھی۔۔۔۔۔ (عشق کے چالیس اصول) (Forty rules of love)

”اسلام علیکم“ انہوں نے سر اٹھایا مسکرائے۔
 ”وعلیکم السلام۔“
 ”میں، میں نین تارا ہوں۔“ جانے کیوں میرا لہجہ ذرا سا کپکپاتا تھا۔
 ”پیارا نام۔۔۔۔۔ آپ بیٹھیں ناں۔“ کاشن کے سفید سوٹ میں مجھے وہ بہت سادہ اور پروقار انسان لگے تھے۔ میں سامنے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔
 ”آپ کتابیں پڑھتی ہیں؟“ میں نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا پہلی ملاقات میں ہی وہ کیسا سوال کر رہے تھے شاید وہ کافی دوستانہ مزاج کے تھے۔
 ”جی مجھے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔“
 جواب میں نے مسکرا کر کہا تھا۔ وہ ریور اٹھارہ تھے۔
 ”جشید دو چائے لاؤ۔“ پھر وہ مکمل طور پر میری طرف متوجہ ہوئے تھے جانے میرے بارے جاننے کے بعد ان کا رویہ کیسا ہوگا۔۔۔۔۔ میرا دل زور زور سے

دھڑک رہا تھا۔
 ”میں یلیف شفق کے ناول پڑھ رہا ہوں کمال ناول ہے مولانا جلال الدین رومی اور کس تہریز کا قصہ ہے۔“
 ”جی..... میں نے پڑھ رکھا ہے یہ میرے پسندیدہ ناولز میں سے ایک ہے۔“
 ”واؤ گریٹ..... ورنہ آج کل کے بچے تو کتابوں سے دور بھاگتے ہیں۔“

میری امی کو بہت شوق تھا کتابیں پڑھنے کا انہیں دیکھ دیکھ کر مجھے بھی شوق ہوا۔ ناول کے صفحے موڑ کر انہوں نے سائز ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔
 ”آپ کی امی یقیناً ایک اچھی خاتون ہوں گی۔“ میں بار بار انہیں دیکھنے پر خود کو مجبور پارہی تھی۔۔۔۔۔ جانے کیسی اپنائیت، شمش اور انسیت مجھے ان کے وجود سے جڑی محسوس ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ شاید خون یونہی خون کو اپنی طرف کھینچتا ہوگا۔
 ”سے آئی کم ان۔۔۔۔۔؟“ اس اجازت مانگ کر آنے والی آواز کو بھلا میں کیسے بھول سکتی تھی۔۔۔۔۔ وہ رے میں چائے کے تین کپ لے آیا تھا۔
 ”آج بر خوردار آپ کو اجازت کی ضرورت کیسے پیش آ گئی۔۔۔۔۔؟“ وہ سامنے سنگل صوفے پر ڈھے سا گیا تھا۔

”کچھ تو ادب و آداب سے میں بھی واقف ہوں۔“
 ”جی ہم اچھی طرح واقف ہیں۔“ وہ زرب لب مسکرائے تھے۔ میں چائے کی پیالیوں سے انہیں بھاپ کو دیکھتی رہ گئی تھی۔
 ”اردو ادب میں آپ کس سے متاثر ہیں؟“ ان کا رخ میری طرف تھا۔
 ”میری امی اور مجھے قرۃ العین حیدر شروع سے پسند رہی ہیں۔“ چائے کے سب لیتے وہ خوش گواری حیرت سے دو چار ہوئے تھے۔
 ”کیسا اتفاق ہے میں خود بھی قرۃ العین سے متاثر ہوں آخر شب کے ہمسن تو میں کئی بار پڑھ چکا

ہوں۔ ہر بار اک نیا مزہ ملتا ہے۔ ادب کی یہی قویات ہوتی ہے کبھی پرانا نہیں ہوتا۔“ وہ سامنے بیٹھا کبھی اچھٹی سی نظر میری طرف بھی ڈال لیتا تھا۔ ان آنکھوں میں جانے کیوں مجھے ہر بار شرارت ہی نظر آتی تھی۔
 ”کچھ لوگ بھی کبھی بوڑھے نہیں ہوتے دادو۔“
 ”کس کے لیے کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔؟“
 ”آپ کو کیا لگتا ہے؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔
 ”یقیناً میرے لیے۔“ شرارتی آنکھیں قہقہہ لگا گئیں۔
 ”میں تو بابا کے لیے کہہ رہا تھا۔“ وہ کپ رکھتے زور سے ہنستے تھے۔
 ”اپنے باب کی طرح ہی چالاک ہو۔۔۔۔۔“
 ”لیس آئی ایم۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ”اچھا دادو چلتا ہوں کہیں جانے لگا ہوں۔۔۔۔۔ اوکے مس نین تارا۔“ وہ میرا نام کیسے جانتا تھا شاید جب میں اس گاڑی میں بیٹھی شخصیت سے مخاطب تھی تو وہ قریب ہی تھا۔ جاسوس۔
 ”تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟“
 فرمان صاحب نے پوچھا تھا۔ میں جوتی میں سر ہلانے والی تھی، وہ جاتے جاتے میرے لیے مصیبت گھڑی کر گیا تھا۔
 ”جی بہت اچھی طرح سے۔“ کاش میں سامنے پڑا کپ اٹھا کر اس کے منہ پر مار سکتی۔
 ”اسکیٹری ناٹس“ کی دھن بجانا وہ باہر نکل گیا تھا۔
 ”جی تو آپ کس این جی او سے ہیں؟“
 ”میں این جی او سے نہیں ہوں۔“ میں نے سر اٹھایا تھا۔
 ”اوہ سوری۔۔۔۔۔ مائی مس ٹیک۔۔۔۔۔ آپ کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔“ وہ معذرت کے سے انداز میں بولے تھے۔
 ”جی میں نین تارا ہوں۔۔۔۔۔ نین تارا بہت سکندر حیات۔“ میں جانتی تھی میرا لہجہ کپکپا رہا تھا۔ اسی وقت میں نے فرمان صاحب کے چہرے کا رنگ اڑتے دیکھا تھا۔ کہانی تمام ہونے لگی تھی۔

صبوحی باجی ملنے آئی ہوئی تھیں اور سسرال کے دکڑے رورہی تھیں۔ دادی کو خوب تاپ چڑھا تھا۔
 ”ارے تیرے ساس جیسی چنڈال عورت نہ کبھی پیدا ہوئی ہے اور نہ ہی ہوگی۔ ایسی ظالم اور دھوکئی عورت۔“ صبوحی گود کے بیٹے کو لیے بیٹھی تھی باقی دواپنی خالاؤں کے پاس تھے۔ کوکب نے جھکی آنکھوں سے دونوں کو دیکھا تھا جو براٹھے کے ساتھ آلیٹ کھاتے ہوئے چھوٹی چھوٹی باتیں کر رہے تھے۔

”پتا ہے کوکی خالہ..... ابو بہت گندے ہیں۔“
 ”نہیں سونو..... ابو بھی گندے نہیں ہوتے۔“
 ”دادی تو گندی ہوئی ہیں ناں۔“
 ”نہیں دادی بھی گندی نہیں ہوتیں۔“ برتنوں کا ڈھیر دھوتی تانبہ ان کی باتیں بغور سن رہی تھی۔
 ”ابو امی کو بہت مارتے ہیں۔“ کوکی کے حلق میں کچھ اٹکا تھا۔ گھلائی ہاتھ پاؤں اور موٹی آنکھوں والے وہ دھمکھمکھتے۔
 ”اور دادی بھی بہت گندی گندی گالیاں دیتی ہیں۔“ چھوٹا ناک سکڑتا کہہ رہا تھا ماتھے پر سلوٹھیں تھیں۔

”پتا ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا تم لوگ پریشان مت ہوا کرو۔“ وہ کسی تسلی تھی جو کوکی انہیں دے رہی تھی۔ تانبہ کو تاسف نے گھیرا تھا پلیٹوں کا ہلکا سا شور پیدا ہو رہا تھا۔

”خالہ..... آپ ہر بار یہی کہتی ہیں۔“ کوکب فیاض جان لگی تھی تعلیم یافتہ لوگوں کو تو دلیل جب کرا سکتی تھی مگر ان معصوم بچوں کو کوئی بھی دلیل راضی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بڑے ہو رہے تھے، انہیں آہستہ آہستہ سب سمجھ آ رہا تھا۔ وہ ان دونوں کے ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔

”سونو تم لوگ بہت اچھے ہو معصوم اور پیارے تم ان چھوٹی باتوں پر پریشان مت ہوا کرو ورنہ تمہاری امی بھی پریشان ہو جایا کرتی ہیں۔“ انہیں

پڑھتا ہے..... بڑا آدمی بنتا ہے۔“ وہ سر ہلاتے غور سے اسے سنتے تھے۔ صبوحی اندر آئی تھی۔
 وہ بیس سال کی ایک لڑکی تھی مگر چالیس سے اوپر کی لگ رہی تھی۔ سب بہنوں میں وہ سب سے خوب صورت اور کچھ دار تھی مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ زندگی پھر بھی اسی دائرے میں گھومتی رہتی ہے موی پلاسٹک کی بوتلیں کاٹ رہی تھی اسے گلہ ان بناتے تھے۔

”خالہ گلہ ان کیسے بنتے ہیں؟“
 ”ارے بہت آسان ہے تم لوگ بھی بنا سکتے ہو۔“
 ”جی آپ ہمیں گلہ ان بنانا سکھا دیں گی پلیز۔“
 قینچی سے کلیاں کاٹتی وہ مسکرائی تھی۔

”ضرور سکھاؤں گی میری جان..... جیسے جیسے میں کر رہی ہوں مجھے دیکھتے جاؤ۔“ نیم درک شروع ہو چکا تھا صبوحی مطمئن سی کوکب کے پاس آ بیٹھی تھی۔
 ”اور سنائیں آپ..... کیسی گزر رہی ہے؟“

تانبہ نے چور نظروں سے ان کے سوٹ کو دیکھا تھا جو آج وہ کوئی مسلسل چوکی بار پہن کر آ رہی تھیں ”کیا شادی کے بعد ہر عورت کی زندگی میں بس یہی کچھ رہتا ہے..... خواہشیں، ادھورے خواب، حسرتیں۔“ زندگی سب عورتیں ایسے گزار دیتی ہیں؟ اماں، بائی اور.....؟؟
 ”تم ہر بار یہی سوال کرتی ہو کوکی..... اور ہر بار ایک ہی جواب ہوتا ہے میرے پاس۔“ وہ اٹھ کر بچن کی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی تھی۔

”ننکا ننکا اکٹھا کر کے، جوڑ کے، فجر شام ایک کر کے چڑیاں گھونٹے بناتی ہیں اور پھر ایک آندھی کی دونوں کی محنت، رباخت کو پر باد کر دیتی ہے..... آندھاں اچھی چیز نہیں ہوتیں۔“ ننکا شہدائی ہوا کرتی تھی وہ فلسفے کی..... گہری باتیں ابھی ہی مگر زندگی کے آگے تو مانو ساری کتابوں کے سبق بھول گئے تھے۔ صبوحی فیاض کو بھی زندگی نے عجب ڈھنگ سے برتا تھا۔

”پریشان مت ہوا کریں آپ۔“ کوکب کو بس دلیلیں اور سلیاں دینا ہی تو آتا تھا۔
 ”میں انسان ہوں کوکب..... مجھے فرشتہ مت بناؤ

ہم شادی شدہ عورتوں کے پاس جادو کی چھڑی نہیں ہوتی کہ سب بدل جائے اور ہم کبھی خوش رہیں۔“ صنفیہ آواز میں دے رہی تھیں کوکب باہر نکل گئی تھی۔ تانبہ نے صبوحی کو مسکرا کر دیکھا تھا۔

”یہ کوکب کا کیا معاملہ ہے، دادی غصے میں تھیں۔“
 بانس کے جھنڈ پر شہد کی کلیاں منڈلا رہی تھیں۔
 ”کوکب نے لی وی کے ایک تقریری مقابلے میں حصہ لیا تھا۔“ غلم اور ہم نصائی سرگرمیوں کی دلدادہ صبوحی کو خوش گوار حیرت ہوئی تھی۔

”تو کیا وہ مقابلہ ہار گئی؟“ تانبہ برتن دھو چکی تھی اور اب ٹوٹی تلے اسٹینج بھگور رہی تھی۔ صبوحی کیبنٹ کھول کھول کر چیک کرنے لگی تھی۔
 ”نہیں..... جیت گئی۔“

”تو پھر.....؟“ مقابلہ جیتنے پر اس گھر کے لوگوں کا رویہ کم از کم اس کی سمجھ سے تو باہر تھا۔

”اعتراض لی وی پر آنے پر ہے مقابلے کی ہار جیت پر نہیں۔“
 ”مگر کیوں۔“

”وہی کے سولوگوں نے دیکھا ہوگا..... کیسی کیسی نظریں نہ پڑی ہوں گی..... زمانے کا ڈر..... سماج کی باتیں۔“ اور ایسی بات پر صبوحی کی ہنسی چھوٹی تھی وہ ہنسی روک نہیں پاتی تھی۔

”اف..... اف یہ ہم ٹڈل کلاس لوگوں کی سوچ لب بدلے لگی۔“ موی گلہ ان اٹھائے اندر آئی تھی۔
 ”آپا دیکھیں۔“

”ارے واہ یہ تم نے بنائے ہیں یقین نہیں آتا۔“
 ”دیکھ لیں پھر ہر بار گھر کی مرغی دال برابر تو نہیں ہوتی۔“

تانبہ نے اسے دھوکا جڑا تھا۔ ”تم واقعی مرغی ہو۔“

شام سات بجے وحید بھائی انہیں لینے آ گئے تھے..... جاتے وقت صبوحی کوکب کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی..... آواز سرگوشی میں ڈھل گئی تھی۔
 ”دلیل سے، لفظوں سے، عقل سے ہماری جنگیں

جیت لی جاتی ہیں تم کیوں جیتی ہوئی جنگ ہمارے کو تیار نہیں ہو..... کوکب فیاض..... یہی وقت ہوتا ہے اور چار دیواری جو کچھ کرنے کو اکسانی ہے ورنہ آگے تو بند کھڑکیاں ہی ملتی ہیں..... جس، دھشت کے سوا کچھ ہاتھ آتا ہی نہیں..... راست طویل کسی مگر منزل آگے ضرور ہے..... فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

لاہوری میں پن ڈراپ سائیکس تھا۔ ”وہ کیا سمجھتی ہے اپنی اولاد کو آگے کر کے وہ مجھے موم کر لے گی..... ہرگز نہیں ساری زندگی اس نے مجھے بلیک میل کیا ہے ہر خواہش منوائی ہے لاڈلی بیٹی تھی میری، لاڈلے رشتے میں تو جان تک دے دی جاتی ہے۔ ہر چیز میں نے اس کے قدموں میں لا کر رکھ دی..... بیٹیاں ایسی ہی تو ہوتی ہیں۔ مگر اس نے کیا کیا؟ میری دستار اچھالی۔ ایسے کرتا ہے کوئی اتنی محبت، پیار کا کیسا صلہ تھا..... ماں باپ کی اتنی قدر بھی نہ کی، جنہوں نے پالا پوسا..... بڑھایا نکھایا..... اور ایک انجان شخص کی وجہ سے سب مٹی میں ملا دیا۔“ میری طرف ان کی پشت تھی وہ پیشوں کے پار دیکھ رہے تھے۔ میں نے ہوا میں مٹی کی مقدار کو بڑھتا ہوا محسوس کیا تھا۔
 ”چھوٹی سی تھی پاؤں پاؤں چلتی تھی کبھی میں نے گرنے دیا؟ روتی تھی تو میرا کیجھ پھٹتا تھا، باپ تھا ناں..... خون تھی وہ میرا خون کا درد ہمیشہ خون کوئی تو آتا ہے مگر فریال کو میرا درد نہیں آیا..... ذرا بھر بھی نہیں آیا میں تارا..... اب اس نے تمہیں وکیل بنا کر بھیجا ہے..... آخروہ سمجھتی کیا ہے مجھے؟ بتاؤ جواب دو۔“ وہ چلاتے ہوئے میری طرف مڑے تھے میز پر پڑے کپ پر کب کی چائے کی تین بن چکی تھی۔

ایسے سامنے کھڑے شخص کی ہر بات مجھے عجیب لگ رہی تھی۔ وہ ضبط کی انتہاؤں پر تھے، وہ اپنی بیٹی کی وفات تک سے انجان تھے۔ میں نے جیسے اپنے آپ کو کسی سرنگ میں کھڑے پایا تھا اندھیرا دور دور تک پہنچ بیک اٹھا کر میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی زندگی نے عجب موڑ پر آ کر جنگلشن بدلا تھا..... وہابی کا بھانج

سفر میرا منتظر تھا اور اس کے بعد؟ وہ اکیلا گھر جو میرا نہیں رہا تھا چچا زاد کی ہوس بھری نگاہیں دل چاہا ہیں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دوں..... اس کمرے کی ہر ہر شے مجھ پر ہنس رہی تھی۔ قہقہے لگا رہی تھی..... وال کلاک، دست چائیم اور الماریوں میں قفروں سے بند پڑی کتابیں۔

وہ بغور مجھے دیکھ رہے تھے۔ ”میں امی کی ہر غلطی کی آپ سے معافی چاہتی ہوں۔“

”غلطی نہیں گناہ! گناہ! اماں باپ کی نافرمانی گناہ ہوتی ہے غلطی نہیں۔“ میں سر ہلاتی مڑی تھی اور پھر بیٹی بار فرمان صاحب کی نظر پیٹھ بیک پر پڑی تھی جیسے کوئی تھکا مارا مسافر دور پار سے آیا ہو مسند، دریا اور گھاٹیاں عبور کرتا اور پھر پتا چلتا ہے جہاں منزل ہوا کرتی تھی وہاں اب فقط ریت کے ٹیلے ہیں اونچے اونچے اور اندھاں چلنے پر مصر..... اس کی آنکھیں، پیشانی بالکل فریال کی طرح تھیں۔ فرمان صاحب کا دل کانپا تھا مگر اتنا کے بت کہاں آسانی سے ٹوٹے ہیں.....؟ کبھی بھی تو نہیں۔ دروازے کے پنڈل پر میرے ہاتھ تھے جب میں نے پیچھے سے ان کی آواز سنی تھی۔

”اے کہنا اب دستیں دینے سے کوئی فائدہ نہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا جہاں اتنا عرصہ گزار لیا وہاں بڑھا بھی گزر جائے گا۔“

”وہ خود یہ دنیا چھوڑ کر جا چکی ہیں۔“ ☆☆☆

فریال فرمان کی وکیل، ابھی اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے گئی تھی اور گلاس ٹیبل پر رقتہ چھوڑ کے گئی تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے وہ رقتہ اٹھاتے کھڑکی کے سامنے والی کرسی پر آن بیٹھے تھے وہی موتیوں سی چمک دار لکھائی بہتے پانیوں سے لفظ۔

”السلام علیکم اما..... کیسے ہیں آپ؟ جانتی ہوں آپ سے سوال کرنے کا ہر حق میں کھوجی ہوں اور اس میں آپ کی کوئی بھی غلطی نہیں ساری غلطیاں

زندگی کا روگ بن جاتا ہے۔ آپ سچ کہتے تھے کچھ باتیں، صحتیں وقت پر کچھ کیوں نہیں آتیں؟ دل چاند مانگے تو آسمان کی طرف سیڑھی کھڑی نہیں کر لی جاتی..... آج اپنی مرحومہ ماں، آپ کے اور بھائی بارے میں سوچتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے..... کاش اس وقت ایک پتھر مار کر کہہ دیتے کہ فریال تمہیں اپنی زندگی کے فیصلے لینے کا حق نہیں..... آپ نے ساری زندگی بس یہی تو نہیں کیا پھولوں کی چھڑی تک سے نہ مارا۔

اور اسی بات نے مجھے دل کی راہ کا راہی بنا دیا..... دل اور بیناں اگر بغاوت پر اتر آئیں تو انہیں پھنسر کے زور سے ضرور چپ کر دینا چاہیے..... یہ جو بغاوت ہوتی ہے ناں سراسر نقصان کرتی ہے..... سکندر حیات کی محبت نے مجھے ایسے ہی باغی کر دیا۔ مجھے سب بھول گیا اماں..... سب کچھ یاد رہا تو فقط دل اور یہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ محبت دنیا تو نہیں مگر دنیا کا ایک چھوٹا سا حصہ ضرور ہوتی ہے جو اسے پوری دنیا سمجھتے ہیں غلط کرتے ہیں صرف محبت کے سہارے زندگی کہاں ٹرتی ہے دل کی بھوک مٹ جاتی ہے مگر پیٹ کی بھوک؟ آپ کی نافرمانی نے کبھی سکون کا سانس تک نہیں لینے دیا اور یہی میری سزا تھی۔

سکندر کے جانے کے بعد زندگی نے مجھ پر بہت ستم کیے اماں..... بہت..... آپ کی فریال ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اپنے کھڑے خود جن کراچی عمارت خود سے کھڑی کرنا پڑی..... آپ کی نواسی کے لیے اپنی بیٹی کے لیے..... زندگی کی دُور کٹنے کو ہے اماں۔ اب میرے پاس وقت بہت کم ہے..... بہت دل چاہتا ہے کسی روز چپکے سے آکر آپ کے سامنے کھڑی ہو جاؤں..... دھککاریں گے..... ماریں گے مگر کب تک۔ آخر پھر گلے سے لگا ہی لیں گے۔ ساتھ ساتھ ماں باپ کا ظرف تو کائنات سے بھی بڑا ہوتا ہے..... مگر ڈرتی ہوں اور رک جاتی ہوں..... زندگی نے آپ کی فرد کے ساتھ اچھا نہیں کیا..... بہت تھوڑا

وقت ہے میرے پاس ہو سکے تو معاف کر دیجیے گا۔ دنیا کی بھیڑ میں آپ کی نواسی نین تارا بالکل اکیلا ہے..... لاوارث..... اگر ہو سکے تو اسے پناہ میں لے لیجیے گا۔ نواسی نہ کسی..... انسانیت کی خاطر ہی اسی میری نین تارا بہت محسوس ہے اماں..... اور دنیا کا شاطر..... امید ہے میری غلطیوں کی سزا نین تارا کو نہیں پہنچتی پڑے گی۔

آپ کی لاڈلی فریال وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے تھے..... آنے والی پھر موسم کرچکی تھی اور اب کب کی جا بھی چکی تھی۔ انہیں وہ یاد آتی تھی سادہ لان کے جوڑے میں ملبوس، بار بار دوپٹا ٹھیک کرتی، کانپتے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پاتی..... ہائے..... نین تارا سکندر حیات کا چائے کا ٹپ ویسے کا ویسا بڑا رہ گیا تھا..... کب پر چائے کی تہ بن چکی تھی وہ اضطرابی کیفیت میں اسٹل حماد کا نمبر ڈائل کرنے لگے تھے..... شیشے کی کھڑکیوں سے دھوپ چمن چمن کر اندر گرنے لگی تھی..... وال کا..... کیا رہ بجا رہا تھا۔ وقت جاگ رہا تھا۔ ☆☆☆

بڑے شہر کے بڑے لوگوں سے مجھے بے تحاشا خوف آیا تھا..... آسمان ہلکے بادل اوڑھنے کو بے تاب کھڑا تھا..... پھر وہی ریلوے اسٹیشن تھا، بڑے شہر کا بڑا ریلوے اسٹیشن..... دھاتی چھت تھی ہوئی تھی..... ریل کی ہڈیاں پھٹکی ہوئی تھیں۔

I hear my ink spill
When the spirit called 'I
descended'
The light flickering
My oil' Lamp dying
While a drumbeat of
emptiness rose
Up the mountain !!!

”چلو..... تمہیں دادا نے واپس بلایا ہے۔“ اسٹل حماد پھر سے میرے سامنے تھا، میری آنکھیں بھر

آئی تھیں پچھلے چالیس منٹوں میں، میں طرح طرح کے لوگوں کی نظریں برداشت کر رہی تھی ایک لاوارث لڑکی..... نین تارا سکندر حیات۔

”سمجھ گیا رکھا ہے سب نے مجھے۔ میں کوئی گڑیا ہوں یا کھلوتا..... ٹھوکریں ماری جا رہی ہیں اور میں لاٹھکتی پھر رہی ہوں..... دل ہے میرا، انسان ہوں میں، برداشت نہیں میری اتنی جتنا مجھے آزمایا جا رہا ہے۔“ میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

”آئی ایم سوری۔“ وہ دروازہ خود بردلا کر میرے پاس بیٹھ گیا تھا..... بارش کی پہلی بوند میرے بالوں میں کم ہوئی تھی۔

”سوری فار واٹ؟ میری زندگی میرا مسئلہ ہے تھک چکی ہوں میں سب سہتے اور کتنی جرات لاؤں خود میں..... کہاں تک برداشت کروں سارے دکھ، درد، تکلیفیں میرے واسطے ہیں۔“

”سب کی زندگی میں دکھ درد، تکلیفیں، آزمائشیں ہوتی ہیں نین تارا.....“ میں ارد گرد زرتے لوگ اسے اشارے کر کے دکھا رہی تھی۔

”انہیں دیکھو..... یہ ہنس رہے ہیں۔ مسکرا رہے ہیں۔“ وہ دھیرے سے ہنسا تھا۔

”ان کی ہنسی برمت جاؤ نین تارا!“ خنک جے ہوا کے زور سے اسٹیشن کے فرش پر اڑنے لگے تھے..... وہ میرا پیٹھ بیک تھا اسے کھڑا تھا..... ناچار مجھے بھی ساتھ اٹھنا پڑا تھا..... میں ہولے ہولے اس کے پیچھے چل رہی تھی۔

”تم فریال پچھو کی بیٹی ہو..... آج تو دادو نے مجھے سر پرانڈ ڈکر دیا..... میری بڑی خواہش تھی کہ میرا کوئی کزن ہو اور وہی میرا ہیٹ فرینڈ بھی ہو۔“ وہ کتنا بولتا تھا..... وہ میری طرف بڑا تھا۔ ”ایک بات پوچھوں؟“

”جی.....؟“ ”یہ تمہاری آنکھیں اتنی موٹی موٹی کیوں ہیں؟“ مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہ پوچھے گا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“ میرے غصے

سے کہنے پر وہ گڑبڑایا تھا۔

”اوہ سوری، سوری۔“ گھر تک سارے راستے وہ بولتا آیا تھا۔ کچھ لوگ کتابوں لے رہے ہیں اور ان کی زبان بھی نہیں کھلتی۔ ہمت کی بات ہے دیے۔

وہ سڑکیوں کے پاس کھڑی تھیں۔ طرحدار اور فیشن سٹیل خاتون۔ جنہیں دیکھ کر وہ لفظ ہی پاو آتے تھے۔ فاسٹ اور اسٹائل۔ انہوں نے بیچ کر کی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی اور جس کی وہ قال درست کرتی میری طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

”اوہ۔ تو تم فریال کی بیٹی ہو۔؟“ ناقدانہ نظر سے میرا جائزہ لیتی، وہ مجھے خائف کر گئی تھیں۔

”جی۔“

”تمہارے نقوش میں فریال کی جھلک ہے خاص طور پر تمہاری آنکھیں تو بالکل فریال جیسی ہیں اور ان ہی آنکھوں کا اسر سکندر حیات ہوا ہوگا۔ تمہاری ماں نے بہت غلطی کی اس ٹٹ پونچھے سے شادی کر کے۔ صرف شکل و صورت ہی تو اچھی تھی اس کی۔“ جانے خوب صورت لوگوں کے بولے گئے اکثر لفظ اور لہجہ خوب صورت کیوں نہیں ہوتے۔

”میں ماما ہی ہوں تمہاری ارشدہ رحمان۔ اب میں ایک پارٹی پر جا رہی ہوں۔ سی پوائیکن بائے۔“ ہاتھ ہلاتی وہ آگے بڑھ گئی تھیں۔ اور پھر میں نے انہیں سڑکیاں اترتے دیکھا تھا۔

انہوں نے میری پیشانی چوم لی تھی۔ ”تمہارا اس سب میں کوئی قصور نہیں میری بیٹی۔“ میں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی فرمان صاحب نے مجھے سینے سے لگا لیا تھا۔

”مت روئیں تارا بیجے۔ میرے دل کو تکلیف ہو رہی ہے۔“ وہ میرے آنسو پونچھتے جاتے تھے اور خود بھی روتے جاتے تھے۔

”وہ بالکل تمہارے جیسی تھی۔ ایسی ہی سادہ۔۔۔۔۔ معصوم، ہائے میری بیٹی۔“

ارسل بانی کا گلاس لیے کھڑا تھا۔

”دادو۔۔۔۔۔ پلین پانی پی لیں۔“ وہ اصرار کر رہا تھا۔

”جسٹ کو بلا ڈارسل۔“ جمشید دوڑا آیا تھا۔

”کیا کھاؤ گی بیٹا۔۔۔۔۔“ میں نے دل میں اب جا کر سکون اترتا محسوس کیا تھا۔ ”فریال کو بیٹھا بہت پسند تھا۔“ وہ جمشید کو ان گنت ڈسٹ نوٹ کرانے لگے تھے۔ ”میری بیٹی آئی ہے۔“

ارسل ہنسا تھا۔ ”دادو۔۔۔۔۔ مجھے تو آپ بالکل ہی بھول گئے ہیں۔“

”ارے نہیں یار۔۔۔۔۔ تم بھولنے کی چیز تھوڑی ہو۔“

شیشے کی طرح وہ گھر چمک رہا تھا گھر کا انٹیریئر لاجواب تھا۔ دیواریں پینٹنگز سے سجی تھیں۔ کارنس قیمتی نوادرات سے سجے ہوئے تھے۔ مالی گلدانوں میں تازہ گلاب سجا رہا تھا۔ تو کیا واقعی اولاد کی اولاد، بہت پیاری ہوئی ہے؟ وہ بار بار میری طرف پیار بھری حقیقی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

میں نے ایک نظر اپنے لباس اور جوتوں پر ڈالی تھی۔۔۔۔۔ میں کتنی ”مس فٹ“ لگ رہی تھی اس گھر میں اور وہ سانسے بیٹھا تھا۔ دراز قد، خوب رو، خوشبو میں اڑاتا ہوا۔۔۔۔۔ کتنا فرق تھا ان کی اور میری کلاس میں۔۔۔۔۔ میں تو صرف اور صرف نین تارا اسکندر حیات تھی۔ تو یہ تھا وہ گھر جہاں میری ماں نے اپنی زندگی کے پچیس سال گزارے تھے۔ اس گھر میں فریال فرمان کی خوشبو بھی بکھی ہوئی تھی۔

اس دو پہر کھانے کی میز پر انواع و اقسام کے پکوان دیکھ کر مجھے اپنے گھر کا پکوان یاد آیا تھا۔۔۔۔۔ وال روٹی اور اچار کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا تھا اور میری مجلسوں میں رہنے والی ماں کیسے مبر شکر کر کے کھانا کھاتی تھی۔

”نین تارا۔۔۔۔۔ چاہے کھانے کو ایک نوالہ ہی کیوں نہ لے اگر حلال کا ہو تو بھوک مٹ جاتی ہے اور بندے کا ضمیر مطمئن رہتا ہے۔“ میری بے چاری ماں کے سینے پر کیسا بوجھ تھا۔۔۔۔۔ والدین کی نافرمانی کا بوجھ۔۔۔۔۔ نوالے جیسے میرے حلق میں چھپنے لگے۔

تھے۔ زندگی جانے آگے کیا کیا رنگ دکھانے والی تھی۔

☆☆☆

”میں ایکشن میں حصہ لے رہی ہوں۔“ کینیٹین میں ابھرنے والی کوکب فیاض کی آواز نے سارے گروپ کو ایک بل کے لیے خاموش کر دیا تھا۔ جرنل رجب سے جھکا ارسل سراٹھانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ فیشن میگزین پر تبصرے کرتی نین تارا اور گھٹ ایک ساتھ چوکی تھیں۔ حماد کو لڈو رنگ لے کر آ رہا تھا۔

”تم یعنی کہ تم۔۔۔۔۔؟“ ارسل کو یہ بات ہضم نہیں ہوئی تھی۔

”جی ہاں۔۔۔۔۔ میں یعنی کہ کوکب فیاض۔“ وہ چپا چپا کر بولی تھی۔

”میں تمہارا مز تو ڈوں گا۔“

”تم ہوتے کون ہو میرا مز تو ڈنے والے؟“ وہ تینوں ہمیشہ کی طرح ان دونوں کی بحث سر پہل کر سن رہے تھے۔

”میں بھی دیکھتا ہوں تم کیسے حصہ لیتی ہو۔“ شوکر سے کرسی اڑاتا، وہ یونیورسٹی سے قریبی ٹریک سپاٹ کی طرف نکل گیا تھا۔

”وہ ہوتا کون ہے مجھے ایسے کہنے والا۔“ اس کی شہری رنگت غصے سے دھبہ رہی تھی نین تارا ہر بار کی طرح اس پر سے نظریں نہیں ہٹا سکتی تھی۔

کالے لان کے پرنڈ سوٹ میں بلبوس، جالی وارد پٹے میں وہ غصے سے کھولتی بہت حسین لگ رہی تھی۔۔۔۔۔ سائولی سلونی رنگت میں تنگین استخراج تھا۔ بالوں کی چند ٹیس اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ ہوتے ہیں ناں کچھ لوگ، کچھ چہرے جو باوجود آپ کو مانوس لگتے ہیں۔ آپ کا دل ان کے لیے بے تحاشا پیار رکھتا ہے، کوکب فیاض بھی نین تارا اسکندر کے لیے وہی چہرہ تھی۔ یونیورسٹی کی کینیٹین میں بلا کارش تھا۔۔۔۔۔ فیشن، گیمز اور خوابوں کی بہاریں ان بہاریں تھیں۔

”وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کوکب! تمہیں اپنا فیصلہ واپس لینا ہوگا۔“ نین تارا نے اس کے ہاتھ تھامے تھے۔ حماد کی نظریں بار بار بھٹکتی تھیں۔ وہ لڑکی شروع دن سے اسے متاثر کرتی آ رہی تھی۔ وہ جو اول نمبر کا فکرتی تھا اور نشو و نما کی طرح لڑکیاں بدلتا تھا اب بھول بھال چکا تھا۔۔۔۔۔ نکلتی چہرہ اور غزالی گھور سیاہ آنکھیں حماد درانی کے دل کی دنیا کو تیرا بلا کر دیتی تھیں۔ وہ آنسو پس کی طرح جلا جاکا تھا۔

”نینو۔۔۔۔۔ میں لڑکی ہوں صرف اس وجہ سے پیچھے ہٹ جاؤں؟ یہ مردوں کی دنیا ہے اور ہم عورتیں کمزور ہیں مگر کب تک۔“

”ایسی بات نہیں ہے کوکی۔“

”تو پھر کیسی بات ہے تم اپنے لئے دماغ کے کزن کو یہ بات سمجھاؤ۔“ کم از کم وہ اپنا دماغ ٹھنڈا رکھے میں پیچھے نہیں ہٹنے والی۔“ کوکب کے سب لیتی وہ تپتی ہوئی تھی۔

ان پانچوں کا جرنلزم کا گروپ پوری یونیورسٹی میں مشہور تھا ہر میدان میں وہ آگے تھے۔ کوکب فیاض ماہر ڈیزائنر تھی۔ نین تارا اسکندر کا لم ٹکا رہی تھی۔۔۔۔۔ ٹھہرت اور حماد کارٹونسٹ تھے۔ اپنی تصویروں کی وجہ سے وہ پوری یونی میں پاپولر تھے۔ ارسل رحمان ایک اچھا ساغ، بہترین ریڈر اور زبردست مداح ہونے کا فرض ایک ساتھ سر انجام دیتا تھا۔

نین تارا اور کوکب کی شناسائی ایک تقریری مقابلے کے بعد ہوئی تھی جس میں کوکب نے ڈانس تو ڈکر ثانی اپنے نام کر لی تھی۔ سامعین میں بیٹھی نین تارا کو سارے عرصے میں اس کے ہاتھ کی ٹگر لگی رہی تھی۔۔۔۔۔ مقابلے کے اختتام پر وہ راہداری میں اسے روکے کھڑی تھی۔

”ایٹسکو زی۔“

کوکب نے سامنے کھڑی کنفیوز سی انگلیاں پٹختی لڑکی کو دیکھا تھا جو یقیناً اسی سے ہی مخاطب تھی۔

”جی۔۔۔۔۔“

”آپ کا ہاتھ تو ٹھیک ہے ناں؟“ کوکب کھٹکتی

ہوئی تھی۔

”ارے..... مجھے کچھ نہیں ہوتا..... بہت سخت جان ہوں میں..... اپنے تقریری کیریئر میں دس ڈانس توڑ چکی ہوں۔“

”کیا واقعی؟“ غزالی آنکھوں میں حیرت بھر گئی تھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔
”یہ میرے لیے معمول کی بات ہے۔“ وہ اترتی تھی۔

”آپ بہت اچھا بولتی ہیں..... لفظ، انداز، سب امیزنگ۔“

”اوہ رینلی..... سونائس آف یو۔“ راہداری کے پلروں سے ٹکرانی دھوپ ان کے قدموں میں گر رہی تھی..... وہ دونوں جرنلزم ڈپارٹمنٹ کی طویل روش پر چہل قدمی کرتی رہی تھیں۔ وہ نین تارا سکندر کے لیے یادگار دنوں میں سے ایک یادگار دن تھا۔ وہ چالیس منٹ بہت لمبی تھی جن میں انہوں نے دنیا جہان کے تمام موضوعات پر گفتگو کر لی تھی..... کوکب ایک زندہ دل اور پراعتماد لڑکی تھی اس سارے عرصے میں جیتی گئی ثنائی ایک اعزاز کی طرح نین تارا پکڑے رہی تھی..... وہ بار بار متاثر ہو کر اسے دیکھتی تھی اسے کوکب فیاض جیسا بننا تھا۔

”جب تک ابا زندہ تھے میں نے پھر کسی مقابلے میں حصہ نہ لیا۔“ میں جانتی تھی اگر ایسا کرنی تو تعلیم کے دروازے ہم پر بند ہو جاتے..... ہم ٹڈل کلاس لوگوں کے پاس ایک تعلیم ہی تو ہوتی ہے جو کسی نئی زندگی میں روزانہ کام دیتی ہے ورنہ ہم جیسوں کے لیے زندگی بہت سی آزمائشیں تیار رکھتی ہے..... زندگی سے جنگ آسان نہیں ہوتی مینو.....“ وہ گہری باتیں کرتی تھی پیاز کی پرت جیسی..... ورق در ورق۔

”دادی کو ساری زندگی ابا کے ہاں وارث نہ ہونے کا قلق ہی رہا۔ کیا وارث کا ہونا نہ ہونا عورت کے ہاتھ میں ہوتا ہے..... خدائی کاموں میں ہمارا کیا دخل۔“

ایک ملاقات میں ہی وہ گوڑی سہیلیاں بن گئی تھیں۔ وہ دونوں اس کے بعد ساتھ ساتھ دکھائی دینے لگی تھیں..... لکٹین میں، لاہور میں، ایڈمن بلاک میں، وہ ایک جان دو قالب تھیں..... ہر فری پریڈ میں وہ یونیورسٹی کی نہر میں پاؤں ڈالے جیسی ہوتی تھیں..... دونوں سائنڈوں کے درختوں کی شہنشاہ اور پھول نہر میں گرتے تھے..... برندوں کی آوازیں تھیں..... وہاں خاموشی اور بلا کا سکون ہوتا تھا۔

”میں خوش ہوں..... نانا اور ماموں بہت اچھے ہیں..... ارسل بھی بہت اچھا ہے بس کبھی کبھی مامی کی باتیں دل دکھاتی ہیں تو ائی بہت یاد آتی ہیں کوکی..... اپنے گھر اور گھر والوں سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔“

”اتنی قوی مت ہوا کرو مینو، برا اثر پڑتا ہے وہ تمہارے نانا کا گھر ہے تمہاری ائی کا حصہ ہے اس گھر میں اسے پرایا مت سمجھو..... زندگی ہر حال میں جینا سیکھو..... ماضی میں رہنے والے کبھی برسکون نہیں رہتے۔“ وہ پاس پر اچھول اٹھا کر کوکب کے کان میں اڑنے لگی تھی۔
”کوکو..... تم اتنی اچھی اچھی باتیں کیسے سوچ لیتی ہو۔“

”کوشش کرتی رہتی ہوں خوش رہنے کی، مثبت سوچنے کی..... ورنہ رونے دھونے کو تو بہت کچھ مل جاتا ہے۔“ ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ رکھے وہ غار ہوئی کوکب کو دیکھنے لگی۔

”کبھی کبھی لگتا ہے تمہاری زندگی میں کوئی پریشانی نہیں..... تم بہت برسکون دکھتی ہو۔“

”تمہارا چتا ہے کیا مسئلہ ہے مینو..... تم مسکراہٹ اور سکون کے پیچھے اٹھتے طوفانوں کو نہیں دیکھ پاتی ہو..... ایسے لوگ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں۔“ منہر کے پانی میں چھوٹے چھوٹے پتھر پڑتے رہے دائرے بنتے بگڑتے رہے اور پھول گرتے رہے..... کوکب فیاض وہیں بیٹھے بیٹھے جیسے گھر پہنچ گئی۔

تھی۔

پچھونے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

”جج کہوں تو صنفی میری مرضی کوکب کے لیے ہی تھی مگر ظفر کا دل نہیں مانتا..... اب زندگی ہم نے تو گزارنی نہیں ہے..... بچوں نے آگے زندگی گزارنی ہے ہم بوڑھے اپنی زندگی تو گزار چکے..... زبردستی تو ہم اپنا فیصلہ مسلط نہیں کر سکتے۔“

صنفی بیگم نے اضطراب سے پوچھا تھا۔ ”ظفر کا دل کیوں نہیں مانتا.....؟“

”کہتا ہے اسے کوکب نہیں پسند کھلے مزاج کی اور زبان دراز ہے ہاں اگر تم تانیہ مجھے ظفر کے لیے دے دو تو۔“

”تانیہ..... مگر میں کیسے.....؟“ دادی نے پائندان اٹھایا تھا۔

”ارے کاہے فکر کرتی ہو..... تینوں تمہاری ہیں جس پر ہاتھ رکھ دو۔“ جگ سے گلاس میں شربت انڈیلتی صنفی تپ اٹھی تھیں۔

”اماں..... وہ کوئی بھیڑ بکریاں نہیں ہیں جیتی جاگتی لڑکیاں ہیں۔“ دیوار سے لگی کوکب پتھر ہو چکی تھی..... کھلا مزاج اور زبان درازی؟ لفظ، لفظوں سے بدل جاتے ہیں پراعتمادی اور صاف گوئی کس ترازو میں تولی گئی تھیں۔ رات کو موسیٰ کوکب فیاض کی وکیل نئی دادی کی عدالت میں حاضر تھی۔

”کوکب نہیں تو تانیہ بھی نہیں..... یہ کہاں کا انصاف ہے۔“

”شہزادے نہیں اتریں گے تمہارے لیے..... گز بھر کی تو زبان ہے تمہاری۔“

”دادی..... آپ نا انصافی سے کام لے رہی ہیں۔“ مومنہ فیاض کی دہائی کو صنفی بیگم نے بریک لگا دیا تھا۔

”موسیٰ..... بڑوں کی باتوں میں جنہیں بولنے کا کوئی حق نہیں۔“ وہ جارحانہ پڑھنے لگی تھی۔ مومنہ کی باتیں دادی کو ناگوار گزری تھیں۔ تانیہ چکن کی کھڑکی میں کھڑی ہتھیلیوں کو گھور رہی تھی..... زندگی

کے رنگوں میں یہ کون سا رنگ آن شامل ہوا تھا۔ پچھلے سترہ منٹ دس سیکنڈ سے عدالتی کارروائی چپ چاپ منہی کوکب فیاض سیر جیوں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
”اماں آپ پچھو کو تانیہ کے لیے ہاں کر دیں۔“ ڈرون گر چکا تھا..... موسیٰ کے لیے سانس لینا مشکل ہو گیا تھا پائس کے پودوں پر بلی دیوار سے کودی تھی..... تانیہ نے آنسوؤں کو بہنے دیا اور دیوار سے ٹک لگائی تھی۔ زندگی کی گاڑی ایک اور جنٹیشن بدل چکی تھی زندگی اور انسان ساتھ ساتھ ہی تو بدلتے ہیں نین تارا سکندر کیسے کوکب فیاض کی ہنسی کے پیچھے جیسے طوفانوں کو بھانپ سکتی تھی مسکراہٹ ایک پردے کا ٹکس ہوئی ہے۔ بار بار اٹھنے والی..... آہ.....!!!

☆☆☆

”کبھی کبھی ہوتا ہے نہ ایسا کہ ہمیں زندگی سے، اپنے ماحول سے، ارد گرد کے لوگوں سے بے تحاشا شکایتیں ہوتی ہیں مگر پھر اچانک ہماری زندگی میں کوئی ایسا آتا ہے کہ پھر آہستہ آہستہ ہماری سب شکایتیں دم توڑ جاتی ہیں اور ہم سروائیو کر لیتے ہیں..... جینا شروع کر دیتے ہیں۔“ میری زندگی میں آنے والے اس ”کوکی“ کا نام ارسل رحمان تھا..... لوگوں کے لیے وہ ایک شخص تھا مگر میرے لیے پوری حیات ہو گیا تھا، بغیر کسی چھوٹی یا بڑی وجہ کے..... یہاں آنے سے پہلے میری زندگی کئی دوسروں، پریشانیوں کا شکار تھی، مگر اس نے میرے دل سے سارے خوف نکال دیے تھے..... ہر شام گھر کے سامنے والی روش پر ٹپکتے ہوئے وہ دروازہ خود رو اور نٹ کھٹ سا انسان زندگی جینے کے گرتا کرتا تھا۔

”لوگوں کو موقع نہیں دیتے کہ وہ آپ کی زندگی میں دخل اندازی کریں۔ آپ کے فیصلوں پر اعتراض اٹھائیں..... آپ کی زندگی ہے، جیسے چاہیں جیسیں..... ہم کسی کے لیے بھی اپنی ہنسی کی قربانی کیوں دیں تارا۔“

”مگے رہتا تو ہمیں اسی دنیا میں ہے ناں؟“
”یہ کون پھل رہی ہوئی تھی۔“

”دنیا تم سے ہے تم دنیا سے نہیں ہو۔ اپنی انا اور خودداری کی بہت حفاظت کرنا پڑتی ہے۔“ ٹھوکر سے پتھر اڑاتا مجھے وہ دنیا کا بے نیاز ترین انسان لگا کرتا تھا۔

”تمہیں صرف اور صرف نصیحتیں کرنا آتا ہے

ارسل رحمان..... ورنہ جتنے مسائل اور پریشانیاں میری زندگی میں ہیں کسی کی زندگی میں بھی نہیں ہوں گی۔“ وہ چلتے چلتے وہیں رک گیا تھا اس نے بل گم کا پٹا خانہ بنا کر پھوڑا تھا۔

”ہاؤ سو ریٹ..... اپنے آپ کو انٹالیٹ ڈاؤن نہیں کیا کرتے تم سے زیادہ اور لوگوں کی زندگی میں مسائل ہیں..... تم چند چھوٹی پریشانیوں کو رو رہی ہو۔“

”تم ایسے اندازے کیسے لگا سکتے ہو ارسل؟“

میں نے شاک کی کیفیت میں اسے دیکھا تھا۔

”اندازے نہیں ہیں حقائق ہیں۔ تم بتاؤ ذرا..... تمہاری زندگی میں ایسے کون سے مسئلے ہیں؟“

میں لکڑی کے بچے پر ڈھس رہی تھی۔

”میرا گھر نہیں ہے۔ والدین نہیں ہیں میں یتیم لڑکی ہوں۔“ میرے آنسو میرے ہاتھوں کی پشت پر گرنے لگے تھے۔ وہ میرے ہاتھ تھام کر بیٹھ گیا تھا۔

”کتنی مادہ پسند ہو رہی ہو تیری..... گھر بن جاتے ہیں رشتے آدمی دنیا کے پاس نہیں ہوتے۔“

وہ غصے میں ہمیشہ مجھے تیری کہتا تھا۔

کوئی آپ کی اتنی پروا کرتا ہو آپ کو ہر شام آٹکریم پارلر لے جاتا ہو، ہر نیا لطفہ سنانے کو بے تاب ہوتا ہو، آپ کو زندگی جینے کے ایک سو ایک طریقے بتاتا ہو، ہر سچ آپ کے لیے خود کا بنانا ہو، گھنٹوں آپ کی گھسی پٹی باتوں کو برداشت کرتا ہو، آپ کو یوریت سے بچانے کے لیے اپنی دن ڈش پارٹیز تک مس کر دیتا ہو..... اس سب کا مطلب ”محبت“ کے سوا کچھ ہو سکتا ہے کیا؟ اگر ہو سکتا ہے تو مجھے بتایا جائے تاکہ ارسل رحمان کو لے کر میری ساری غلط فہمیاں ایک ایک کر کے دور ہو جائیں..... ہر بار پتھر کا پتھر اڑاتا کرتے بھی بکھار کا پتھر بھی پتھر رحما

گرتے ہیں۔ تب ایسے ریزے نکھرتے ہیں کہ الامان۔

جنگجو ٹیک کے سب لیتی مائی نے مجھے روکا تھا ہر پازان کی نظریں مجھے اک انجمن میں جتلا کر دیتی تھیں۔ ”کو مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے۔“

”جی پوچھیں۔“ تم ارسل کے ساتھ ہوتی ہو یونیورسٹی میں، ہمیں وہ کسی لڑکی میں انوالو تو نہیں۔“

میں ٹھنک کر رہ گئی تھی یوں لگا تھا جیسے سارے جسم میں سونیاں ہی رینگ رہی ہوں۔

”نہیں مائی..... ایسی کوئی بات نہیں۔“ جانے کیوں میری آواز لڑکھرائی تھی۔

”میں تو ارسل کی شادی کسی ہائی کلاس فیملی کی لڑکی سے کروں گی..... آخر وہ ڈیزر رو کرتا ہے۔ میرا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے۔“ اس شام صحت کی رینگ پکڑے میں آسمان پر ابھرتے تارے دیکھ رہی تھی اور وہ پاس ہی جھولے پر لیپ ٹاپ کھولے بیٹھا تھا۔

”تم کسی میں انوالو ہو.....؟“ آدھے گھنٹے سے ارد گرد کے ماحول سے کٹا، وہ میرے سوال پر چونکا تھا۔

”کیا مطلب؟“

”سوال مشکل تو نہیں..... تم کسی میں انٹر سٹڈ ہو؟“ وہ لیپ ٹاپ بند کرنا مکمل میری طرف متوجہ ہوا تھا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے؟“ میں نے ہاتھ وجود کے گرد باندھ لیے تھے۔

”نہیں۔“ وہ میرے پاس آ کھڑا ہوا تھا تارے ڈھونڈتا..... وہ ہنستے ہنستے دل کے تار ہلا دیتا تھا..... اب بھی شور مچاتا تھا۔

”تم ہمیشہ غلط اندازے لگاتی ہو نین تارا!“

”تو اس کا مطلب تم.....؟“

”ہاں نین تارا!“ اور اس تاروں بھری رات میں، میں نے تاروں کو ٹوٹ ٹوٹ گرتے دیکھا تھا۔ اس شخص کے جواب نے تو جیسے نین تارا سکندر کی سائیکل تک روک لی تھی۔

☆☆☆

ایڈمن بلاک کی راہداری کے پاس وہ اسے روکے کھڑا تھا..... گلابی رنگ میں لمبوس وہ ارسل رحمان کا ہمیشہ کی طرح دل دھڑکا گئی تھی..... نظریں ایسی پڑتی تھیں کہ اٹھانا مشکل ہو جاتا تھا۔

”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟“ کوکب غصے سے جلی جلی ہوئی تھی۔

”تم ہو میرا مسئلہ.....“

”میں نے کیا کیا ہے.....؟“ کوکب نے حیرت سے شہادت دالی انگلی سینے پر رکھی تھی..... وہ زبردستی ہاتھ قہار اسے اسٹڈی لان میں لے آیا تھا..... گھاس کے تیز قطرے پر وہ دونوں بیٹھ گئے تھے۔

”آئی ایم ان لو.....“ کوکب خوشی سے اچھل پڑی تھی۔

”سچ ارسل تم نے اسے بتایا؟“ اس کے چہرے پر جیسے خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی۔

”نہیں اب بتانے لگا ہوں۔“

”ہائے اللہ..... وہ سنے گی تو خوشی سے مر جائے گی۔“

”وہ کون.....؟“

”نین تارا اور کون..... میں تو کئی دنوں سے اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے محبت دیکھ رہی تھی۔“

”میں نین تارا سے محبت نہیں کرتا کوکب۔“

اسٹڈی لان کی طرف ان کے قریب آتی نین تارا وہیں ایڈمن بلاک کے سامنے جیسے ذہن ہو گئی تھی.....

اس شام وہ ذکر ادھورا چھوڑ گیا تھا پورا ذکر آج پوری جان لے گیا تھا۔ وہ اٹنے پاؤں واپس بھاگی تھی کوکب فیاض کو ساری یونیورسٹی چھان لینے کے بعد وہ انجمن میں نظر آئی تھی، کچھ تھا جو محسوس ہوتا تھا..... وہ کرسی چھٹی پاس بیٹھ گئی تھی۔

”تم یہاں کیوں بیٹھی ہو میں ساری یونی میں جہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔“

”بھیجی بھی اچھا لگتا ہے ناں کوکب چرکی سے، آس پاس سے کٹ کر اکیلے، بیٹھنا..... بھیجی تو اپنی

آواز سنائی دیتی ہے۔“ وہ اس دنیا کی نہیں لگ رہی تھی..... تیز ہوا لاہور کی کھڑکیوں سے ٹکرائی تھی۔

”تم اتنی زور ورج کیوں ہو رہی ہو نین!“

”ای بہت باد آ رہی ہیں کوکب..... بہت۔“

نین تارا نے کس غم کو کس غم سے جوڑا تھا..... کوکب نے اسے خود سے لگا لیا تھا..... عجب بات تھی کوکب فیاض، نین تارا کو آج بھی بری نہ لگی تھی..... ورنہ بات چھوٹی تو ہر گز نہیں تھی۔

☆☆☆

کوکب فیاض میرے معاملے میں کیسے اتنی نا سمجھ اور لا پرواہ ہو سکتی تھی..... کیسے؟ وہ تو میری دنیا کی اچھی رازدار دوست تھی اندر تک سب کچھ پڑھ لینے والی..... اس نے کیسے یقین کر لیا تھا کہ میں ارسل رحمان سے محبت نہیں کرتی تھی..... نہر کے پانی پر پھولوں کی پتیوں تیر رہی تھیں۔

”نہیں کوکب..... ہم اچھے دوست ہیں بس۔“

مجھے ارسل رحمان سے کیسے محبت ہو سکتی ہے مجھے تو وہ پہلی نظر میں ہی برا لگا تھا میرا دل اس کا منہ توڑ دینے کو چاہا تھا..... نین تارا صرف زبردستی ہنس کر دکھائے اور کوکب فیاض یقین کر لے۔ جو بھی نہیں ہوا تھا آج ہو گیا تھا۔

”تم کیوں پوچھ رہی ہو کوکو.....؟“ ہوتا ہے ناں سچے لوگ..... کبھی بکھار کر جاتے ہیں پھر وہ ساری زندگی کے لیے سچے نہیں رہتے۔

”دوڑے ہی تارا کبھی مجھے تمہاری اور ارسل کی اتنی انجمن دیکھ کر لگتا ہے۔“ ہر بار نہر میں درخت پھولوں کی پتیوں نہیں گراتے تھے۔ آج درخت خار گرا رہے تھے اگر میں وہ خار دیکھ رہی تھی تو کوکب فیاض کو وہ نظر کیوں نہیں آئے تھے۔ اس کی نظر بدل گئی تھی یا پھر وہ خود ہی ساری کی ساری بدل گئی تھی..... زندگی کے جھٹکشن بدلنے کا رونا روتی میں محبت کے جھٹکشن بدلنے کا دکھ بھی برداشت کرنے والی تھی۔

”نہیں کوکب، تمہیں غلط لگا تم ہی تو کہتی ہو ہر ہنسی کے پیچھے اک راز ہوتا ہے اسی طرح ہر تعلق کے

روئے میں بھی راز ہوتا ہے۔ میرے اور ارسل کے فعلق میں دوستی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ ایک کھنک دار قبچہ درختوں کے جھوم میں گھس گیا تھا۔

”تم کیسا فلسفہ بول رہی ہو۔ کتنی بڑی تبدیلی ہے۔“

”ہاں ہر تبدیلی بڑی ہوتی ہے۔“

”آؤ۔۔۔۔۔ ذرا بیٹھتے ہیں۔۔۔۔۔ بیٹھے بیٹھے حکمن سی ہو گئی ہے۔“ چڑیوں کے جھنڈ اس نے تالی مار کر اڑائے تھے وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتی تھی۔ آج پہلی بار مجھے چڑیوں کا دکھ محسوس ہوا تھا۔ کبھی کبھی ایک دکھ اور کتنے ہی سائجے دکھ ساتھ لیے چلا آتا ہے۔

”تا نے میرے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔ تمہارے کتنے مسسٹر باقی ہیں۔“

”دو مسسٹر باقی ہیں نانا۔“

”ٹھیک ہے پھر تمہاری اور ارسل کی منگنی کی تقریب رکھ دیں گے۔“ زلزلے یونہی تو آتے ہیں۔ بغیر کسی جا پ کے عمارتیں شور سے گرتی ہیں میں نے اپنی آواز کو پھٹکا ہوا محسوس کیا تھا۔

”نانا۔۔۔۔۔ آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟“

”میں ایسا کیوں نہیں کر سکتا میں نانا!“

”آپ نے مجھ سے پوچھا تک نہیں۔“

”ارسل اچھا لڑکا ہے جتنا وہ تمہیں خوش رکھے گا۔“

”میں اچھی نہیں ہوں نانا۔۔۔۔۔ میں نہیں ہوں۔“

میں باہر آ گئی تھی۔۔۔۔۔ ارشد رحمان سامنے تھیں۔

”میری ایک بات یاد رکھنا میں نانا۔۔۔۔۔ خواب قد برابر ہی دیکھنے چاہیے۔۔۔۔۔ چھوٹے خواب اور چھوٹا کر دیتے ہیں اور بڑے خواب کہیں کا نہیں رہتے۔“

”میں دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔ دل تھا کہ بس رکنا تھا اور جان بھی کہ بس جانے کو تھی۔۔۔۔۔ میں نے دل کے آگے سود لیں رکھی تھیں۔۔۔۔۔ ہر دلیل رد ہوئی تھی۔۔۔۔۔“

اگر ارسل رحمان کو کوکب فیاض سے محبت تھی تو کیا اسے بھی؟ اس نے رات کے آخری پہرے اسے کال کی

تھی۔۔۔۔۔ کوکی کی نیند بھری آواز سنائی دی تھی۔

”نانا۔۔۔۔۔ کیا بات ہے اتنی رات کو کال کی۔۔۔۔۔“

”خیریت؟“

”تم ارسل سے محبت کرتی ہو۔۔۔۔۔؟“

”میں اسے انکار نہیں کر سکتی میں نانا۔“ کوکب نے میری سانسیں روک لی تھیں۔ ”مگر تم اتنی رات کو یہ سوال کیوں پوچھ رہی ہو۔۔۔۔۔؟“

”وہ ارسل تمہارا جواب جاننا چاہتا تھا۔“ میرا جھوٹ بہت چھوٹا تھا۔ کوکب کی کوئی غلطی نہیں تھی

وہ کیوں ارسل رحمان کو انکار کرتی۔۔۔۔۔ دراز قد خورید اور تعلیم یافتہ۔۔۔۔۔ ساری یونیورسٹی کی لڑکیاں مرئی تھیں۔ کوکب فیاض کی بس ایک غلطی تھی وہ نین نانا سے محبت کا سوال پوچھنے سے پہلے ہی ارسل کی محبت کا جواب دے چکی تھی انصاف پسندی کے اصولوں پر

بات کرتی وہ پہلی بار کسی بھول کا شکار ہوئی تھی۔۔۔۔۔ بھول پہلی ہو، دوسری، تیسری یا آخری مگر وہ نقصان ہر بار بہت کرتی ہے۔ کوکب فیاض جو میرا عشق تھی پہلی بار خود غرض ہوئی تھی۔۔۔۔۔!!!

☆☆☆

”میں تو ساری زندگی ایک چپ کے بدلے ملنے والے سو سکھ کی ہی منتظر رہی مگر میں غلط تھی۔۔۔۔۔ زندگی چپ کا نام نہیں ہے۔۔۔۔۔ لفظوں کی جنگ جیت کر ڈاؤن توڑ توڑ کر کبھی سکھ نہیں ملنے یا پھر ہم عورتیں ہی شاید بد قسمت ہوتی ہیں صوبی آپا۔“

تالین پردوزانو ہو کر بھی وہ اتنی اجڑی بچڑی لگ رہی تھی کہ صوبی کو اپنا دکھ کم ہوتا محسوس ہوا تھا۔ نانیہ فیاض کا حال قافلے لٹ جانے والوں سے بھی اتر

تھا۔۔۔۔۔ وہ تو کہیں سے بھی چندرہ دن کی دہن نہیں لگ رہی تھی اس کے ہونٹوں پر جوارنگ بڑا عجیب تھا صوبی کو حقائق جاننے کو لگا تھا۔

”کہتا ہے کہ اس نے مجھ پر ترس کھایا ہے۔۔۔۔۔“

رحم آتا ہے اسے مجھ پر۔ وہ تو مرحوم ماموں کی روح سے کیے گئے وعدے بھرا رہا ہے۔ موت کے بعد مرحوم کی ہر خواہش پوری کرنا ہوتی ہے۔ ہونہ۔۔۔۔۔ کہتا

ہے ماموں کے گھر کی بیویوں پر پتھر نہیں پڑنے والے تھے۔۔۔۔۔ ان چندرہ دنوں میں اس نے کوکب کے علاوہ کوئی بات ہی نہیں کی، کوکب یہ بھی، کوکب وہ تھی، یہ کیسے جرم ہوتے ہیں جو ہم سے سرزد بھی نہیں ہوتے اور ان کی سزا ہمیں مل جاتی ہے۔ کبھی بھی پتا ہے آپا مجھے کیا لگتا ہے۔۔۔۔۔؟“ تالین سے اٹھ کر وہ اب آہستہ آہستہ کمرے میں ٹپل رہی تھی۔

”مجھے لگتا ہے وہ اب بھی کوکب سے محبت کرتا ہے۔“ دروازے میں کھڑی کوکب کے ہاتھوں میں پکڑی ٹرے لرز گئی تھی۔ اس نے زندگی کا اک اتنا بڑا فیصلہ ضد میں آ کر کر لیا ہے۔۔۔۔۔ اور ضد کی بھینٹ چڑھے فیصلے کہاں خوشی دیتے ہیں۔“ اس گھر میں آنے والی ہر پریشانی کے لیے دروازہ جیسے کوکب فیاض کھولتی تھی۔۔۔۔۔ مڈل کلاس کے سارے مسئلے اس گھر میں جنم لے چکے تھے۔ گھر کے سارے افراد کسی گھر سے سمندر کے سمندر میں پھنس چکے تھے اور کسی میں سوراخ ہو چکا تھا۔۔۔۔۔ ہر کسی کو سینکڑوں میں چپ کرانے والی کوایسی چپ لگی تھی کہ صدیوں نہ ٹوٹنے والی تھی۔

صنیہ بیگم سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ ”ہائے میرے اللہ۔۔۔۔۔ اس گھر میں مجھے کبھی بھی سکھ کا سانس لینا نصیب نہیں ہوا۔“

موسیٰ نے ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا تھا اسکول کی کاپیاں چیک کرتی جانے وہ کس موڈ میں تھی بال بین تیزی سے چل رہا تھا صفحے پھٹتے جا رہے تھے مگر اسے ذرا بھر بھی پروا نہیں تھی۔

”سارے مسئلے آپ کے پیدا کردہ ہیں۔“

صنیہ بیگم کو اس سے اس جواب کی ہر گز بھی توقع نہیں تھی۔

”میرا قصور ہے؟“ وہ رونے کو تھیں۔

”جب سے آنکھ کھولی ہے اس گھر میں صرف اور صرف پریشانیاں دیکھی ہیں۔ زندگی میں کبھی نہ کبھی تو بہار آتی ہی ہے مگر اس گھر نے تو بس خزاؤں کے مزے چکھنے ہیں اور کچھ نہیں۔۔۔۔۔ زندگی برباد ہو کر رہ گئی

ہے۔۔۔۔۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے بندہ ٹرین کے آگے کود کر جان دے دے۔“ دوپٹے سے ہاتھ پونچھ کر کوکی اندر آئی تھی۔

”کیا ہوا ہے موسیٰ۔۔۔۔۔ کیوں چلا رہی ہو؟“

”زندگی عذاب ہو گئی ہے ایک ٹپل بھی سکون کا نہیں میسر۔۔۔۔۔ تم نے، نانیہ اور صوبی آپا نے سکون برباد کر کے رکھ دیا ہے خدا کے لیے جان چھوڑو۔“

ہاتھ جوڑتی وہ کاپیاں اٹھاتی باہر کو نکل گئی تھی۔ کچھ صفحے ادھر ادھر گھر گئے تھے۔۔۔۔۔ صنیہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔ کوکب فیاض جہاں کی تھاں رو گئی تھی، اس نے صوبی آپا کو بچوں کی انگلیاں پکڑتے ہوئے بیرونی دروازہ بار کرتے دیکھا تھا۔۔۔۔۔ پرسوں ہی تو وحید بھائی سے مارکھا کے ٹیل و ٹیل وجود کے ساتھ آئی تھیں۔۔۔۔۔ تانیہ ان کی نگاہ کرتی رہی تھی۔

”آبا، خدا کا واسطہ ہے رک جائیں۔“ وہ ٹنگے پاؤں ان کے پیچھے بھاگی تھی ”موسیٰ کے منہ میں جو آتا ہے بول دیتی ہے۔“ وہ ان کا بازو پکڑے روکے ہوئے تھی۔ وہ زنی سے ہاتھ چھڑاتی ہوئی مسکراتی تھیں۔

”وہ سچ کہتی ہے کوکو۔۔۔۔۔ ہمارے گھروں کے مسئلوں کو ہمارے گھروں میں ہی رہنا چاہیے، ہمارے مسئلے ہیں، بریاں ہیں، ہم شادہ شدہ بیٹیاں غلط کرتی ہیں جو پائل کے گھر کو پہلے جیسا سمجھ کے دھڑلے سے چھوٹی موٹی تکلف پر روتی جیتی آ جاتی ہیں۔۔۔۔۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا کوکو۔۔۔۔۔ یہ ہمارا گھر نہیں ہے اب اگلا گھر ہی صرف ہمارا گھر ہے۔“ وہ بچوں کو سنبھالتی سڑک پار کر رہی تھیں۔۔۔۔۔ آگ اگلے تاریکی سورج کی روشنی میں وہ اپنے بچوں کو سنبھالتی اپنی انا، خودداری، عزت نفس کی ایک بار پھر قربانی دیتے جا رہی تھیں۔۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔۔ یہ زندگی۔

بالس کے قد دیواروں سے اونچے ہو گئے آنخوروں کا پانی سوکھ چکا تھا۔ چڑیاں پیاسی واپس لوٹ رہی تھیں۔۔۔۔۔ اور اسی رات کی صبح کو ارسل رحمان نے اسے کہا تھا ”کوکب۔۔۔۔۔ آئی ریلی لو لو“ کوکب

فیاض کی زندگی کے سارے مسئلے اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ ان سب سے فرار چاہتی تھی۔ صبحی آ یا، تانیہ، سونی سب کے چروں کے جھوم میں جا ملی بارہ۔ نین تارا سکندر حیات کو دکھنا بھول گئی تھی۔ ورنہ نین تارا تو اس کے لیے کھلی کتاب تھی۔ زندگی نے ایسا جال بنا تھا کہ وہ پھڑ پھڑا کر رہ گئی تھی۔ وہ ارسل رحمان کو دیکھ کر زبردستی مسکرائی تھی۔

”اپنی فیملی کو ہمارے گھر بھیج دو۔“ وہ فرار چاہتی تھی سکون سے جینا چاہتی تھی ورنہ ارسل رحمان سے اسے ”محبت“ نہیں تھی۔

☆☆☆

زندگی نے ہم دونوں کو جانے کس مقام پر لا کھڑا کیا تھا جہاں ہم دونوں مسکرانے کی کوششوں میں تھیں۔ میں نے غور سے بار بار کوکب فیاض کا چہرہ دیکھا تھا۔

”تم خوش تو ہونا کوکب؟“ وہ گہری سانس لیتی مسکرائی تھی۔

”میں خوش ہوں نین تارا۔۔۔۔۔ بھلا ارسل رحمان جیسے شخص کی زندگی میں شامل ہو کر میں ناخوش کیسے ہو سکتی ہوں۔“ جانے کیوں مجھے اس کا جواب مطمئن نہیں کر سکا تھا۔

”مائی کا رویہ کیسا ہے تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔؟“

ناریل کے تپے ہوا میں لہرا رہے تھے۔

”کبھی کبھی تو لگتا ہے وہ کبھی نہیں بدلیں گی۔“

ہوتے ہیں ناں کچھ لوگ جو ایک جگہ جیسے رہتے ہیں۔ ان کا رویہ بہت دکھ دیتا ہے تیری۔ مگر پھر ارسل کا سوچ کر دل کوڈھ حاسر مل جاتی ہے۔

”وہ دل کی بری نہیں ہیں کوکی۔“ وہ پھول توڑ رہی تھی۔

”جو دل کے برے نہیں ہوتے ناں انہیں ویسے بھی برا نہیں ہونا چاہیے۔ رویے بڑا دل دکھاتے ہیں۔“ وہ زندگی میں پہلی بار آج مجھے بھری ہوئی لگی تھی۔ سارا گھر گھومتے ہوئے ہم ساتھ

ساتھ رہی تھیں۔ لاہری، لاؤنج، چھت، گارڈن ہر جگہ کچھ دیر رکتی ہوئی، باتیں کرتی ہوئی زندگی نہیں پیچھے چھوڑ کر خود بہت آگے بڑھ گئی تھی۔ تانا چلے گئے تھے۔ میں پھر ایلی رہ گئی تھی مگر جاتے جاتے وہ مجھے حماد ورنی کا ساتھ دے گئے تھے۔ وہ جدید زمانے کا شخص تھا، وقت کو انگلیوں پر گنتا ہوا، اپنی سن مانی کرنے والا۔۔۔۔۔ ہر انسان پہلے پہل مٹا ہے تو ادا کار لگتا ہے پھر آہستہ آہستہ وہ اصل نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس میں ”میں“ بہت زیادہ تھی۔

”تم یقین نہیں کرو گی وہاں لڑکیاں ایک نظر مجھے دیکھنے کے لیے ریپشن پر کھڑی رہتی تھیں۔“

”میں لڑکیوں کے لیے ہمیشہ ہاٹ ٹاپک رہا ہوں۔۔۔۔۔ یہ تم کیسی ڈریسنگ کرتی رہتی ہو، خود کو بدلو، تبدیلی لاؤ، اب تم حماد ورنی کی بیوی ہو۔“

”ارے ابھی بلاؤ زیادہ کھلا ہے تو کیا ہے آج کل فیشن میں ان ہے۔ اب تمہاری زندگی بدل چکی ہے اپنی سوچ بدلو۔“ اب ٹڈل کلاس میں نہیں رہ رہی ہو۔

”میں یہاں کے ماحول سے اکتا چکا ہوں۔۔۔۔۔“

اس ملک میں رکھا کیا ہے۔“ میں نے ملاو کا پتا اٹھاتے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ رستہ واضح دیکھتا ہوا بولا تھا ”ہم اگلے ہفتے لندن شفٹ ہو رہے ہیں۔“

اس نے میرے قدموں تلے سے زمین نکال لی تھی۔ ”مگر کیوں۔۔۔۔۔؟“

”کیوں کا کیا سوال۔۔۔۔۔ بھائی بھی تو وہیں ہیں۔۔۔۔۔ برٹس بھی وہیں ہے تو وہیں سیٹل ہو جائیں گے۔“

”مگر یہاں گھر ہے ہمارا اور ہماری یادیں ہیں۔“

”اوہ مائی گاڈ۔۔۔۔۔ یادیں، یادیں مائی فٹ۔۔۔۔۔ تم کب پریکٹیکل ہو گی نین تارا!“ ہاں میں کیسے پریکٹیکل ہو سکتی تھی۔ میں تو خوابوں، خیالوں میں رہنے

والی اک ٹڈل کلاس لڑکی تھی ناں۔

”تم لوگ لندن کیوں شفٹ کر رہے ہو تارا؟“

”کچھ ٹیبل پر بیٹھی کوکب نے پوچھا تھا۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”حماد کا فیصلہ ہے۔“ میں نے اسٹرا سے جوس کا

پل لیا تھا۔ ”میں نے شور مچانا اعدا یا تھا۔ اور میرے دل میں سناٹے چھا گئے تھے۔۔۔۔۔ دور دور تک۔“

”ارے بھئی بڑے لوگ ہیں یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“ فرنگ سے سیب نکال کر وہ بالکل میرے سامنے بیٹھ گیا تھا۔

”میں نے ہولے سے نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔ فریش چہرہ، چمکتی آنکھیں اور پیشانی پر بکھرے بال، یکبارگی میرا دل چاہا تھا اس کی پیشانی سے وہ سارے بال ہٹا دوں

محبت کے ساتھ نے اسے کتنا خوب صورت کر دیا تھا۔ کوکب فیاض اب رخ موڑے سیٹی بجاتے ریشرنگر کی طرف متوجہ تھی۔ آج بھی میرے لیے ان دونوں کی محبت

دل میں تھی۔ آنکھوں میں دھند آئی تھی۔

”تم خوش ہو ناں تارا۔۔۔۔۔ اب تو زندگی سے سارے گلے شکوے دور ہو گئے ہوں گے۔“ وہ مسکرا کر

پوچھ رہا تھا۔

”بہت خوش ہوں ارسل۔۔۔۔۔ بہت۔“ میرے

منہ بڑھے نے کوکب کا ہاتھ کیوں لرزادیا تھا۔ آخر کیوں۔۔۔۔۔؟ میں آج آخری بار اس گھر میں آئی تھی ان سب سے ملنے۔ پھر میری زندگی اک اور جھنجھٹ بننے والی تھی۔

مائی نے مجھے کھلے دل سے گلے لگایا تھا اور رودی تھیں۔ ”تارا، تم بہت اچھی شخص مجھے بہت دیر ہو گئی مجھے معاف کر دینا۔“ کیسی معافی اور کیسی دیر۔۔۔۔۔ وہ دونوں

ازایوے میں کھڑے تھے حماد اور میں ان سے رخصت ہا رہے تھے۔

کوکب فیاض نے مجھے گلے لگایا تھا اور پھوٹ

پھوٹ کر رودی تھی۔ ”مجھے سکون نہیں ہے تارا۔ میرا

دل کسی دن کام کرنا چھوڑ دے گا۔ میں کیا کروں کہ مجھے

سکون مل جائے۔ محبت کی جنگ جیت لی میں نے مگر دوستی

کی جنگ ہار گئی۔“ وہ سرگوشیاں سارے رستے میرا پیچھا کرتی رہیں۔ میں نے پلٹ کر پیچھے پھر نہیں دیکھا تھا۔ وہ میری کوکب فیاض اور ارسل رحمان سے آخری ملاقات تھی۔ میری زندگی میں آنے والے دو اہم لوگ۔۔۔۔۔ جن سے میں نے بے تحاشا محبت کی۔۔۔۔۔ بس مجھے محبتوں کا اظہار کرنا بھی نہیں آیا تھا۔ آج بھی کوکب فیاض سے تعلق میں اپنے لیے اعزاز سمجھتی تھی۔

☆☆☆

مشکل رات۔۔۔۔۔ دس بجے

”زندگی نے ہم دونوں کے لیے کچھ اچھا نہیں سوچ رکھا تھا ہم دونوں اپنے اپنے حالات سے لڑ رہی تھیں اگر دیکھا جاتا تو اسے مجھ سے زیادہ مشکل حالات کا

سامنا تھا۔ مگر وہ بہت بہادر تھی میرا آئیڈیل بھی کوکب فیاض۔ اچھا بولتی تھی اسی بات پر وہ بہت خوش محسوس کرتی تھی ہر مقابلے کی جیت کے بعد ہم دونوں یونیورسٹی کی

چاٹ ٹریٹ کے طور پر ضرور کھاتی تھیں۔ کوکب فیاض اور ارسل رحمان میری زندگی میں آنے والے وہ دو لوگ

تھے جن کی میں دل سے مداح تھی۔ جن کے لیے میں واقعی جان دے سکتی تھی۔

گزرتے دنوں میں مجھے ذرا بھی خبر نہ ہوئی کہ میرا

دل چال بدل چکا ہے۔ وہ ارسل کے لیے دھڑکتا تھا اور ارسل کا دل کب مجھ سے کوئی کا ذکر سن بن کر دھڑکنے لگا۔

مجھے ان دونوں باتوں کا پتا بہت بعد میں چلا۔ کوکب کبھی بھی وہ میری اک اک رحر سے واقف ہے اور یہی بات واقعی سچ ہے اس میں دورانے نہیں۔ زندگی جب

کتنا بڑا ابوجھ لگنے لگتی ہے جب ہر باوجود جس سے آپ محبت کرتے ہیں اس کے دل میں تو کوئی اور بسا ہوا ہے۔

ارسل رحمان اور کوکب سے محبت؟ میری آنکھیں سمندر ہو گئی تھیں اور کوکب فیاض کتنی معصوم تھی۔۔۔۔۔ اسے کیا حق پہنچتا تھا کہ مجھ سے پوچھتی۔

”تاری تمہیں ارسل سے محبت تو نہیں؟“ اسے تو سب پتا تھا۔۔۔۔۔ جہاں جواب کا پہلے سے پتا ہو ہاں سوال تو

نہیں کیا کرتے۔ وہ چہرہ ہر کے پانیوں میں کانٹے گرا رہا تھا۔ اس بار اس نے خاموشی کے بازاری جیت لی

رہا تھا۔

تھی..... اور میرا دل اس سب کے باوجود بھی اسے
دقیقہ ماننے کو تیار نہیں۔

کچھ لوگ چاہے کتنے بھی برے بن جائیں مگر
وہ برے نہیں نکلتے..... مجھے ہمیشہ اس سوال نے
پریشان رکھا ہے اگر کوکب کو اداس سے محبت نہیں تھی تو
اس نے ارسل کی زندگی میں شامل ہونا کیوں منظور کر
لیا تھا؟ یہ سوال ہر بار مجھے تھکا دیتا ہے..... زندگی نے
ہم دونوں کے لیے اتنے رنگ بدلے ہیں کہ کوئی جو کر
بھی نہیں بدلتا ہوگا..... مجھے کوکب سے کوئی شکایت
نہیں۔ ناراضی بھی نہیں مگر دل کے چار خانوں میں
سے کسی خانے میں یہ ضرور ہے کہ کاش کبھی اسے
احساس ہو جیٹون میں تکنیک کام نہیں آتی۔ فارمولے
نہیں ہوتے، سادگی ہوتی ہے، جانے وہ ساری زندگی
ارسل کے ساتھ اس گھٹ کے ساتھ کیسے گزارے گی؟
اور جس دن ارسل کو خبر ہوئی کہ کوکب تو اس سے محبت
ہی نہیں کرتی؟ وہ تو محبت کو زندگی کے لیے آسجین
جتنی اہمیت دیا کرتا تھا..... کاش زندگی ایک اچھی راز
دار ثابت ہو، ہم جیٹون کے لیے.....

لابریری کی دراز میں رکھی وہ ڈائری کوکب
فیاض کے جسم سے جان نکال کر لے گئی تھی..... ڈائری
کے ورق پھر گئے وہ کسی پر ڈھے گئی تھی آج خبر ہوئی
تھی کہ نین تارا اسکندر نے پلٹ کر پھر خبر کیوں نہ لی
تھی..... مثلاً کے تینوں کٹوے کہاں آ کر جڑے
تھے۔ وہ پہلی بار تھا جب کوکب فیاض دل کے درد کے
ہاتھوں بے حال ہوئی تھی..... ہاں اسے سب خبر تھی
کوکب فیاض واقف تھی نین تارا اسکندر کے ہر جذبے
سے مگر زندگی نے سر سے آسمان چھین لیا تھا۔

☆☆☆

وہ پہلا تھپڑ میں بھی نہیں بھول سکتی جو حماد درانی
نے میرے من پر مارا تھا..... "وہ دوست تھا میرا اس
نے تمہیں ذرا سا بچ کر لیا تو کون سی قیامت آگئی۔"
وہ مجھ پر چیخ چلا رہا تھا۔

"اس نے صرف بچ نہیں کیا تھا حماد۔"
"تو کون سی قیامت آگئی وہ میرا بڑا بھائی پارٹنر

ہے۔" میں تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"مگر میں تمہارا بڑا بھائی نہیں ہوں۔" وہ رات
میں نے سلور سون کی سیڑھیوں پر گزاری تھی اس وقت
میں نہیں جانتی تھی ایسی کئی باتیں میں اور بھی وہاں
گزارنے والی تھی..... نیکی سے میری دوستی وہاں
ہوئی تھی..... شاید ہم عورتوں کے دکھ سکھ ایک جیسے
ہوتے ہیں۔ نیکی نے مجھے بہت حوصلہ دیا تھا۔

"دوست یہ سارا مرد ایک جیسا ہے عورت کو
ایک کی طرح اپنے کسی بھی دوست کے سامنے پیش
کرنے والا۔" میں اپنے آنسو پونچھ رہی ہوئی تھی۔
"تم پولیس کو انعام کیوں نہیں کرتا۔"
"نہیں۔"

"تم پاکستان اپنے گھر میں کسی کو انعام کیوں
نہیں کرتا۔"
"میرا کوئی گھر نہیں ہے..... کوئی رشتہ باقی
نہیں..... میں لاوارث ہوں۔"

حماد ڈریک کرتا تھا..... پارٹنر اٹینڈ کرتا تھا اور
وہ پارٹنر ہرگز نہیں ایسی نہیں ہوتی تھیں کہ میں وہاں جا
سکتی..... ایک بار اسی ایک وجہ سے میں نے انکار کیا
تھا۔ "میں نہیں جاؤں گی۔"
"کیوں نہیں جاؤ گی؟" وہ ڈریٹنگ مرر کے
سامنے کھڑا پر فیوم اسپرے کر رہا تھا۔
"وہاں سب مرد ہوتے ہیں۔"

"ایک تو میں تمہاری اس ڈل کلاس ذہنی
سے بہت تنگ ہوں۔" اس نے پیار سے میرے ہاتھ
پکڑے تھے۔ "کم آن بے بی۔" میں نے ہاتھ چھڑا
لیے تھے۔

"میں کسی قیمت پر بھی نہیں جاؤں گی۔" حماد
درانی نے ڈریٹنگ ٹیبل کی ہر شے میری طرف اچھالی
تھی..... میرے ماتھے سے خون ابل پڑا تھا..... اس
کے بعد اس نے مجھ پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر
دی تھی۔

"میں سب جانتا ہوں، بچہ نہیں ہوں۔ وہ
حراز وہ ابھی تک تمہارے دل سے نہیں نکلا۔"

بارگزار عورت ایک بار ارسل رحمان میرے سامنے
آجائے میں اسے شوٹ کر دوں گا۔" میرے منہ سے
نونا ابلنے لگا تھا..... یہ وہ حماد درانی کہیں تھا جو
ہمارے ساتھ پڑھتا تھا۔ ہمارا دوست تھا وہ اتنا دھیمہ
ہوتا تھا کہ توجہ سے اس کی بات سننا پڑتی تھی..... اور
آج جاہلوں کی طرح وہ چیخا چلا تا ہوا مجھے زد و کوب
کر رہا تھا..... اس دن مجھے سمجھ آیا تھا کہ زندگی نے
ہمارے راز نہیں رکھے تھے۔

☆☆☆

کوکب فیاض کو دل کا دوسرا دورہ تب پڑا
تھا جب اسے نین تارا کی ڈائریوں کی خبر ملی تھی۔ وہ سن
ہو کر رہ گئی تھی۔ ارسل کا حال پاگلوں کی طرح ہو چکا تھا
وہ اس کی محبت بارے بہت پریشان تھا۔

"مجھے بتاؤ کیا پریشانی ہے تمہیں جو دن بدن
تمہیں ختم کر رہی ہے۔" وہ اسے کیا بتائی؟ اب اور وہ
داشت نہیں کر سکتی۔ نیلے کور والی ڈائری ارسل کو تھا
رہ وہ چلی گئی تھی۔

"مجھے بہت ہنسی آ رہی ہے اس بات پر کہ وہ
فحش جس سے پہلی ملاقات میں، میں اس کا منہ توڑ
رہا تھا جیٹون میں پھر بعد میں اسی سے محبت کر بیٹھی تھی.....
کئی حیرانی کی بات تھی ہاں..... مجھے پہلی بار وہ کب اچھا
لگا تھا شاید تب جب وہ میرے پیچھے انکسشن آیا تھا تب
میں نے اس کے پیچھے اس کے پیروں پر پھر رکھتے
اورے کتنا تحفظ محسوس کیا تھا عورت اسی شخص سے محبت
کرتی ہے جس سے وہ تحفظ محسوس کرتی ہے جو اسے لگتا
ہے دنیا کے سارے غلوں کو، بلاؤں سے بچالے گا۔ وہ
میرے لیے ایک ایسا ہی شخص ثابت ہوا تھا میرے دل
سے سارے ڈر، دوسرے اس نے ختم کر دیے تھے

ارسل رحمان سے محبت کرنے کے لیے میرے پاس
صرف "ایک" وجہ نہیں تھی بلکہ بہت سی ان گنت
دلیلیاں تھیں..... میرا دل اس کے لیے دھڑکنے لگا تھا اور
اس کا دل؟ کوکب فیاض کے لیے وہ لڑکی جو مجھے
ارسل جتنی ہی عزیز ہے شاید اس سے کہیں تھوڑی سی
زیادہ زندگی پہلے بہت بری تھی مگر ان دنوں کے میری

زندگی میں آنے کے بعد زندگی پہلے جیسی نہیں رہی
بہت بدل گئی، مجھے ہنسا آ گیا۔ زندگی ایسے بھی گزر
سکتی ہے۔ مجھے واقعی دنیا کا کچھ اتنا نہیں تھا اسے نین
تارا اسکندر یاد آئی تھی اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں
..... جب وہ کرتی تھی۔

"ارسل اگر تم نہ ہوتے تو جانے میری زندگی
کیسی ہوتی؟"
"کیسی ہوتی بھلا؟"

"بہت عجیب..... بورنگ۔"
"تم ہر لطیفہ سب سے پہلے مجھے کیوں سناتے
چلے آتے ہو؟" وہ پوچھتی تھی۔
"کیونکہ مجھے پتا ہوتا ہے تم اس پر ضرور ہنسو گی۔"

"تم اتنا کیسے جانتے ہو مجھے؟"
"جی ہاں اپنے علاوہ دنیا کے کسی دوسرے شخص
کے سوا۔"

"تم فان کلا اور بلیک ٹائی زیادہ پہنا کرو۔"
"کیوں؟"

"تم پر بہت سوٹ کرتا ہے۔"
"اوہ ریشی..... کہیں تمہیں مجھ پر کرش تو
نہیں؟"

"جی نہیں منہ دھور کھو شکل دیکھی ہے کبھی آئینے
میں۔"

"بتانے کی ضرورت نہیں روز دیکھتا ہوں۔" وہ
دونوں لڑتے جھگڑتے اکثر لان میں بھاگ رہے
ہوتے تھے بارش میں آکس کریم کون کھانا تو ان کا
محبوب مشغلہ تھا۔ ماسوں رحمان چیخنے چلاتے رہ
جاتے۔

"اندر آؤ تم دونوں..... پیار پڑ جاؤ گے۔"
اور اگلے دن ناشتے کی میز پر وہ چمپنک رہے ہوتے
تھے..... نشوونو کا ڈبا آدھا کر کے یونیورسٹی لے
جایا جاتا تھا..... وہ آج اتنے سالوں بعد ارسل رحمان
کو شدت سے یاد آئی تھی..... وہ کس نین تارا اسکندر
حیات کو جانتا تھا؟ کوکب فیاض نے ارسل رحمان کے

سوال پر انعام ملنا محسوس کیا تھا۔
”تمہیں مجھ سے محبت نہیں تھی ناں کوکب؟“
ترتربستی بارش میں شامل اولوں نے کھڑکی کا شیشہ
توڑ دیا تھا۔ شیشے ٹوٹنے کا شور اٹھا تھا مگر ارسل
رحمان کے دل ٹوٹنے کا شور وہیں دفن ہو گیا تھا۔

☆☆☆

کوکب فیاض کو ہونے والے تیسرے اور
آخری دل کے دورہ والے دن اپنے گھر آتا ہوا
تھا۔ وہ ننگے پاؤں ہر کمرے میں گھومتی ہر شے کو ٹکڑے
کر دیکھتی ہوئی آخر برآمدے میں آن کھڑی ہوئی
تھی۔ جانے کیسی تیز ہوا تھی جو بارش ساتھ لائی
تھی۔ غم اور بانس کے پودے اسے انجانے خوف
میں مبتلا کر گئے تھے۔ ”ہائے نین تارا“ دل سے اک
کوک برآمد ہوئی تھی گرم آنسو آنکھوں سے پھسلنے
ہوئے پیروں پر گرنے لگے۔

سب کے مسائل ختم ہو گئے۔ شاید سارے
مسئلے اپنے مقررہ وقت پر ختم ہوئی جاتے ہیں۔ تانیہ
نے ظفر کو اولاد کی خوشی دی تھی وہ اب سکون میں تھا
صبوحی آپا کے بچے بڑے ہو گئے تھے اب ان کے بچے
ان کے لیے ڈھال بن گئے تھے موی کا آفس کو لیگ
سے نکاح ہو گیا تھا وہ اب سارا دن بات بے بات
ہنسی تھی تو جن مسئلوں سے میں گھبرائی تھی فرار چاہتی
تھی وہ تو خود بخود حل ہو گئے تھے۔

آہ، میں نے اس ماحول سے فرار کے لیے ہم
تینوں کی زندگیاں عذاب میں ڈالیں اپنی ارسل
رحمان کی اور نین تارا کی مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کسی
کی بھی زندگی برباد کرنے کا مگر میں نے کیا کیا؟
”ٹولی چڑیاں بارش کے پانی میں ڈوبنے لگی تھیں
جنہیں وہ ایک ایک کر کے توڑ رہی تھی موی چائے کی
ٹرے لے کر کھڑکی تھی۔“

”ارسل بھائی کا فون آیا تھا کہ آپ کو وقت پر
دوائی دے دوں۔“ وہ چائے میز پر رکھتی اس کے
باس آگئی تھی جو برآمدے کے پلر سے ٹپک لگائے
کھڑکی تھی۔ وہ کوکب فیاض تو نہیں تھی کوئی اور تھی

..... کلجے کپڑے، بکھرے بال اور آنکھوں کے گرد
حلقے موی کا دل بھرا یا تھا۔
”پتا ہے موی میں اس کی آئیڈیل تھی وہ ہر چیز
میں مجھے فالو کرتی تھی۔ میرے پسندیدہ کمراس کے
بھی فیورٹ ہو گئے۔ گاڑ کا کالوہ کھانے والی کسٹروڈ
زیادہ پسند کرنے لگی تھی، کوک چھوڑ کر سیرائنٹ بننے لگی
تھی، اکثر تو میری طرح بولنے کی کوششیں بھی کرتی
تھی۔ پیروں میرے ہاتھ پکڑ کر مجھے سختی بھی دے ایک
اچھی سامع تھی۔ بارشوں میں چھتری لے کر مجھے
اسٹاپ تک چھوڑنے آتی تھی واپسی پر چھتری مجھے
تھماتی وہ بھینکتی ہوئی جاتی تھی۔ اس کی زندگی میں
چھوٹے چھوٹے مسئلے تھے جو اس کو پھاڑ لگتے تھے،
میرے سمجھانے پر اس کی مسکراہٹ لوٹ آتی تھی۔ ہر
مقابلے میں پہلی تالی وہ بجاتی تھی اور شرابی کی حفاظت
اس کا فرض تھا اور فرض میں کہاں کوتاہی کی جاتی ہے
اس کی بھی ڈائری اگر تمہاری نظر سے گزرے تو تم
دیکھو گی پہلے صفحے پر ہی میرا اور ارسل کا نام لکھا ہوگا۔
اس نے بھی بھی ڈرامی بات بھی مجھ سے نہیں چھپائی
..... میں راز دار تھی اس کی مگر میں غلط تھی مومن، میں
نے وہ شرابی ایگل بڑی ترتیب سی توڑی ہے۔ ہر حصہ
ثالث کا بکھر گیا۔ جو بھی نہیں جڑے گا بھی بچی نہیں۔“
مومن فیاض نے اس بے تحاشا بولنے والی،
گفتگو جیت لینے والی، ڈاؤس توڑ کر مقابلے تک اپنی
ذات کے لیے وقت کرنے والی کوکب فیاض کو پھوٹ
پھوٹ روتے دیکھا تھا۔ ارسل سے مجھے محبت نہیں
موی..... میرا دل اس کی طرف مائل ہی نہیں ہو سکا
..... میں کیا کروں موی؟“ موی نے اسے خود سے
پھینا لیا تھا۔
”نین تارا سے معافی مانگ لیں۔“ وہ روتی
ہوئی تھی میں سر ہلا رہی تھی۔

”وہ اپنے آپ کو ہم سب کی زندگیوں سے دور
، بہت دور لے گئی ہے..... وہ اپنی پیڑ سے ہمارے
لیے مسائل نہیں کھڑے کرنا چاہتی تھی..... رقیبوں
سے نفرت کی جاتی ہے۔ بار بار کو سنا جاتا ہے مگر اس

..... ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ کچھ سال پہلے آخری بار
ہاتھ ہوئے بھی وہ بار بار مجھے اور ارسل کو دیکھتی مسکرا
رہی تھی۔ مگر اس کی آنکھوں میں آنسو جمع کر رہے تھے
..... آنسو اور آخری نظر مجھے آج بھی نہیں بھوت۔“
صفیہ بیگم کے بلانے پر موی اندر چلی گئی تھی۔
ان میں بارش جمع ہوتی جا رہی تھی۔ آنسوؤں نے
..... بنے پتھریوں کے گھونٹے گرا دیے تھے..... جھکے
ارسل کے پانی میں تیرنے لگے تھے دل میں لپکا لپکا
اور اندر رہا تھا..... چائے کپ سے اٹھتی بھاپ ختم ہو
گئی تھی ٹیبلٹ اس نے مٹی میں دبائی ہوئی تھی اسے
ارسل یاد آیا تھا۔
”تمہیں کیا ہو گیا ہے کوکب بیٹھے بیٹھے کہیں کی
لپس بیچ جاتی ہو کوئی مسئلہ، پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ۔
میں ہوں ناں۔“

”اپنا خیال رکھا کرو دن بدن کمزور ہوتی جا رہی
..... اور پھر ڈاکٹر صادم نے ارسل کے پیروں تلے
..... منہ میں چھپتی تھی۔
”انہیں ہارٹ ایک ہوا ہے۔ انہیں کوئی
پریشانی ہے جو مسلسل ان کی ہارٹ بیٹ کو ڈسٹرب کر
رہی ہے آئی وارن یو ہو سکتا خدا نا خواستہ ان کا دل کام
کرنا پھوڑ دے۔“

ارسل رحمان کا دل بند ہونے کو تھا۔ وہ اضطرابی
حالت میں ہاسپٹل میں بھاگ رہا تھا اس نے پہلے
..... ہی بڑھ کر اس کا خیال رکھنا شروع کر دیا تھا اس
کے کھانے پینے، سونے اور واک تک کا اس نے ناظم
کل خود ترتیب دیا تھا کوکب فیاض کو انہیں موقعوں پر
اپنا تارا یاد آتی تھی۔

”کوکب تم ہی بس اس سے ہر وقت لڑنے
..... نے پر تیار رہتی ہو، ورنہ وہ ایسا شخص ہے کہ اس سے
..... کی جائے۔“
”تو تم کر لو ناں اس سے محبت آخر آل کزن
..... ہمارا.....“
اس کے چہرے پر رنگوں کی شفق بکھر جاتی تھی۔
..... اشارے کو کی کو خوب سمجھ میں آتے تھے۔ یہ ایک ایسا

راز تھا جس سے واقف تو وہ دونوں نہیں مگر انہوں نے
پردہ ڈال رکھا تھا۔ ہوتا ہے ناں بھی کبھی کبھی چیزیں،
کچھ باتیں پردے میں پڑی رہیں تو زیادہ خوب
صورت لگتی ہیں۔ نہر کے پھولوں نے کوکب کا سوال
سنا تھا۔ ”تمہیں ارسل سے محبت ہے تارہ.....؟“
بلبلوں کے جھنڈ اس بات پر حیران تھے کہ وہ راز سے
پردہ کیوں اٹھانا چاہتی تھی۔ اس راز کو خوب صورتی کو
کیوں ختم کرنا چاہتی تھی آخر کیوں.....؟
ہر دلیل، ہر منطق کو اس نے اپنی خود غرضی کی نظر
کر دیا تھا..... کہا تھا ناں کہ اگر ساری زندگی بھی آپ
سچ بولتے رہیں اور پھر ایک جھوٹ بولیں۔ وہ راتلی
براہر جھوٹ بھی پھر آپ کو سچا نہیں رہنے دیتا..... وہی
جھوٹ کوکب فیاض کے سامنے آ گیا تھا سوال نامہ
ارسل رحمان کے پاس تھا۔

”تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے ناں کوکب؟“
درازد خود پردہ شخص کی آنکھوں میں نمی تھی..... وہ رو رہا
تھا..... کیا مرد نہیں روتے؟ کون کہتا ہے؟ محبت کے
لیے ہر کوئی روتا ہے..... وہ بت بن چکی تھی سوال کی
ضرب سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔
”نین تارا تو تم سے محبت ہے۔“
”میں تمہاری بات کر رہا ہوں۔“

”میں تو خود غرض ہوں اپنا سوچتی ہوں ہمیشہ،
میں کیسے کسی سے محبت کر سکتی ہوں۔ نین تارا کی بات
کر دو محبت تو اس نے کی ہے ناں۔“ پھر وہ نفی میں سر
ہلانے لگی تھی۔
”نہیں..... شاید میں غلط بول گئی۔ اس نے تو
عشق کیا ہے صرف ارسل رحمان سے نہیں۔ کوکب
فیاض سے بھی ہم دونوں سے۔“ بارش کی بو چھاڑنے
اس کے چہرے کو چھوا تھا..... وہ پلر سے لگی چٹختی تھی
سارے کپڑے گیلے ہو چکے تھے۔ منہ پر بار بار وہ ہاتھ
پھیر رہی تھی..... اندر نکلیں..... بہت اندر..... درد
بڑھنے لگا تھا۔
ایک آواز تھی جو بادلوں کی گرج میں پھٹ کر رہ
گئی تھی۔

”دل کے مرض سے نجات مل جاتی ہے کوئی
..... دل کام کرنا چھوڑ جاتا ہے اور پھر سارے درد ختم
ہو جاتے ہیں۔ مگر محبت کے مرض سے نجات نہیں ملتی
ساری زندگی زخموں سے خون رستا ہے۔“ مودی دوڑ کر
بہر آئی تھی..... وہ اب بھی ہلے سے ٹیک لگائے بیٹھی
تھی..... درودی گولی مٹی میں بندھی اور گالوں پر آنسو
جم کر رہ گئے تھے اس کے دل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا
ہاں ایک تھی کوکب فیاض.....

☆☆☆

وہ پچھلے تیرہ روز سے میرے پاس آ رہا تھا اور
میں تیرہ روز سے ہی اسے نظر انداز کر رہی تھی۔ میں
ایک طلاق یافتہ لڑکی تھی اور ان دونوں کی زندگی کے
لیے کوئی مسائل کھڑے نہیں کرنا چاہتی تھی..... لندن
کی سڑکیں بارش سے بھیگی ہوئی تھیں..... کرسس کی
وجہ سے دس بڑھ گیا تھا۔ کرسس ٹری کی روشنیاں
آنکھیں چندھیا کر رکھ دینے والی تھیں..... سانا کلاز
تھاغف بانٹ رہے تھے۔

”کاش کوئی سانا کلامت کا ہوتا۔ جو صرف
اور صرف محبت کا عقد دیتا۔“ کتنی ہی بات ہے ناں
ویسے؟ نینسی بگن میں ہنسی آدھے کھٹنے سے آلیٹ
اور دشمن سلاو بنا رہی تھی۔

”مجھے لگتا ہے اگلا کرسس سر پہ آ جائے گا تب یہ
تمہارا آلیٹ بنے گا۔“ اسپرن کی ڈوریاں کھوئی وہ
ہنسی تھی۔

”تارا تم جانتا ہے ناں کہ کوکب کرنا ہم کو
عذاب لگتا ہے۔“

”بہت کامی ہو تم۔“

”تم کھلا اور پھر دل ہو۔“

میں دشمن سلاو ٹنگ رہی تھی۔ ”پھر دل؟“
”ہاں..... تم اس ایڈیٹی لڑکا کو اتنے دنوں سے
دروازے سے ٹال دیتا ہے..... یہ اچھا سفر نہیں ہیں
تارا۔“

”تم نہیں سمجھو گی نینسی.....“ میں اٹھ کھڑی
ہوئی تھی..... آلیٹ کی پلیٹ میرے ہاتھوں میں

تھی..... تھکی ڈوریل بھی تھی۔ پلیٹ ٹیبل پر رکھی تھی
دروازے کی طرف آئی تھی۔ فان کمر کی شرٹ
بلیک ٹائی پہنے وہ سامنے تھا۔

”پلیز دروازہ بند مت کرنا تارا۔“ میں دروازے
بند کرنا بھول گئی تھی۔

مجھے کچھ اجانک یاد آیا تھا۔ ”تم پر فان کمر کی
شرٹ کے ساتھ بلیک ٹائی بہت سوٹ کرتی ہے۔“
کتنا ہنسنا تھا۔

”لگتا ہے میرا جادو چل گیا ہے..... میں تمہارا
کرش ہوتا جا رہا ہوں۔“ ماضی کا یہ حال میں تو
تھا۔ ”میں پلیز اندر آ جاؤں میں تارا.....؟“

”نہیں.....“ میں نہیں چاہتی تھی وہ دروازہ
ہوتا پھر میری زندگی میں واپس آ جائے..... سارا
بھرم ٹوٹ کر رہ جاتے۔

”پلیز.....“ وہ منت کر رہا تھا۔
”ہرگز نہیں۔“

”باہر بارش شروع ہو گئی ہے اور میرے پار
چھتری بھی نہیں ہے۔“

میں نے نینسی کو آواز لگائی تھی۔ ”چھاتا لے
آؤ۔“ نینسی نے آ کر چھاتا اسے پکڑ دیا تھا۔
نے دروازے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

”تارا..... وہ کوکب.....“ میں نے اس کے
پر غور نہیں کیا تھا۔ میں نے روتے ہوئے اس کے
سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

”وہ کیا چاہتی ہے ارسل..... اپنی طلاق پا
دوست کو اپنے گھر رکھنا چاہتی ہے
اسے..... میں اپنے وجود کی محبت کا سایہ تم دونوں

زندگی پر پڑتا نہیں دیکھ سکتی..... اسے کہنا میں تارا
خوش ہے آؤ زندگی گزار رہی ہے۔ ایک ہونٹ
جاب کرتی ہے..... آئی ایم ریلی پٹن..... پلیز لے

(چلے جاؤ)۔“ وہ چھاتا تانے سڑک پر چلتا جا رہا تھا
میں کھڑکی کے پاس کھڑی اسے جاتا دیکھ رہی
تھی..... وہ آج بھی میرے دل کی دھڑکیں روک
دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

”تم اس سے بہت محبت کرتا ہے ناں تارا؟“
”ہاں، نینسی بہت زیادہ۔“ برتی بارش میں

سانا کلاز کی پچھلے والی نوپیاں لہرا رہی تھیں۔

It's about time
That we kept pace with
the speed of the pulse
Throbbing at our wrists
And when the time
comes
That our grief is hung up
to dry !!!

☆☆☆

”کوکب چلی گئی تارا..... مر گئی۔“ میں سوچ
ہی نہیں سکتی تھی کہ انیسویں دن میں دروازہ کھولوں گی
اور مجھے پہلا جملہ ہی یہی سننے کو ملا تھا ساری بلڈنگ

میرے سر پر آن گری تھی اور میرے وجود کے
پے اڑ گئے تھے..... میں نے اپنے آپ کو فرش پر دو
راؤ ہو کر بیٹھا محسوس کیا تھا..... وہ انیسویں روز اندر آ

گیا تھا..... میرے گرم گرم آنسو میرا اپنا وجود جلانے
لگے تھے۔

”اسے کیا ہوا تھا ارسل۔“ وہ میرے ساتھ بیٹھا تھا۔
”اس کے دل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔“

ابا بانی پلوں کے باراب کی بارسا ہی تھی۔
”کتنی ہی کسی کا دل دکھانے کی سزا ایسے ہی ملتی

ہے۔“ میں نے تڑپ کر ارسل کے ہاتھ تھامے تھے۔
”نہیں ارسل نہیں..... تم نے لو جو میں نے دل
میں اس کے لیے کوئی سیل، کوئی کڑواہٹ رکھی ہو۔

میں تو آج بھی کوکب فیاض کی فین ہوں..... میں ہر کر
ہی ایسا نہیں کر سکتی تھی..... وہ میرے بارے میں ایسا
سوچ بھی کیسے سکتی تھی۔“

”کتنی ہی رقیب ہو تو بد دعائیں کو سننے دیتا ہے،
وہ نے کی بد دعا دیتا ہے اور دوست ایسا کچھ بھی نہیں
رہا..... دوست کی تو ”چیپ“ ہی مار جاتی ہے ارسل

رحمان..... نہیں تار نے کیوں نہ میرا گریبان چھوڑا؟
میرے منہ پر پھپھڑکیوں نہیں بارے..... وہ تو آخری بار
بھی غبار ہوئی رہی۔“ نینسی فیشن میگ تھامے ساکت
بیٹھی تھی..... تو کیا کوکب فیاض نے میں تارا سکندر کی

”چیپ“ کو دل پر لے لیا تھا.....؟
ایسی عمر میں دل کے دورے سے مرنا قیامت

ہوتا ہے جانے کیسے وہ برداشت کرتی ہوگی..... میرا
دل جھٹکے لگا تھا۔ نہر کے پانی کو اوک میں بھر کر اچھالتی
وہ مجھے کہتی تھی۔ ”نہیں تارا..... میری زندگی میں بھی

مسئلے ہیں بس میں شیئر کر کے تمہاری اور پریشانیوں
میں اضافہ نہیں کر سکتی..... میری زندگی کے مسئلے
میرے ہیں اور میں انہیں حل کر لوں گی۔ تمہیں

پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔“ وہ اپنی
پریشانیوں سے مجھے بچا لیتی تھی اور میں۔
”کوکب..... میں بہت پریشان ہوں جا رہے

آگے میری زندگی میں کیا ہوگا؟“
”پاکل ہو تم مستقبل کی فکر میں حال ادا اس ٹیبل

کر لیتے۔“
آج پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے میرا شدت

سے دل چاہ رہا ہے کہ اس کا گریبان چھوڑوں، دو چھپر
لگاؤں اور پوچھوں۔ ”کوکب فیاض ماضی میں دفن ہو
کر ہمارا مستقبل ادا اس کیوں کر گئی ہو.....؟“

☆☆☆

”تم نے اک بار تو کہا ہوتا میں تارا کہ تمہیں مجھ
سے محبت تھی.....؟“ آج اتنے سالوں بعد ہم گھر کی
اسی روش پر ٹپ رہے تھے جہاں ہم پہلی بار ملے تھے۔

زندگی کے جھکشن واپسی کی راہ لے رہے تھے۔
”مگر تمہیں مجھ سے نہیں تھی ارسل.....؟“

”تم میری اچھی دوست تھیں تارا..... تم کوکب
کے لیے قربانی دے گئیں تو میں تمہارے لیے نہیں
دے سکتا تھا.....؟“

”عورت اور مرد میں بڑا فرق ہوتا ہے ارسل
رحمان۔“ میں نے فلائنگ جیش کی تھی۔
”تم دونوں نے مجھے کھلونا سمجھا تھا جو جاہا کا

میں تیری جگہوں

نئی فلیٹ



برے نہیں لگتے۔ وہ تو بری بھی نہیں تھی میں یونورٹی
نہر کے پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں..... نہر میں
اب خار نہیں گرتے..... درخت نیلے رنگ کے پھول
گراتے ہیں..... آنکھوں میں نمی تو آتی ہے مگر نہیں کر
انگلیوں کی پوروں سے پونچھ دیتی ہوں۔

”کوکب فیاض..... تم اب بھی یہیں ہو میرے۔“
آس پاس میرے دل کے بہت قریب۔“

ارسل روز صبح آفس جانے سے پہلے میرے
پاس آ کر پوچھتا ہے۔ ”کیا اب میں تمہارا کرش ہوتا
جار ہوں؟“

”زیادہ تو نہیں بس تھوڑا تھوڑا.....“ میں ناشا
لگاتی اسے چڑاتی تھی..... اور وہ بہت جلدی چڑ جاتا تھا۔

”تمہارا ٹیسٹ ہی خراب ہے..... ہزاروں
لڑکیاں مر رہی ہیں مجھ پر۔“

”میں تو نہیں مرتی۔“
”تم لڑکی نہیں عورت ہو عورت۔“ میں نکیلے

کر اس کے پیچھے پیچھے ہوتی تھی۔
”میں بیوی ہوں تمہاری۔“

سچ کہتے ہیں دوست زندگی ہوتے ہیں اگر وہ
زندہ ہوں تب بھی اور اگر وہ زندہ نہ ہوں پھر بھی۔

یادوں کی صورت..... میری یادوں میں آج بھی ”وہ“
زندہ ہے..... نہٹ کھٹ، شریر، مردوں کے معاشرے

میں عورت کے حقوق کی بات کرنے والی..... میرا
مسئلہ اپنا مسئلہ سمجھنے والی.....!

میں آج بھی یہی کہتی ہوں میری زندگی میں
آنے والے لوگوں میں، میں نے دو لوگوں سے۔

تمہارا محبت کی ہے..... ارسل رحمان..... اور کوکب
فیاض.....!!!

یہی میری کہانی تھی۔ نین تارا اور ایک تھی کوکب
.....؟ آپ کو کسی کی ضرورت پڑے گا.....؟

ہماری زندگی آدمی کہانی ہوتی ہے..... اور
آدمی حقیقت.....!!! یہ بھی ریل گاڑی کی طرح
جکشن بدلتی رہتی ہے۔

..... میں ایک سانس لیتا، جتنا جاگتا انسان تھا ”ماتھے
پر ٹکئیں ڈالے کھا ہوتا وہ شخص مجھے اتنا پیارا لگا تھا کہ
میرے دل سے خیال گزرا تھا..... کیا زندگی کے کسی
لمحے میں بھی وہ کوکب فیاض کو اچھا نہ لگا ہوگا؟ اس کو
اس سے محبت نہیں ہوئی ہوگی۔

”دل کو یا تو دل کا مرض لگتا ہے یا پھر محبت کا
مرض لگتا ہے۔ میرے جسے میں محبت کا مرض آیا تھا

اور کوکب فیاض کے جسے میں دل کا مرض..... آہ، وہ
ہتھکڑیاں اور پورٹ پر میرے پاس بیٹھا مجھے پھر سے

زندگی جینے کے گرسجھا رہا تھا۔“ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا
تین تارا کہ نہیں اور اپنے آپ کو کس طرح ملی، دلاسا

دوں کہ ہم پھر سے زندگی جینے لگیں..... زندگی نے ہماری
مثالث کا ایک کونا توڑ دیا ہے جواب واپس بھی نہیں جڑ

سکتا..... ہم تینوں کی زندگیوں میں ہی ہم تین ہی تو ہم
اور ضروری تھے..... اور اب بھی رہیں گے..... میں نے

وہ ڈائری پڑھ لی ہے۔ کتنا اچھا لگتا ہے ناں جب کوئی
آپ کی اپنی پروا کرتا ہے۔ آپ سے اتنی محبت کرتا

ہے..... تمہارے لفظ تمہاری فیملی پڑھ کر میں خود کو خوش
قسمت تصور کرنے لگا ہوں..... کوکب ہماری یادوں میں

زندہ رہے گی تارا..... مگر ہمیں ایک دوسرے کے لیے
زندہ رہنا ہوگا۔“

میں نے ارسل رحمان کی بات مان لی تھی اور ہم
نے شادی کر لی..... تینسی سے اسکا پ پر بات ہوتی

تھی۔
”تارا..... تم نے اچھا نہیں کیا..... ارسل میرا

کرش تھا۔“ میں خوب ہنسی تھی۔
”ہمارے مذہب میں چار شادیوں کی اجازت

ہے۔“
”میری اکٹھ کوئی کا ذکر کرتی تھیں“ تمہاری دوست

ایک اچھی لڑکی تھی۔“
میرے دلوں میں آج بھی اس کے لیے

دعائیں اور پیار ہے۔ وہ کیا تھی میرے دل میں
اس کے لیے میں آسکتا تھا! ہرگز نہیں۔ ہوتے ہیں
ناں کچھ لوگ وہ جتنے بھی برے ہو جائیں تب بھی

منہ بگاڑ کر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

”تو کرائیں چاکری اپنی تائی جان کی.....؟“

وہ دبے قدموں سے پھولوں کی باڑھ پھلا گئی۔
کر راہ داری ہے سے گزرنی لاؤج کے سامنے سے
گزرنا چاہ رہی تھی مگر وہ سونیا ہی کیا جن کی نظروں
سے کچھ پوشیدہ رہ جائے۔ چھپنے کی کوشش ناکام رہی
تھی۔ وہ نظروں میں آچکی تھی۔ اسی سانس بھر کے وہ
ان کے پاس آگئی۔

”کوئی چاکری نہیں کی میں نے۔ تائی جان کی
طبیعت تھوڑی ٹھیک نہیں تھی تو بس تھوڑا ہاتھ بنا دیا۔“
وہ سکون سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”ازلی بیمار ہیں وہ..... بھابھی بیگم کی طبیعت
کبھی ٹھیک بھی رہی ہے۔“ سونیا نے منہ میڑھا کر کے
کہا تو علیہا ہادی کو افسوس ہوا۔

”مما، غیروں کی بھی طبیعت خرابی کا نہیں تو ایسا
نہیں کہنا چاہیے۔ پھر وہ تو تائی جان ہیں برسوں سے
پڑوس میں رہتی ہیں۔ ہمارے گھروں کے قچ تو کوئی
دیوار تک نہیں۔“

اسے سونیا کا انداز ناگوار گوار گوار کہہ دیا مگر سونیا
کو اس کی بات نہیں زیادہ بری لگی۔

”گھر کے بچوں قچ دیوار ہو یا ناہو، مگر دلوں میں
بے اور بے ہی بہت ہے..... زیادہ، میری اماں بننے کی
ضرورت نہیں ہے..... ماما مجھے کچھ سمجھانے کی۔“

سونیا خشکیں لگا ہوں سے گھورنے لگیں۔ علیہا
کو غصہ تو بیت آیا مگر ضبط کر گئی کہ مقابل عام ہستی
نہیں، ماں تھی۔

”آخرا ب کو تائی جان سے مسئلہ کیا ہے۔ اتنی تو
اچھی ہیں وہ۔ آپ کی سرد مہری، جلی گئی کے باعث
بھلے انہوں نے آجاتا کم کر دیا ہو لیکن جب بھی ملتی
ہیں کھلے دل سے ملتی ہیں۔ پھر آپ کو ان کی کون سی
بات بری لگ گئی۔“

علیہا کو آج تک سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ سونیا کو
تائی جان سے آخر مسئلہ کیا ہے۔ کیوں وہ ہر گھڑی ان
کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔

”اگر اتنی ہی اچھی ہیں تائی جان تو وہ ہیں کیوں
نہیں چلی جاتیں اپنا پورا یا بستر لیٹ کے..... ماں
ویسے ہی بہت بری ہے تمہاری نظر میں۔“

ثانیہ کی تعریف سن کر سونیا کو بلا غصہ آیا تھا۔
”اف! علیہا بری طرح سر چڑ کے بیٹھ گئی تھی
ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کے ہاتھ کوئی سرانجس
تھا۔“

☆☆☆

”یہ ہے پورے مہینے کی آمدنی.....؟“

پانچ پانچ ہزار کے چھ نوٹوں کو جب صاحب
نے ان کی جیب سے نکالی پر رکھا تو وہ انھیں نکال کر بھٹکی
موجود دھیسوں کو چٹکیوں سے پکڑ کر لہرا لگیں۔
استہزا اور غصے کا دلچسپ ملاپ اس وقت ان کے
چہرے پر نظر آ رہا تھا۔

”مال ختم ہو گیا تھا۔ مل اور مال کے پیسے نکال
کر ساٹھ ہزار ہی بچے تھے۔“

ہادی صاحب نے ایمان داری سے حساب
مگر سونیا کے ماتھے پر ٹنگنوں کا جال بننا جا رہا تھا۔
”میں ہزار آپ کے بھائی صاحب لے لے
اور میں آپ میرے منہ پر مارنے چلے آئے.....“

”وہ خشکیں لگا ہوں سے گھور رہی تھیں۔“

”نیک بخت کیوں اتنی ناشکری کر رہی ہو،
اپنا ہے..... کھانے والے صرف تین لوگ..... مل
بل اور راشن کے نہیں اور کیا پورا کرتا ہے جو تیس
بھی کم لگ رہے۔“

”نیک بخت چاہیے ہوں تو اکاؤنٹ سے نکلوا لیا
پیسوں کی تنگی کب دی ہے نہیں جو تم مجھے یوں
کر رہی ہو۔“

ہادی صاحب کم ہی غصہ ہوتے تھے۔ سونیا
انداز اہانت آمیز لگا تو بلبلا گئے۔

”میں کوئی ذلیل نہیں کر رہی۔ سمجھا لے
کوشش کر رہی ہوں اگر آپ اس بزنس کو اس
سنجھال رہے ہوتے تو ابھی میں کی جگہ ساتھ
میرے ہاتھ میں رکھتے۔“

”کیسی بات کر رہی ہو۔ بھائی صاحب

ساتھ برسوں کا جہا جہا کاروبار ہے۔“
ہادی صاحب کو سونیا کی دماغی حالت پر شبہ
ہونے لگا۔

”ہاں تو برسوں سے ساتھ کاروبار کر رہے ہیں
تو کیا مرتے دم تک ساتھ ہی کریں گے۔“ سونیا نے
ہنک کے کہا۔ ہادی صاحب بے بسی سے ان کی پستی
زبان دیکھنے لگے۔ جو ان کے بھائی، بھادوچ کے
خلاف تو شروع سے چل رہی تھی مگر گزشتہ کچھ سالوں
سے ماس اور سر کے گزرنے کے بعد سے اس میں
بدلتی اضافہ ہی دیکھنے میں آ رہا تھا۔

”مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا جب دونوں گھروں
میں اک جیسی اکم آتی ہے تو ترقی صرف اس گھر میں
لیوں نظر آتی ہے۔ نت نئے پنڈ شیٹ پر دے،
کر اکر..... آئے دن بھابھی بیگم طرح طرح کی
چڑوں سے گھر چمکا رہی ہیں اور ہمارا تو پورا مہینہ
ہی مشکل سے پورا ہوتا ہے۔“

”نیک بخت بھابھی سلیقہ شعار ہیں۔ دس جگہ تو
انہوں نے بیٹی ڈالی ہوئی ہے۔ جب بیٹی نکلتی ہے تو
گھر کے لیے کچھ تا کچھ لے آتی ہیں۔“

سونیا در پردہ کچھ اور سمجھنا چاہ رہی تھیں۔ نیا
باق پڑھانے کے موڈ میں تھیں۔ مگر ہادی صاحب
لے بیان پر غصہ ضبط کرنا محال ہو گیا۔

”نا آپ کا مطلب ہے، میں پھو ہڑ اور بد سلیقہ
اں۔“ آٹھیں ماتھے کو جا لگیں۔

”معاف کر دو۔ تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا
اں۔“ اک نیا محاذ کھلتے دیکھ کر ہادی صاحب
پاؤں پر سے ہاتھ جوڑ گئے تو کئی ٹائیے تک سونیا لب
چیتی رہ گئیں۔

”مائیں یا مائیں! آپ کے بھائی صاحب
ضرور ہاتھ کی صفائی تو ضرور دکھاتے ہوں گے۔ آخر
کو آواہا دن وہ گلے پر بیٹھتے ہیں اور مہینے کا حساب
کتاب بھی ان ہی کے ہاتھ میں ہے۔“

بڑے بھائی پر اسے بڑے الزام پر ہادی صاحب
کا نہ تو ضرور سرخ ہوا مگر ان میں سونیا کیسی چندال
اورت کے سامنے دم مارنے کی بھی ہمت نہ تھی۔

”پچھلے سال فلیٹ خرید کر کرائے پر چڑھا
دیا..... چند ماہ پہلے میاں، بیوی عمرہ کر کے لوٹے ہیں
میں پوچھتی ہوں، کہاں سے آتا ہے اتنا پیسہ ان کے
پاس.....؟“

اچھی فصول خرچی اور زبان کے چٹخاروں کو پس
پشت ڈال کر اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے
سونیا سارے مہرے چل رہی تھیں۔ اک بل کو ہادی
صاحب بھی ان کے دام میں آکر بھائی، بھادوچ کی
کفایت شعاری اور دین داری کو فراموش کر کے سونیا
کی بچی کہانی کے تانے بانے میں الجھ گئے۔

”کیا معلوم بھائی صاحب واقعی ایسا کرتے
ہوں۔“

”جب دیکھو بھائی صاحب دکان سے چھٹی
کر لیتے ہیں کبھی طبیعت خرابی کا بہانہ، کبھی حج عمرہ،
کے پھیرے..... چھپے کاروبار کو سنبھالنے کے لیے
آپ رہ جاتے ہیں..... جب ایسا ہی ہے تو آپ
کاروبار میں بٹوارا کیوں نہیں کر لیتے.....؟ پھر پتا
چل جائے گا کون کتنا کماتا ہے اور کون چوری کر کے
عیش کر رہا ہے..... آپ میں صلاحیت ہے آپ پورا
کاروبار اکیلے چلا سکتے ہیں تو پھر پارٹنر شپ کی کیا
ضرورت ہے۔ کیا اچھا نہیں کہ پورا نتائج لا کر
میرے ہاتھ میں رہیں۔ اور ہم بھی ترقی کریں.....
کب تک یہ بابا کے بچے ہوئے گھر میں رہیں گے۔“

بالا خرابی طویل کہانی کا خلاصہ ہوئی گیا تھا کہ
سونیا کا کہنا کیا چاہ رہی تھیں۔ ہادی صاحب سوچ
میں پڑ گئے تھے۔

”واقعی! پورا کاروبار تو پوری بچت۔“ لالچ نے
دستک دی تھی۔ انہیں کشش میں مبتلا کر کے سونیا
آرام سے سو گئی تھیں۔

☆☆☆

”گھر آئے مہمان کی کوئی عزت نہیں..... ناٹ
فیئر۔“ سفید شلوار سوٹ اور لال دوپٹے میں وہ لاؤج
سے بے دھیانی میں گزر رہی تھی جب انہیں آواز نے
توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔
”آپ کی تعریف؟“

اجنبی کو ریلیکس انداز میں بیٹھے دیکھ کر حیرت سے زیادہ اسے اس کے انداز مخاطب نے حیران کیا تھا۔ اجنبی اٹھ کر اس تک آیا تھا۔

خاصی خوب صورت ہو گئی ہو۔“
وچکی سے دیکھتے مقابل بے باکی سے تعریف کر گیا تھا وہ جو اسے برداشت کر رہی تھی۔ اس بے باکی پر ماتھے پر ٹکٹوں کا جال بچھا گئی۔

اور آپ خاصے چپبے معلوم ہوتے ہیں جو یوں کسی کے گھر میں کھڑے ہو کر اس درجہ بدتمیزی کا ارتکاب کر گئے۔“ لفظ چا چا کر ادا ہوئے تھے۔
مقابلہ کھیلنے کے بجائے مسکرانے لگا تھا۔

”پہنچا تھا نہیں.....؟“ اوہیں ہوں..... تمہاری عارفہ خالہ کا بیٹا..... کل ہی امریکا سے لوٹا ہوں۔“
مقابل کے تعارف کروانے کا بھی اس پر خاک مطلق اثر نہ ہوا۔ ہاں اسے وہ چھوڑا سا، فنی اپنا کزن ضرور یاد آ گیا تھا جو اس وقت کافی بدل چکا تھا۔

”پچھانوں کیسے.....؟“ ماشاء اللہ کافی بدل چکے ہیں۔ لیکن اللہ گواہ ہے۔ چھوڑ پین پر امریکا کا پانی مزید رنگ لے آیا ہے۔“
بغیر لگی لپٹی رکھے اس نے ہنگو کے جوتا مارا تو وہ جس پڑا۔

بدلی تو تم بھی نہیں ہو۔ زبان آج بھی دو دھاری تلوار ہے۔“ مقابل بھی ڈھیت وارح ہوا تھا۔
بجائے برامانے کے لٹو ہوئے جارہا تھا۔
”نا پسندیدہ لوگوں پر زیادہ زبانی جمع خرچ کرنے کی عادی نہیں..... تشریف رکھیں مما آتی ہی ہوں گی۔“

وہ جلد سے جلد اس کی نگاہ سے ہٹا چاہ رہی تھی۔
”علیہا! ملی تم اوہیں ہے.....؟“ کتنا بدل گیا ہے نا.....؟ سو نیا غالباً بھانجے کی تواضع کے لیے کچن میں گئی تھیں۔ اسے اوہیں کے مقابل دیکھ کر گرم جوشی سے پاس آئیں۔

”بالکل، خاصے بدل گئے ہیں۔ تیز دلچاظ کی کی تو ان میں پہلے ہی پانی جاتی تھی۔ مزید رنگ امریکا کی آزادی نے بھر دیے۔“

اوہیں کی بے حجاب نگاہوں سے خائف ہو کر وہ ازلی منہ چھٹ کہنے سے ناچوکی..... مقابل کے ماتھے پر اب کے کچھ مل لانے میں وہ بالآخر کامیاب ہو گئی۔ سو نیا نے نگاہوں میں گھر کا، جنہیں نظر انداز کر کے وہ پھولوں کی باڑھ کے قریب پہنچ گئی۔

”تانی جان کی طبیعت پوچھنے جارہی ہوں۔“
اس سے پہلے کہ سو نیا کچھ کہیں وہ کم ہو چکی تھی۔ سو نیا بلبلانے کے رہ گئیں۔

☆☆☆☆

سڑھیوں سے اوپر آ کر سب سے پہلے کچن ہی پڑتا تھا۔ کھڑ پڑی آواز آنے لگی تو ثانیہ کا گمان کر کے آگے بڑھنے کے بجائے وہ کچن میں چلی آئی۔

بڑا دلچسپ منظر تھا۔ سیل فون کی لمبے لمبے بڑا دھڑکتا بج رہا تھا۔ شیف غازی شیف بنا کھڑا تھا۔ نان اسٹک پین میں ناکانی پانی تھا۔

”اسنے برے دن آگئے لوگوں کے کہ شیف بن گئے.....؟“ وہ بے ساختہ چھیڑ گئی۔ سبیل نے پلٹ کر اسے دیکھا اور پاستا میں جھج چلا تار ہا۔

”ہاں جی! کیا کریں۔ ہم کون سا کسی کے پیارے ہیں جو کوئی حسینہ، مہ جینہ ہمیں پکا پکا کر کھلائے گی۔“

اس نے بھی دھڑکڑا دیا۔ تو وہ ہنس دی۔
”مجھے بلا لیتے۔“ اپنی خدمت پیش کی۔
”کاغذ ہوا کرتے سے دو چار سائن کردلوں پہلے، پھر حق سے رو کے رکھوں گا۔ بلانے کی بھی ٹینشن نہیں ہوگی۔“

علیہا کے چہرے پر سرخی پھیل گئی تھی۔ وہ دلچسپی سے دیکھنے لگا۔
”ہوا میں بنا دیتی ہوں۔“

”نا..... سب کچھ میں نے کر لیا ہے اب تم انگلی کٹوا کے شہیدوں میں نام کھوانے نا کھڑی ہو جاؤ۔“ صاف ہری جھنڈی دکھائی گئی۔

”او کے!“ وہ آرام سے سائڈ ہو کر بے بی کارن کھانے لگی۔
”چراغ بڑی اچھی ہے۔“ اشارہ گانے کی

طرف تھا۔ چھو لیا تو نے لفظ آنکھوں سے۔“ شرارت سے کہا۔

”تو ملے جہاں، میرا جہاں ہے وہاں۔“ اگلا مصرعہ علیہا نے پورا کیا تھا۔

”آگے بھی بول دو، میں واری جاؤں۔“
شرارت سے چھیڑنے لگا۔

”میں کیوں واری جاؤں.....؟“ ناک چڑھائی گئی۔

”اوہو ابی ٹیوڈ!“ وہ ہنسا۔

”آہو..... شیف فکیل غازی مزے دار سا پاستا بنا کر لے آئیں، میں تب تک تانی جان کی طبیعت پوچھ لوں۔“ وہ جانے کو پرتو لے گئی۔

”میری طبیعت بھی پوچھ لیا کرو بھی۔“ روکنے کی ٹی کی۔

”تمہاری طبیعت کو کیا ہوا؟“ تنکھی چوتھوں سے گھورنے لگی۔

”مرض عشق ہوں کر دے دوا!“ شوخ سوال آیا۔
”کمی چورنی سے دل پر ہاتھ رکھو الو..... دل

ساتھ جب پر بھی ہاتھ رکھ جائے گی۔“ شوخی سے جواب دیتی اندر بڑھ گئی تھی۔
”السلام علیکم!“

اندرا آئی تو ثانیہ نیم دراز کتاب پڑھ رہی تھیں۔
”ارے میری بچی..... آؤ میری جان!“ ثانیہ

اس کی آواز سننے ہی کتاب رکھ کر چشمہ درست کرتے اس کے لیے بائیں واکر چکی تھیں۔ وہ مسکراتے

”اے ان کے بازوؤں میں جاسانی۔ وہ جب بھی ملتی تھیں، اسی گرم جوشی سے ملتی تھیں، انداز میں والہانہ

ان لفظوں میں محبت کی گرمی سے علیہا ہادی ان کی طرف اور جھنجی چلی آئی تھی۔ تب ہی تو اکثر سو نیا کی

کتاب کا نشانہ بن جاتی تھی۔
”کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“ پیار لے کر

الگ ہوئی وہ تو حالت دریافت کر رہی تھی۔
”بالکل ٹھیک ہوں لیکن یہ سبیل ہے کہ بستر سے

اٹنے نہیں دے رہا۔ مجھے یہاں بٹھا کر جانے پکن میں لیا کر بڑ کر رہا ہے..... تم سناؤ گھر میں سب ٹھیک ہیں،

سو نیا اور ہادی۔“ وہابی دیتی ثانیہ احوال پوچھنے لگیں۔
”سب ٹھیک ہیں۔ آپ چکر لگائیں نا ہماری طرف دل بھی بہل جائے گا۔“

اس نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا مگر ثانیہ کے چہرے کا رنگ جتنی تیزی سے بدلا تھا اس پر علیہا ہادی کو اک لمحے کے لیے شرمندگی سی ہوئی۔ اول تو سو نیا ملنا پسند ہی نہیں کرتی تھیں، اگر ثانیہ بھولے بھٹکے آجھی جاتی تھیں تو سو نیا خود کو کسی کسی کام میں مصروف ظاہر کر کے ان کے پاس دو گھڑی بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں۔ ہادی صاحب وقت دینے کی کوشش کرتے تو سو نیا کی گھوری پر آگے پیچھے ہو جاتے تھے اور ایسے ردیے پر ثانیہ بھی جلدی چلی جاتی تھیں۔ ایک تو بن بلالی مہمان، دوسرے اتنا غیر مناسب انداز..... وہ کب تک یکطرفہ رشتہ نبھا سکتی تھیں۔

”ہاں، ہاں کیوں نہیں ضرور آؤں گی۔ اپنی بیٹی سے تو سبیل مل بیٹی ہوں نا..... اور بس طبیعت ٹھوڑی

ست رہنے لگی ہے۔ چکر آجاتے ہیں تو دل ہی نہیں کرتا، کہیں آنے جانے کو۔“

ثانیہ نے اس کی خفت دور کرنے کی سس کی تو وہ پھٹکے سے مسکرا دی۔

”خیال رکھا کر س اپنا۔ ان شاء اللہ جلد طبیعت میں بہتری آجائے گی۔ بس آپ بد پرہیزی نا

کریں۔ دو وقت پر لیں گی تو شوگر کنٹرول میں رہے گی۔“ وہ ان کی زور دہنی دور کرنے لگی۔

”یہ لیں لیڈیز! اگر ماگرم پاستا انجوائے کریں چائے کے ساتھ اور مجھے دعا میں دیں۔ اسی گھڑی

سبیل پاستا اور چائے کی ٹرے اٹھائے چلا آیا تھا۔ خود سر دگرتے داد کا خواہاں تھا۔

”تانی جان! یہ چائے کی شکل کچھ کالی لگ رہی ہے نا۔“ خاصی خوش رنگ چائے کو وہ تنقید کا نشانہ

بنائی تو سبیل آٹھویں پھاڑے اسے دیکھنے لگا۔
”ہاں، لگ تو رہی ہے۔“

چینی نے بھی سبیل کو ستانے میں اس کا بھرپور

اتھار دیا۔ ”وہ بلبلانے لگا۔“

”ارح گواہ ہے، عورتوں نے کبھی مرد کا ساتھ

ہادی صاحب کے رویے میں کھنچاؤ اور اسٹور پر

ان کے طرز عمل کے باوجود غازی صاحب نے اپنا انداز نارمل ہی رکھا ہوا تھا۔ ہاں یہ سارا قصہ انہوں نے دھجی دل سے ثانے سے ضرور شہر کیا تھا۔

”اچھی بات ہے ہادی بھی ذمہ داری اٹھا رہا ہے۔ برسوں سے کاروبار کا حساب کتاب آپ نے دیکھا ہے۔ کرنے دیں اب سے اسے۔ شاید اسی بہانے اس کا حساب اچھا ہو جائے۔۔۔۔۔ ہمیشہ کہتا تھا بھابھی بیگم مجھے دو جنج دو سے انجمن ہوتی ہے۔“

بھڑکانے کے بجائے ثانے نے سمجھاتے ہوئے آخر میں جتنے ہوئے ہادی کے برسوں پرانے جملے دہرا کر ان کی زور دہی دور کرنا چاہی تو غازی صاحب مسکرا بھی نہ سکے۔ ہادی صاحب نے جو طرز عمل اختیار کر رکھا تھا اس پر اسٹور کے لڑکے بھی نوٹس لے چکے تھے۔ اور سب انہیں جس طرح مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے انہیں شرمندگی کا احساس ہونے لگا تھا۔

”وہ تو اس نے بچپن میں کی ہوگی۔ اب تو ہادی بہت بڑا ہو گیا ہے۔“ وہ کچھ دکھ، کچھ درد کی کیفیت میں کھد کر رخ پھیر گئے تھے۔

ثانیہ نے ایک بھائی کے لیے دوسرے بھائی کے کرب کو دیکھا تو اسی ضمن میں یہ دعوت رکھ لی کہ شاید مل بیٹھنے سے دوریوں میں کچھ کی آجائے۔

ہادی اور سونیا آٹو گئے تھے لیکن ان دونوں کے انداز کافی بدلے بدلے لگ رہے تھے۔ سونیا نے سب کے سامنے علیہا تک کو نہیں بخشا تھا۔ تب ہی ثانیہ اس کی مدد کو آئی تھیں لیکن سونیا کو بے حد نامگوار گزرا۔

”لڑکی ذات ہے بھابھی بیگم۔۔۔۔۔ اپنے گھر میں رہنے کی عادت ڈالے تو ہی اچھا ہے۔۔۔۔۔ بھلے دھارے گھروں میں دیوار نہیں ہے اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ پھولوں کی باڑھ بچھا لگ کر دن میں دس بار یہاں کے چکر لگاتی رہے۔ کل کو اس کی شادی بھی کر گئی ہے ہم نے۔ لڑکے والے دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے۔ بھلے گئے تاپا کا گھر ہے۔ مگر ماں، باپ کا تو نہیں۔“

سونیا نے جس طرح گھیر کر آگ لگائی تھی اس پر سوائے ہادی صاحب کے سب ہی اپنی اپنی جگہ ٹھنک کر سونیا کو دیکھنے لگے تھے۔ علیہا ہادی کو یہ بے وقت کی رانگی فضول لگی تھی۔ تو غازی اور میل کو ان کا انداز بہت کچھ واضح کرنا چاہیگا۔

”سسرال۔۔۔۔۔! سونیا اگر تمہیں یاد ہو تو ہم نے ہمیشہ سے یہ ہی کہا ہے کہ علیہا میرے میل کی ہے کیوں ہادی تم تو گواہ ہو، نا؟“

ثانیہ اچھے کا اظہار کر کے ہادی کو مخاطب کر گئیں تو وہ نظریں چرا نے لگے۔ میل کا سر بے ساختہ جھک گیا تھا۔ علیہا کو بھی ماں کی بات کچھ پلے نہیں پڑی تھی۔

”بھابھی بیگم! بے شک آپ لوگوں نے کئی بار عندیہ ظاہر کیا لیکن آپ سب گواہ ہیں کہ ہم نے بھی باہی نہیں بھری، ہمیشہ یہی کہا کہ ابھی مناسب وقت نہیں ہے۔“

سونیا کے اک دم سے بولنے پر میل کے اندر خطرے کی گھنٹی بجی۔ علیہا بھی آنکھیں پھاڑے سونیا کے انداز ملاحظہ کر رہی تھی۔ غازی صاحب کو جانے کیوں کسی بہت بڑی گریز کے آثار نظر آرہے تھے۔

رہ گئے ہادی صاحب تو ناوہ تین میں تاہیرہ میں۔

”ٹھیک ہے اس وقت بچے پڑھ رہے تھے۔ اب تو خیر سے دونوں فارغ ہیں۔ علیہا کے کمرچویش کارزلٹ آجائے تو وہ بھلے آگے پڑھتی رہے۔ رشتے شادی کے بعد۔۔۔۔۔ ہمیں کیا اعتراض ہوگا بھلا۔۔۔۔۔ اب تو عمر بھی مناسب ہے دونوں کی۔“

ثانیہ نے بات آگے بڑھائی تو سونیا کا منہ کڑوا ہو گیا۔

”تمام والدین چاہتے ہیں کہ ان کی بیٹی جہاں جائے راج کرے۔۔۔۔۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔ علیہا میری اکلوتی اولاد ہے۔ بطور ماں میں نے بھی یہ تلاش جاری رکھی ہوئی تھی۔ اور اب ارادہ علیہا کی شادی اپنے بھائے اویس سے کرنے کا ہے۔ ماشاء اللہ امریکا سے آیا ہے۔ ڈالریں کھیل رہا ہے۔ جب کہ میل کی تو ابھی کوئی

نوکری بھی نہیں ہے۔“

بڑے آرام سے صورت پھونک کر آخر میں ان کا لہجہ استہزاء سے ہو گیا۔ ہر کوئی اپنی جگہ دنگ رہ گیا تھا۔ یہاں تک کہ ہادی صاحب بھی۔ انہیں اتنی خبر تو تھی کہ سونیا کا ارادہ میل کو داماد بنانے کا قطعاً نہیں تھا مگر وہ اویس کے لیے سوچ رہی ہیں وہ بھی اس بات سے انجان تھے۔

”میں اویس سے شادی نہیں کروں گی۔“ علیہا ہادی کا فشار خون بلند ہونے لگا۔

”فیصلہ تمہارا نہیں میرا چلے گا۔ اب تم کسی ٹٹ پونچے کو میرے سامنے لا کھڑا کرو گی تو کیا میں تمہیں گنوںے میں چھٹا لگ دگائے دوں گی۔ یوں دوسرے کے گھر میں بیٹھ کر یہاں کوئی بھی تماشا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔۔۔ گھر جاؤ میں آکر بات کرتی ہوں، تم سے۔“

سونیا کا بس نہیں چل رہا تھا انکار پر علیہا کو دھنک کے دکھ دیں۔ ان کے ٹکا کے طنز کرنے پر ثانیہ اپنی جگہ سانس تو بھی نہیں۔ وہیں میل کا منہ سرخ ہو گیا تھا۔ ٹٹ پونچا ہے ہی تو کہا گیا تھا۔

”آپ کیا اگلی صدی میں بات کریں گے۔۔۔۔۔ وہ بات کریں جس کے لیے آئے ہیں۔ یہاں تو سب جانے کون کون سی امید بالے بیٹھے ہیں۔“

حقیقتاً ان کی زبان کے آگے خندق تھی۔ ہادی صاحب کو ڈانٹ پلا کے آخر میں وہ بڑبڑا کر رہ گئیں لیکن آواز اتنی ضرور رکھی کہ لیکن بھی سن لیں۔۔۔۔۔ سب کو ان کے انداز پر افسوس ہو رہا تھا۔

ماں کے رویے سے شرمندہ علیہا، ثانیہ، شکیل اور غازی صاحب کے چہرے دیکھنے لگی۔ تینوں ہی سمجھ دار اور درگزر کرنے والے تھے ورنہ جس طرح سونیا کرکس کے آئی تھیں ان سب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اب تک اک محاذ کھل چکا ہوتا۔ ابھی سب یہی سہہ نہیں پائے تھے کہ سونیا کی یاد دہانی پر ہادی صاحب کو گلا کھنکار کے بولنے کے لیے برتوتلے دیکھ کر سب عجیب سے احساسات میں گھر گئے کہ کب جانے کون سا اہم اعلان کرنا مقصود تھا۔ علیہا ہادی بھی چونک گئی

تھی۔ سونیا کس بات کی طرف اشارہ کر گئی تھیں۔۔۔۔۔!!

”بھائی صاحب! مہنگائی دن بہ دن بڑھ رہی ہے۔ کب تک اس چھوٹے سے گھر میں رہیں گے۔ آپ کا تو خیر سے بیٹا ہے لیکن مجھے بیٹی کی شادی کے لیے پیسے بھی جوڑنے ہیں۔۔۔۔۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ ہم اس کاروبار کا ہوا برا کر دیں۔“

میل کی تھیلے سے باہر آئی گئی تھی۔ غازی صاحب خاموشی سے بھائی کے رنگ دیکھ رہے تھے۔ آثار تو اک ماہ پہلے ہی رونما ہونا شروع ہو گئے تھے۔ آج رنگ پکا پڑ گیا تھا۔

علیہا ہادی دیکھ دافوس سے ماں، باپ کے چہرے دیکھ رہی تھی تو دوسری طرف ثانیہ اور غازی کے چہرے پر درد کی کیفیت دیکھ کر اسے رونا آ رہا تھا۔ ہاں میل اب تک خود کو سنبھال چکا تھا۔ سونیا کو پہچان تو وہ بہت پہلے ہی گیا تھا بس کل کر وہ اب سامنے آئی تھیں۔ ابھی تو دل کی بساط اٹنے کی خبر سن رہی تھی اس پر افسوس بھی نا کر سکا تھا کہ رشتوں کی بنیاد پلنے لگی تھی۔

”صبح ہی سے اسٹور کو بیچنے کی کرتا ہوں پھر الگ الگ کاروبار۔۔۔۔۔! ہادی صاحب آرام سے گویا ہوئے تھے۔ مگر غازی صاحب نے سرعت سے ان کی بات کاٹ دی تھی۔

”یہ گھر اور کاروبار اب مرحوم نے ہم دونوں بھائیوں کے نام کیا تھا کہ ہم ہمیشہ ساتھ کاروبار کریں اور اک دوسرے کے قریب رہیں لیکن اگر تمہیں یہ گھر چھوٹا لگنے لگا ہے تو بھلے تم تین سو ساٹھ گز کا گھر چھوڑ کر بڑا گھر لے لو۔ میرے پاس خریدنے کی اوقات ہوئی تو تم سے تمہارا گھر خرید لوں گا کہ یہ میرے ابا مرحوم کی نشانی ہے۔ ان کی حق حلال کے چونے اور اینٹوں سے بنا گھر ہے۔ مزدوروں کے ساتھ اپنا پسینہ بھا کر میرے ابا مرحوم نے جس گھر کی بنیاد ڈالی اسے غیروں کے ہاتھ جاتے نہیں دیکھ سکتا۔ اور یہی کاروبار میں بٹوارے کی بات۔۔۔۔۔ میں یہ بھی نہیں چاہوں گا کہ کاروبار کا ہوا برا ہو یا اسٹور کے۔ اس کی

اجازت میں تمہیں کبھی نہیں دیا۔ جاکہ تم ہمارے ابا کی نشانیں کو ختم کر دو۔۔۔۔۔ ہاں اس کاروبار کو کھرنے سے بچانے کے لیے دست بردار ضرور ہو سکتا ہوں۔۔۔۔۔ اب بچے تم بھی نہیں رہے جو ناواقف ہو کہ کاروبار راتوں رات کھڑا نہیں ہوتا۔“

ہادی صاحب کی بات کاٹ کر وہ بولنا شروع ہوئے تو کئی جگہ ان کی آواز لڑکھرائی۔۔۔۔۔ کئی جگہ رکے۔۔۔۔۔ والد محترم کا تذکرہ جہاں کچھ گلوگیر کر گیا وہیں چھوٹے بھائی کی تو تاجپشی پر دل نوحہ کنایا تھا۔ مگر انہوں نے بات مکمل کر کے دم لیا۔ ان کی گفتگو کے دوران سونیا کو لگا تھا وہ انکاری ہوں گے۔ اڑ جائیں گے مگر آخر میں انہوں نے جس طرح دست برداری کا اعلان کیا تھا۔ اس پر انہیں گونا گونی خوشی ہوئی پورے کاروبار کا روبرو ہارنا کا۔۔۔۔۔ واہ!

”کاروبار سے دست برداری کے بعد پھر آپ کیا کریں گے بھائی صاحب۔۔۔۔۔؟“ ہادی صاحب کی رگوں میں شاید اب بھی خون جوش مار رہا تھا۔ ان کی فکر مندی پر غازی صاحب استہزائیہ انداز میں مسکرائے۔

”کرلوں گا کچھ نا کچھ۔ کوئی چھوٹی موٹی نوکری۔۔۔۔۔“

”نہیں! میں کاروبار میں سے حصہ نکال کر آپ کو دوں گا۔ ہادی صاحب اڑے رہے۔ سونیا نے گھور کے دیکھا۔ مگر وہ ان کی طرف متوجہ نہیں تھے۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے، چچا جان۔۔۔۔۔ بابا کا بیٹا بھی زندہ ہے۔ نوکری کیا، اب انہیں کاروباری انجنیوں میں بھی پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب یہ گھر میں آرام کریں گے۔۔۔۔۔ گھومیں گے، پھر میں گے۔۔۔۔۔ دوستوں میں جائیں گے۔ دوران تعلیم ہی میں نے پائرنشپ پر گڈ زکایز شروع کر دیا ہے۔ آپ کے بھائی کا بیٹا بھلے ابھی ٹیٹ پونجا ہو مگر آنے والے دنوں میں نہیں ہوگا۔ ان شاء اللہ!“

”ٹائیپ اور غازی صاحب کی اعلا تربیت ہی تھی جو وہ کافی دیر سے چپ کر کے ساری بکواس ملاحظہ کر رہا تھا۔ لیکن جب بولنا شروع ہوا تو حد ادب کو ملحوظ

رکھ کر اس نے شاید کوئی دھماکا کر دیا تھا۔ سونیا نگوٹ سے اسے گھورنے لگی تھیں۔ سمجھ گئی تھیں، درد پر وہ انہیں جواب دیا ہے۔

”جب معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا تو بیٹھنا کس بات کے لیے۔۔۔۔۔ چلیں انھیں۔۔۔۔۔ اللہ حافظ سب کو۔۔۔۔۔ علیہا گھر چلو۔۔۔۔۔“

سونیا بڑے خطرناک سے انھی تھیں۔ ہادی صاحب کو اٹھنے کا کہہ کر علیہا کو بازو سے پکڑ کر آگے کرتی اللہ حافظ کر گئیں تو سب ان کے انداز دیکھتے رہ گئے۔ علیہا اس وقت جانا نہیں چاہ رہی تھی لیکن سونیا جس طرح بازو دو بچے اسے چلنے کو کہہ رہی تھیں۔ کچھ بعد ناخا زور آزمائی پر آگ آدھ پھڑ ہی جڑ دیتیں۔ مکمل غازی نے چلے جانے کا اشارہ کیا تو وہ جھڑک کر ہاتھ چھروانی ان سے آگے نکل گئی۔ سونیا نے مروٹا بھی ٹائیپ سے ہاتھ ملانا گوارا نہ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆
وہ تینوں اپنی اپنی جگہ ساکت بیٹھے تھے۔ وہ سب سونیا کی طرح آگے گزر گئے تھے اور پیچھے دھکی چہرے چھوڑ گئے تھے۔ غازی صاحب اک دم چپ سے ہو گئے تھے۔ مکمل کو بے حد دکھ ہو رہا تھا۔ ان کی حالت دیکھ کر لگ رہا تھا کسی بھی بل ان کا ضبط جواب دے جائے گا۔ اور وہ رو پڑیں گے۔ سگے بھائی سے ملنے والے جھکے نے انہیں ٹوڑ کے رکھ دیا تھا۔

”بابا آپ پریشان نا ہوں۔۔۔۔۔ میں نے چند ماہ پہلے ہی بزنس شروع کر دیا تھا عرصہ سے چھوٹی موٹی آؤٹسٹوٹ کرتا رہتا تھا اور ان ہی کا پرافٹ بزنس میں لگایا۔ اللہ کا شکر ہے اچھا کام چل رہا ہے۔ آپ لوگوں کو اس وقت اطلاع دینے کا ارادہ تھا جب تھوڑا سا بلیش ہو جاتا لیکن ابھی اچانک منہ سے نکل گیا۔۔۔۔۔ سوری بابا میں نے آپ لوگوں سے چھپایا صرف اس ڈر سے تھا کہ بزنس ڈوب گیا تو شرمندگی ہوگی۔“ وہ سچائی سے اعتراف کر گیا تو غازی ہولے سے مسکرائے۔

”اللہ تو پھر کل رکھو۔۔۔۔۔ وہ تمہیں کامیاب کرے گا۔“ دعا سہ انداز پر وہ باپ سے لگ گیا۔

”بابا! آپ کسی چیز کو دل پہ نالیں۔ بے فکری سے رہیں۔ اب سے کمانے کی ذمہ داری میری۔ ماما آپ بھی پریشان نا ہوں۔“ دونوں کے بچے چہرے اسے دکھ دے رہے تھے۔

”اور علیہا۔۔۔۔۔؟“ ٹائیپ کی دھکی آواز بمشکل نکلی تھی۔ اک بل کو مکمل غازی کی دھڑکنیں بھی دکھ گئی تھیں۔ سونیا کس کروڑ سے اوٹیں سے شادی کی بات کر رہی تھیں۔ بیسوں کی جنگ تو وہ محنت سے جیت سکتا تھا لیکن محبت۔۔۔۔۔ اس کے سامنے بہت بڑا سوال نشان آ گیا تھا۔

”اگر آپ کے نصیب میں بہو لکھی ہوئی تو وہی بنے گی۔ ورنہ کوئی اور نہیں۔۔۔۔۔“ حتیٰ لچہ پر ٹائیپ چونک کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔ اس کے چہرے پر سختی در آئی تھی۔

☆ ☆ ☆
ٹائیپ سوچ رہی تھیں کہ ایسا کیا ہو لے سونیا کے اندر اتنی نفرت جو وہ ہم سب کو اپنا دشمن سمجھتی ہے۔

☆ ☆ ☆
دو دہائیں فطری شرم و حیا کے لمبا دے میں جھپٹی جھپٹی بیٹھی ہوئی تھیں۔ گھر عورتوں، بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ دلہن دیکھنے کے شوق میں جیسے اہل محلہ اٹھ آیا تھا۔ ٹائیپ تو کل بھی یہ وقت جھکا چکی تھی اس لیے قدرے مطمئن تھیں۔ جب کہ سونیا کی سسرال میں پہلی صبح تھی۔ تاج در پیچم نے اک دن کے فرق سے دو بہوئیں اتاری تھیں۔ اور کل دونوں کی ویسے کی تقریب تھی۔

”بھئی تاج ور کل تمہاری بڑی بہو کو دکھ کر گئی تو دل میں چھوٹی بہو کو بھی دیکھنے کی خواہش جا کی اس لیے چلی آئی۔“

”دیکھ لو دونوں بہوؤں کو۔“
تاج ور نے خوش اخلاقی سے محلے والی کو کرسی پیش کی تھی وہ دونوں ہال والے روم میں دلہن بنی بیٹھی تھیں۔ ناشتے کے فوراً بعد تاج ور کی ہدایت پر لڑکیوں نے دونوں کو تیار کروا دیا تھا کہ دلہن دیکھنے کو لوگ آنے لگیں گے اور وہی ہوا۔ ابھی دونوں تیار ہو کر

اک مرتبہ پھر عروسی جوڑا پہن کر بیٹھی ہی تھیں کہ لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ چونکہ تاج ور اور بڑی صاحب کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا۔ شہرت اچھی تھی اس لیے لوگوں کو بہوئیں دیکھنے کا شوق بیچ لارہا تھا۔

”دیکھ رہی ہوں آیا۔۔۔۔۔ بہوئیں تو ماشاء اللہ دونوں ہی بے حد اچھی لائی ہو لیکن بڑی کے چہرے پر نمک ذرا زیادہ ہے۔۔۔۔۔ نقش بھی بہت کھڑے ہیں۔“

محلے والوں نے بے لاگ تبصرہ کیا تھا اور بلا کی خود پرست سونیا کو ان کا جملہ کاٹنے کی طرح چھہ گیا تھا۔ اس نے بے ساختہ گردن گھما کر ساتھ بیٹھی ٹائیپ کو دیکھا تھا۔ اپنی تعریف سے قطع نظر وہ سادہ انداز سے بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی فائز کار رنگ نہیں تھا۔ خوب صورت تو سونیا بھی تھی مگر ٹائیپ کے آگے مدہم پڑی تھی۔

تاج ور نے محلے والی کو مناسب جواب دیا تھا کہ اپنی جگہ دونوں پیاری ہیں لیکن سونیا کے دل میں بال آ گیا۔ ہر کسی کی آمد پر سونیا کے کان کھڑے ہونے لگتے۔

ایسی اور اس جیسی کھسر پھر سونیا کے ذہن نے محفوظ کر لیں اور ہر بار اس کا جی چاہتا کہ کہنے والی کو دھکے دے کر کمرے سے نکال دے لیکن دلہنا پے کی لاج رکھنے بیٹھی ضبط کرتی رہی۔ اگلے روز ویسے کی تقریب تھی۔ اس وقت شادی زیادہ پارلر تھے۔ پھر بھی تاج ور نے دونوں بہوؤں کا میک اپ پارلر والی سے کروایا۔ سونیا جب تک تیار ہوئی رہی اس کی نگاہ ٹائیپ پر جمی رہی اور وہ پارلر والی کے کام میں بین میک اپ لگتی رہی۔

”مجھے وہی لپ اسٹک لگایے جو آپ کی بہن، بھابھی بیگم کو لگا رہی ہے۔ بش آں ہلکا ہے بھابھی کی طرح ڈارک کریں۔“

اب کے بیویشن بھی جھنڈا گئی تھی۔ سونیا کی روک ٹوک اس کے کام میں خلل ڈال رہی تھی اور بجائے اچھا ہونے کے کام رہا ہی ہو رہا تھا۔

دیکھیں آپ کی بہن نے کتنا اچھا ہیرا سٹائل بنایا ہے
بھابھی بیگم کا جب کہ آپ نے میرے سر پر گھونسلہ
بنا دیا ہے۔

سونیا اک دن کے دلہنا بے کو فراموش کیے
بیویشن کو شکر اپنے جوڑے کی پیش نکالنے لگی تھی۔

”میک اپ سے ہم آپ کے نقوش، رنگ کو
اُبھارتے ہیں۔ پلاسٹک سرجری نہیں کر سکتے۔
میرے کام کو برا کہنے کے بجائے آپ کو اپنے نقوش
اور رنگ اپنی بھابھی بیگم جیسے کروا کر آنا چاہیے تھا۔“

اتنی محنت سے بنائے بال بگاڑتے دیکھ کر
بیویشن بھی تپ گئی تھی۔ جھنجھلا کر سناں۔ اپنی بہن کو
جا کر جانے کیا کہنے لگی کہ بھابھی کے ٹیل پینٹ
لگاتے وہ سونیا کو دیکھنے لگی۔ اسے اپنی شہرت بچانا بھی
تب ہی ٹیل پینٹ پکڑ کر خوش اخلاقی کی مسکراہٹ
سجھا کر اس تک آگئی۔

پھر بیویشن نے لاکھ جتن کر کے اس کا موڈ ٹھیک
کرنے کو بال بنائے۔ لب اسٹیک پیچ کی۔ ہاتھ
ذا رک کیے مگر سونیا اب بھی غیر مطمئن تھی۔

”میں بھابھی بیگم سے زیادہ اچھی لگ رہی ہوں
نا۔؟ تیار ہونے کے بعد گھوم گھوم کر خود کو ہر انگل
سے دیکھتی وہ چپکے سے دریافت کر رہی تھی۔

”میم! سوازانہ! ایک جیسی چیزوں کا ہوتا ہے تو
اس میں بھی فرق ہوتا ہے۔ پھر آپ دونوں تو دو الگ
الگ ہستیاں ہیں اک دوسرے سے موازانہ کیسے
ہو سکتا ہے۔ کچھ چیزیں آپ میں اچھی ہیں تو کچھ
آپ کی بھابھی بیگم میں۔“

بیویشن سمجھ دار اور نرم سہاؤ کی تھی۔ اس کا روز کا
کام تھا لوگوں کو سنا سنا سنا کر سونیا کی فطرت کو وہ
ابھٹے سے سمجھ گئی تھی۔ تب ہی تدبیر سے جواب دے
کر اسے اس مقابلے بازی سے دور رکھنے کی کوشش
کرتے اس کا ذہن صاف کرنے کی کوشش کی مگر سونیا
کا دھیان اس بات پر تھا کہ ثانیہ کا دو پٹا جس طرح
سیٹ ہوا ہے۔ اس کا نہیں۔

”دونوں بہت پیاری لگ رہی ہیں مگر بڑی کے
چہرے پر جو ملاحت، معصومیت اور بھولا پن ہے وہ

اسے مزید حسین بنا رہا ہے۔“ اسٹیج پر چڑھی چچی ساس
نے جب اپنے خیالات کا اظہار کیا تو سونیا جل کے
جھسم ہو گئی۔ پارلر میں ساری دوسری بے کار گئی تھی۔

پھر ایسے کتنے مواقع آئے جب ہر بات پر
دونوں کا موازانہ ہونے لگا۔ کھیر کی رسم ہوئی تو ثانیہ
کی تعریف زیادہ ہوئی کہ سونیا کی کھیر میں چینی زیادہ
ڈلی کہ کھیر کڑی تھی۔
دن آگے بڑھے تو گھر میں ثانیہ کی داہ داہ ہونے
لگی۔

”بھئی ہماری بڑی بہو بڑی سحر خیز اور نماز کی
باندی ہے۔ فجر پڑھ کر پہلے میں بیٹھا رہتا تھا کب تم
اٹھو اور مجھے چائے دو لیکن پھر یہو خود نماز پڑھ کے
ہم دونوں کے لیے ناشتا بنا دیتی تھی تو ہم دونوں باپ
بچی صبح ناشتا کر لیتے ہیں..... دیکھ لو اب میں نہیں
جھی جھک نہیں کرتا۔“

نذیر صاحب، تاج در کو چھیڑ رہے تھے۔
”ہاں تو اچھا ہے نا بہو کے ہاتھ کا ناشتا کریں،
کب تک مجھ بڈھی سے صبح بیڈنی کی آس لگائے
رکھیں گے۔“
تاج در بیگم نے مسکراتے ہوئے شریک سفر کو
جواب دیا تھا۔

”دیکھنا بیٹا! کتنی سیانی ساس ہے تمہاری..... کیسے
اپنی ذمہ داری تمہارے سر ڈال کر خود آزاد ہو گئی ہیں۔“

نذیر صاحب، ثانیہ کو ہم نوائے تاج در کو چھیڑ
رہے تھے۔ ثانیہ جیسی مسکان سجائے چاول صاف
کر رہی تھی کہ دن کے کھانے کی تیاری وہ جلدی
شروع کر رہی تھی۔

”اچھا ہے نا بابا..... اب سے ہم آپ کی بیٹیاں
ہیں، ہم آپ کا خیال نہیں رکھیں گے تو کون رکھے
گا۔“ ثانیہ نرمی سے کہہ گئی تھی۔

”خوش رہو..... سدا سہاگن رہو، میری بچی.....“
دونوں صدق دل سے دعا دے رہے تھے۔ گو کہ
سونیا کی برائی کوئی نہیں کرتا تھا مگر ساری گفتگو سنی سونیا
کا دل جل کے خاک ہو گیا۔ اس نے چپکے سے گھڑی کو
دیکھا جہاں دن کے گیارہ بج رہے تھے۔

”اٹھ گئیں، ٹھہرو میں تمہارے لیے ناشتا بنا دیتی
ہوں،“ ثانیہ چاول بھگونے پکن میں آئی تھیں سونیا کو
پکن میں دیکھ کر تھاں اک طرف رکھ کر ناشتا بنانے کی
تیاری کرنے لگیں۔

”ناشتا میں خود ہی بنا لوں گی لیکن صبح صبح جو
پکوان آپ چڑھا دیتی ہیں ان سے چوہا فری ملے
تب نا۔“ سونیا نے اب زبان کھولنا شروع کر دیا تھا۔
ثانیہ اس کے کچھ پر چڑھ گئی۔

”دن کے کھانے کی تیاری جلدی اس لیے کرتی
ہوں کہ اسٹور پر کھانا بھیجنا ہوتا ہے۔ دوسرے چوہے
پر تو رہنا رہا ہے میں چاول بعد میں بنا لوں گی۔
پہلے تمہارے لیے ناشتا بنا دیتی ہوں۔“

ثانیہ نے زبان کی تیزی دکھائے بنا چاولوں کے
لے ابلتا پانی چولے سے اتار کر ایک طرف رکھ دیا تو
سونیا منہ میڑھا کر کے کمرے میں چلی گئیں۔

سب ہی دونوں کا خیال رکھتے تھے پر ملا تعریف
کرتے تھے۔ ثانیہ اپنی نرم مزاجی اور اچھی عادت
کے باعث جلدی سب کی پسندیدہ بن گئی تھی۔ گھر کی
ذمہ داریاں خوش اسلوبی سے نبھانے لگیں تو ان کی
داہ داہ سونیا کو کھٹکنے لگی۔ ثانیہ کو ذلیل کروانے کے لیے۔
اپنی سیدھی حرکتیں کرنے لگی۔ ثانیہ کھانا کھانا کر کھتی
تو کچھ دھڑکے تنک کھانے میں ڈال کر چپکے سے نگل
جاتی۔ کبھی سالن میں مرجھیں جھونک دیتی اور ثانیہ
پر بیٹان سب سے معذرت کرتی رہتی۔

اتفاق سے تاج در بیگم نے سونیا کو یہ حرکت
کرتے دیکھ لیا تو انہیں بھی سمجھ میں آ گیا کہ ثانیہ کے
کام کا چانگ خراب کیسے ہونے لگے کہ وہ بدل ہو کر
کھانا پکانے سے ڈرنے لگی تھی۔

انہوں نے خاموشی سے شوہر سے ذکر کیا۔
دونوں ہی سونیا کے رنگ ڈھنگ جان گئے تھے۔ اس
لیے دونوں میں طے پایا کہ گھر کے سچ پھولوں کی
ہاڑھ کے اس طرف ہادی کو شفت کر دیا جائے اور
دوسری طرف غازی کو۔ بیٹوں نے سنا تو بہت
پریشان ہوئے مگر نذیر اور تاج در کی دانائی کام آئی کہ
گھر میں فساد برپا ہونے سے پہلے انہوں نے

سد باب کر دیا۔ خود وہ دونوں ثانیہ اور غازی کے
ساتھ رہتے تھے کہ دونوں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ
وہ ان کی طرف رہیں۔

”تمہارے ماں باپ کو تم سے نہیں بھائی اور
بھابھی بیگم سے زیادہ محبت ہے۔ دیکھ لو ان کے پاس
رہتے ہیں۔“ سونیا نے ہادی کے کان بھرتا چاہے۔
”اچھا ہی ہے جو وہاں ہیں کیونکہ بھابھی بیگم
جتنی خدمت دونوں کی کرتی ہیں تم نہیں کر سکتے۔ یہ تو
تمہارے حق میں اچھا ہونا۔ ساس سر کی ذمہ داری
نہیں ملی۔“

”ہادی سائڈ لے کر روشن پہلو دکھا گئے تو وہ
گھور کے رہ گئیں۔

دونوں کی شادی ساتھ ہوئی تھی سونیا چاہتی تھی
پہلے ان کی گود بھرے اس لیے وہ ڈاکٹر کے ساتھ دعا
قعوید کے لیے پھیرے بھی لگانے لگیں مگر ثانیہ کی گود
پری ہونے کی خبر نے ان کے ارمانوں پر اوس
گرا دی۔ ان کی اولاد پہلے آئی تو گھر کی بڑی اولاد
کے ناتے اسے خالص اہمیت دی جاتی مگر یہاں بھی
ثانیہ بازی ہار گئی تھی اور جب ان کی گود میں تحصیل
غازی آتا تو سونیا کے قعوید گندوں میں مزید تیزی
آگئی۔ ڈاکٹر کی نسخوں کی لائن لگ گئی مگر ان سب کے
باوجود خوش خبری ملنے میں اسے دو سال لگ گئے۔ خبر
ملنا تھی کہ وہ چھوٹی موٹی بن گئی۔ پیر پنگ سے نیچے نا
رکھنے لگی۔ تب تاج در ان کی دیکھ بھال کے لیے صبح
سے رات تک موجود رہتی تھیں۔ ثانیہ بھی چھوٹے
تھیں کو اٹھا کر ان کی ہانڈی رونی کر دیتی تھی۔ مگر ان
سب کی محبتوں کو محسوس کرنے کے بجائے وہ مقابلے
بازی کی فضا کو برقرار رکھتے دعا گو تھی کہ اس کی پہاڑی
کی اولاد لڑکا ہو تاکہ ثانیہ اکیلے ہی رانی بنی نا تھیں
رہے۔ تحصیل غازی تین سال کا ہوا تو اس کے
ارمانوں کو خاک میں ملا کر علیہا ہادی دیا میں آگئی۔

”بھئی اب ہم دونوں بڈھے بڑھیا جین سے
مر سکیں گے اللہ نے ہمیں لوٹا، پونی دونوں دکھا دیے۔
نذیر اور تاج در علیہا کی آمد پر بے حد خوش تھے۔
لیکن سونیا کو یہاں بھی اپنی ہار تھی گئی تھی۔ اور یہ

مقابلے بازی بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ سوئیا کی رکیں تک نہ لپی ہوئی تھیں۔

ان کی نفرت سے قطع نظر علیہا ہادی جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی اسے ثانیہ سے زیادہ لگاؤ محسوس ہو رہا تھا۔ اور پھر میل تھا جو اسے چپکے چپکے دیکھا کرتا تھا۔ اک دن اسے اپنی کسی کزن سے بات کرتے دیکھ کر علیہا نے کارل سے پکار کر سامنے کیا۔

”آئندہ دنیا سے بات مت کرنا۔ مجھے پسند نہیں۔“ دھونس سے کہا گیا تھا۔
 ”کیوں پسند نہیں؟“ وہ لب دبائے معصوم بن کر پوچھ رہا تھا۔

”میں نے کہہ دیا نا۔“ حتیٰ انداز تھا۔
 ”اک شرط پر مانوں گا۔“ وہ سودے بازی پر اتر آیا۔ وہ سو الپ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”پہلے وعدہ کرو، تم بھی کسی لڑکے سے بات نہیں کرو گی، سوائے میرے، کیوں کہ مجھے بھی بدواشت نہیں کہ تم کسی اور سے بات کرو، تم صرف میری ہو۔“ یہ اظہار اتنی بے اعتیاری میں ہوا تھا کہ دونوں ہی حیران رہ گئے تھے۔

نذیر اور تاج و درہم کو بدیہی سفر کو روانہ ہو گئے تھے
لیکن ان دونوں کی بیٹیوں کو یقین تھی کہ ایک دوسرے کا
ہاتھ نہ چھوڑا مگر سونیا کی کوششیں بالآخر عرصہ بعد
رنگ لے ہی آئی تھیں۔ ساتھ چھوٹے لگا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن کا سورج طلوع ہو گیا تھا۔ ہادی صاحب اسٹور پر جا چکے تھے۔ انہیں اکیلے آتے دیکھ کر ورکرز نے حیرانی کا اظہار کرتے غازی صاحب کی طبیعت کے متعلق تشویش سے پوچھا تھا۔ ساتھ آنے کی دونوں بھائیوں کی برسوں پرانی عادت تھی۔ پہلے وہ بڑے بھائی کی بائیک کے پیچھے بیٹھ کر اسٹور جاتے تھے تو اب گاڑی میں ان کے ساتھ لیکن آج اکیلے ڈرائیور کے آتے انہیں خود عجیب سا لگا تھا۔

انہوں نے اطلاع دی ان سے محبت کرنے والوں نے استفسار کیا تو ہادی صاحب نے انہیں جہاز کراہم پر توجہ

دینے کا ٹکچر دینے لگے۔ ملازم لوگ کیا کہتے، کام کرنے لگے۔ لیکن ہادی صاحب کے اندر اگ بے چینی در آئی تھی۔ نظر بار بار بھائی صاحب کی خالی جگہ پر جا رہی تھی اور اسور پر ان کے تھوڑے سے کیا تبدیلی رونما ہوئی یہ بھی ان پر جلد چلنے لگا۔ بظاہر یہ ہی لگتا تھا وہ کیش کاؤنٹر پر بیٹھے ہیں مگر ان کے اخلاق کے باعث ہر ملازم ان کی بات پر سرخم کرتا تھا۔ وہ بھی جھڑک کے بات نہیں کرتے تھے جب کہ ہادی صاحب جلدی غصے میں آکر ملازم پر برسرے لگے تھے۔ جس سے ملازم کی عزت نفس پہ پڑتی چوٹ انہیں بدول کر دیتی تھی مگر غازی صاحب کے ہونے کے باعث وہ ملازم کو بہلا کر درگزر کرنے کا مشورہ دیتے تھے۔ انہیں خبر تھی کہ کاروبار سرد و گرم سے ہی چلتا ہے۔ اگر دونوں ہی گرم ہو جاتے تو ملازم نہ کھتے۔

غازی صاحب اسٹور نہیں جا رہے، اس بات کی سب سے زیادہ خوشی سونیا کو ہو رہی تھی۔ علیہا بادی کو دی گئی دھمکی پر انہوں نے عملاً بھی قدم اٹھایا تھا اور پھولوں کی باڑھ کے پاس پانچ فٹ کی ویار کھڑی کروادی تھی۔

ہاری صاحب نے بولنا چاہا تو انہیں سخت جملہ سننا
پڑا تھا۔ انہوں نے دیوار تو اونچی کر دی تھی مگر شاید
چنول کی تھیں کہ علیہا کے کمرے کی کھڑکی کی چابیہ کے
گھر کے لاؤنج میں پھلتی ہے۔

سو نیا مضمون تھیں کہ علیہا ان سے مارا اس ضرور
تھی مگر ثانیہ کی طرف جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔
بس سارا وقت اپنے کمرے میں گزارتی تھی۔

☆☆☆

ہم بے بس ہم مجبور پیا
مت ہم سے ہونا دور پیا
ہم کر چنی کر چنی دل والے
ہم ہو گئے پکنا چور پیا
جب نام تمہارا سن لیوں
ہم ہو جاویں سرور پیا
اک بار ہمیں اپنا کہہ کر
تم کرو نامغور پیا

ہمیں ناگ ڈسیں بے چینی کے
تم جب سے ہو مجھ پر پیا!
ہم آخر تیری چاہت میں
ہو بیٹھے ہیں محصور پیا!

اس دل اندر تصویر تیری
تیرا چاروں جانب نور ہوا
اک چچی پرست کے جیڑھوں میں
ہمیں مر جانا منظور ہوا !!

شمیل گھر کی تمام لامٹوں آف کر کے آغز میں
لاؤنج کی لامٹ آف کئے آیتھا جب ایسے کھڑکی
راہٹ محسوس ہوئی۔ چونکہ کھڑکی خاصی اونگھی تھی اس
لیے اسے چلاگ نکالنے میں دقت ہوئی تھی۔ اس
وقت بھی وہ بے چارگی سے کھڑکی پر بیٹھی چلاگ
اگانے سے پہلے چپلس نیچے پھینک رہی تھی تاکہ
چلاگ لگانے میں آسانی ہو تب اس کی نظر شمیل
غازی پر پڑی تھی۔ جو تھر سے انگلیوں پر رکھے اسے
کھڑکی سے جبر لٹکائے دیکھ رہا تھا۔
”کھڑے شکل کیا دیکھ رہے ہو۔ ہاتھ دوتا کہ
میں چلاگ تو لگاؤں۔“

رایت کے اندھیرے میں کھڑکی پر بیٹھی وہ باتیں سنارہی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ خوب چھیڑتا مگر حالات جس بج پر تیزی سے جا رہے تھے۔ اس نے لبوں سے مسکراہٹ بھی چھین لی تھی۔ وہ دن کا نکلا رات کو لوٹا تھا۔ سونیا کے لفظوں نے دن رات محنت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بنا کچھ کے صوفہ کھڑکی کے نیچے دھکیل کر اس نے ہاتھ بھی آگے بڑھا دیا تھا۔ جس کے باعث اس کا ہاتھ تھامے دوپٹا آسانی سے ہلے صوفے پر اور پھر لاؤنج میں قدم رکھ چکی تھی۔

”تھینک یو۔ اس صوفے کو اب ہٹانا مت
یہاں سے ورنہ چھلانگ لگا لگا کر میرے پیر میں مورچ
آجائے گی۔“ پیروں میں چپل ڈالتی وہ ہاتھ پکڑے
ٹھہری تھی۔

”اتنی رات گئے اس طرح نا آیا کرو۔ چچی جان نے دیکھ لیا تو پھر تمہاری خیر نہیں ہوگی۔ وہ شاید ابھی اس کھڑکی کو فراموش کر گئی ہیں۔ جس دن باو آیا اسے

بھی چنوا دیں گی۔" وہ سمجھانے لگا۔

”چنوا کے دیکھیں پھر میں نے بھی اینٹیں
ہلا دیں ہیں اس گھر کی۔“ وہ جذباتی ہوئی۔
”برکی بات۔۔۔۔۔“ وہ سرزنش کرنے لگا۔

”اور رات کی بھی تم نے خوب کھئی۔ دو دن سے دن کو بھی تائی اور تایا چان سے مل کے جا رہی ہوں۔ تم ہوتے نہیں ہو۔ اب تم سے ملنا ہے تو کیا کروں۔“

منہ بسور کے کہتی بچیہہ نگاہیں اس پر جم گئی۔ اس کا
بلیوکر کے سوٹ میں شیفون دوپٹا لپے کھلے بالوں کے
ہالے میں وہ خاصی دل فریب لگ رہی تھی۔
”اوہو.....! تو محترمہ بطور خاص چوری چوری
مجھ سے ملنے آئی ہیں۔“ اس کی اداسی دور کرنے کو وہ
شوخی سے کہہ گیا۔ ”آنے والا وقت جانے کیا لے کر آتا
اس وقت اس پل کو تو خوش گوار بنا سکتے تھے۔
”ہاں تو بھیر، جیولٹ، سوئی، بلیک سے کم مجھے بھی
مشکلات نہیں۔ کھڑے پرنا سبھی کھڑکی سے چھلانگ
لگا کر ملنے تو آرہی ہوں نا۔“ وہ اس کے انداز سے
رج کے محظوظ ہوا۔

”پہلے پوچھو تو لو، میں تمہارا رانچھا، رو میو، میو ال یا مجھوں نے کو تیار ہوں بھی یا نہیں۔“ وہ چھینٹنے لگا۔
 ”نا کر کے تو دیکھو۔ تم پر جان دار سکتی ہوں تو تمہاری جان لے بھی سکتی ہوں۔“ دھکے لگی۔
 ”اٹنی رات کو تم مجھے دھکے لگائی ہو۔ پھر تو مجھے ڈرنا چاہیے تم جیسی جنونی لڑکی سے۔“ وہ مسکرایا۔
 ”کمان، اک سکون اندر اتر گیا تھا اس کے انداز پر رہنے تو اک۔“ بکلی سی چھائی ہوئی تھی۔

”ہاں تو درو۔“ شان بے نیازی سے کندھے چمکا کر اپنے ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیکھے۔

”چھوڑنے کے لیے تھوڑی تا پکڑا ہے۔“ اسے
 بتاتا وہ ہاتھ تھا ہے سیڑھیوں کے اسٹیپ پر بیٹھ گیا
 تھا۔ وہ بھی ساتھ بیٹھ گئی۔

”اواس ہو.....؟“ اس کی طرف سے خاموشی
 ہی تو علیہا کو بے چینی ہونے لگی۔ تمیل غازی کی

نظر بند پھولوں کی بازو کے ساتھ اٹھی دیوار پر تھیں۔
”کتنی دوریاں آئیں۔ کیسے ٹھیک ہوگا سب
کچھ؟“ انداز پر سوچ تھا۔

ہو جائے گا ٹھیک۔ اور نا بھی ہو تو وہ نہیں ہوگا جو
مما چاہتی ہیں۔ ”علیہا ہادی کا انداز قطعیت لیے
ہوئے تھا۔

”میں ساری زندگی حالات کے بہتر ہونے کا
انتظار کر سکتا ہوں لیکن تم کمزور پڑ گئیں تو۔“

وہ خوف زدہ لگا ہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ
سونیا کے سامنے دس بار دست سوال پھیلا سکتا تھا
لیکن وہ علیہا کے ساتھ زبردستی کرتیں تو وہ کچھ نہیں
کر سکتا تھا۔

”تمہیں میری محبت اتنی کمزور گئی ہے؟“ وہ اٹا
استفسار کرنے لگی۔ وہ بے ساختہ ٹی میں سر ہلا گیا۔

”تو بس جب کر کے اچھی اچھی باتیں کرو۔۔۔۔۔
دو دن تمہیں دیکھا نہیں، ملی نہیں۔ دل عجیب سا
ہور ہا تھا۔ تب ہی چلی آئی کہ اگر سو بھی رہے ہو گئے تو
بھی اٹھا کر باتیں کروں گی۔“

”کرو گی۔۔۔۔۔ کتنی باتیں جمع ہو گئیں ان دونوں
میں؟“

تم ہی تو میرے سب کچھ ہو۔ میرے دوست،
ہم زاد، محبوب اب اور کوئی تو ہے نہیں کہ اس سے
باتیں کروں۔ دہائی دی گئی۔

”کوئی ہوتا بھی نہیں چاہے۔ ورنہ اپنی بیٹی کی
جان نکال دوں گا۔ مجھے اپنی بیٹی کی بے ساختگی ہی
اچھی لگتی ہے۔

اپنا سر ہولے سے اس کے سر سے ٹکرایا تھا۔

☆ ☆ ☆

”عید الاضحیٰ کا چاند نظر آنے والا ہے اس بار عید
قربان کیسے منا سکیں گے۔“ ثانیہ بہت آثر روہ لہجے
میں دریافت کر رہی تھیں۔ ہر عید، بقرہ عید پر دونوں
فیلی اٹھتی ہوتی تھیں۔ اک سے زائد قربانی کے
جانور آتے تھے اور مل کر ہی قربانی کا فریضہ انجام
دیا جاتا تھا مگر اس بار صورت حال مختلف تھی تب ہی
ثانیہ نے تشویش سے دریافت کیا۔

☆ ☆ ☆

”قربانی ارب العزت نے ابرہیم علیہ السلام کو
آزادانے کے لیے ان کے بیٹے کی قربانی مانگی تھی۔
اور وہ سرخرو ٹھہرے تھے۔ امت مسلمہ کو اک مثال
دینے کے لیے رب العزت کو باپ بیٹے کا امتحان لینا
مقصود تھا لیکن آج۔۔۔۔۔ ہم انسان کیا کر رہے ہیں؟
ہم اک دوسرے کو آزادی تو رہے ہیں۔ محبت کرنے
والے کو پرکھ کے۔۔۔۔۔ چھوڑ کے۔۔۔۔۔ خود سے دور
کر کے۔۔۔۔۔ رشتوں کو آزما کے ان سے سن پسند قربانی
ہی تو مانگ رہے ہیں۔ گئے بھائی پر قربان تو میں نے
بھی کر دیا۔۔۔۔۔ اپنی انا۔۔۔۔۔ غیرت۔۔۔۔۔ مان۔۔۔۔۔ میں
اسے اپنا بچہ سمجھتا رہا اور وہ مجھے چور۔۔۔۔۔“

غازی صاحب کی آواز دکھ سے بھر گئی تھی۔
”میرا تو سارا وجود ہی قربان ہو گیا۔۔۔۔۔ برسوں
کی بنائی عزت، ذلت پر قربان ہو گئی۔“

انہیں گہرا صدمہ لگا تھا۔ ثانیہ کو انہیں سننا
شور مگنے لگا۔ وہ جذباتوں اور رشتوں کی قربانی پر
آنسوؤں سے رونے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

”تیار ہو جاؤ، آپا جلد رنگ پہنانے آ رہی
ہیں۔“ سونیا سے مراد وہ ستارہ تھیں۔

اور میں نے آپ کو پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ میں کسی
اور سے شادی نہیں کروں گی۔“ وہ لاؤنچ کے صوفے
پر دونوں پیروڑے لی دی دیکھ رہی تھی۔ انداز
قطعیت بھرا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ دیکھتی ہوں، کسے نہیں کرتی ہو۔
پہلے تو میرا ارادہ کتنی کا تھا لیکن اب نہیں۔ اب نکاح
نہی کرواؤں گی۔ تیار رہ کر لو۔“

سونیا دھمکانی چلی گئی تھیں اور پھر انہوں نے اپنی
دھمکی کو عملی جامہ پہنانا بھی شروع کر دیا۔

نکاح کی تیاری ہونے لگی۔ خبر ثانیہ اور غازی
صاحب کے پورٹن تک پہنچی تو سب ہکا بکا رہ گئے۔
شمیل اک دم سے چپ رہ گیا تھا۔ ثانیہ اور غازی سب
بھلا کر ان کے آگے دست سوال پھیلائے آئے تھے۔
”سونیا! مجھے نہیں خبر تم کیوں اس طرح ضد
کر رہی ہو۔ جو گلے شکوے ہیں انہیں کہہ سن کر

درگزر کر دو۔ بچوں کی زندگی کا سوال ہے۔ دونوں
الگ ہو کر خوش نہیں رہ سکیں گے۔“ ثانیہ دہائی دے
رہی تھیں۔ غازی صاحب بھی انہیں منانے کی سعی
کر رہے تھے۔ اک بل کو ہادی صاحب کا دل بھی پیچ
گیا یوں تو وہ بڑے بھائی سے نظر ملانے کے قابل
نہیں رہے تھے مگر بڑے بھائی کچھ بھی جتائے بنا علیہا
اور شمیل کے لیے منارہے تھے۔

”معاف کریں بھائی بیگم! میں کسی کالے
چور سے علیہا کو بیاہ دوں گی لیکن آپ کے بیٹے سے
نہیں۔ مجھے آپ لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں جوڑنا۔“

گو کہ ان کے گڑگڑانے سے سونیا کی اٹا کو بے حد
آغوش مل رہی تھی مگر وہ پھٹکنے والی نہیں تھیں۔
”ہم جو چاہتے تھے، وہ تو مل گیا۔ یعنی کاروبار،
اب کیا مسئلہ ہے۔۔۔۔۔ مان جاؤ علیہا اور شمیل کے
لیے۔“ ہادی صاحب سونیا کو سمجھا رہے تھے۔

”دادوؤں میں آپ کی عقل کو۔ اسی مشکلوں سے
ان جو تک جیسے لوگوں سے نجات ملی ہے اور بنی ان
کے گھریباہ کر میں انہیں پھر سے خون پینے پہ مسلط
راہوں! انداز حد درجہ استہزاء تھا۔

”بیٹی دے کر اپنی کمزوری ان کے ہاتھ دے
اوں تا کہ وہ لوگ کل کو پھر سے کاروبار کے لیے ہمیں
بلیک میل کریں، بے نا۔۔۔۔۔ گھاس چرنے لگی ہوئی
بے میاں جی، آپ کی عقل۔“ سونیا نے غصے سے
پٹکا تو ہادی صاحب مر جھکا کے بیٹھ گئے۔

☆ ☆ ☆

نکاح کا سننا تھا کہ اس کے دل کو پٹنے لگ گئے۔
”بھلے پیر کی ملی کی طرح اس کے آنے کا انتظار کرتی
کمرے میں لیفٹ رائٹ کرتی بار بار کھڑکی سے
لاؤنچ میں جھانک رہی تھی۔

ماں، باپ کو پریشانی تا ہوا اس کے پیش نظر اس
نے ایک جانی پاس رکھی ہوئی تھی۔ تب اس کے
قدموں کی آہٹ پا کر علیہا صوفے پر پیر رکھ کر لاؤنچ
میں اتر کر اس کا ویٹ کرنے لگی۔

”السلام علیکم!“

اس نے بے ساختہ گھڑی کی اور دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

جہاں ساڑھے تین کا وقت ہو رہا تھا۔
”سوئی نہیں؟“ قرب آ کر استفسار ہوا۔

”تمہارے لیے جاگ رہی تھی۔ اتنی رات تک
ہوتے کہاں ہو۔۔۔۔۔؟ کوئی بری ایٹمی ویٹی تو شروع
نہیں کر دی تا۔“ وہ مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”استغفر اللہ! بندہ صبح کا نکلا رات گئے گھر آیا
ہے۔ کھانا، چائے کا پوچھتے بنا تفتیش شروع کر کے
گھر والی ہونے کا ثبوت دے رہی ہوں!“

وہ گھر میں داخل ہوا تو بڑھ حال تھا مگر اس کی
صورت دیکھ کر ہانسی عود کر آئی تھی۔

”ہاں تو پوچھوں گی تا۔ یہ کیوں سادقت ہے آنے
کا، اور بھر بھی بند تھا۔“ وہ کلاس لے رہی تھی۔

”اک بڑی کنسائنٹ کی آج ڈیلیوری تھی بس
اسی سلسلے میں دیر ہو گئی اور سیل کی بیٹری ختم ہو گئی تھی۔“

”میری جان پر بیٹی ہے اور لوگ برس کو فروغ
دے رہے ہیں۔“ وہ جمل گئی۔ جواب میں وہ کچھ نا
کہہ سکا۔ کہتا بھلا کیا۔ ہزار سوچنے کے بعد بھی کوئی
راہ نہیں نکل رہی تھی جس سے سونیا کو منایا جاسکتا۔

کنسائنٹ روانہ ہو گئی تھی اس کے بعد بھی وہ بے
مقصد سرکوں پر پھرتا رہا تھا۔

”عید سے دو دن پہلے ممانے نکاح کی تاریخ
رکھی ہے۔“

ایک میری رات میں وہ اک بار پھر اس کے
سامنے تھی۔ شمیل خاموشی سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ کیا
جواب دیتا۔ علیہا کو بھی خبر تھی اس کے پاس کوئی
جواب نہیں ہوگا۔ ثانیہ اور غازی صاحب کی بار بار کی
کوشش بھی دلیوں کے ٹوس میں تھی۔ سونیا اس سے
مس نہیں ہوتی تھیں۔

”شمیل ہم کو رٹ میرج کر لیتے ہیں۔“

سیر جیوں پر اس سے اک اسٹیپ اوپر بیٹھی وہ
بے ساختہ اس کا بازو تھام گئی۔

”چچی جان اور چچا جان کو دھوکا دے کر تمہیں
حاصل کرنا کو اور انہیں۔ کل کو یہی بے قاعدگی تمہیں
افسوس میں مبتلا کر دے گی۔۔۔۔۔ تم میری بیوی تو سب
کے سامنے، یوں چوری چھپے نہیں۔“

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

بلیک جینز، ٹی شرٹ اور گرے جیکٹ میں ملیں
وہ بلا کاؤچیہ لگ رہا تھا۔ بلیک بوٹ والا اک پیر
اسٹیپ کے اوپر اور دوسرا اس سے نیچے تھا۔
”میں تمہیں نہیں کھانا چاہتی تھی۔“ وہ نے حد
درو سے گویا تھی۔ گردن موڑ کے وہ بے ساختہ اسے
دیکھے گا۔ بلیک سوٹ پر گرے شفران کا دو پٹا لیے جس
کے چاروں طرف بلیک لکڑی بنی تھی۔ ادھر کھلے
— بالوں میں وہ پریشان نظر آ رہی تھی۔
”میں کب تمہیں کھانا چاہتا ہوں؟“ الٹا سوال
ہوا۔

”ٹھیک ہے کچھ مت کرو۔ آرام سے نکاح میں
شریک ہو کر مجھے کسی اور کا ہوتا دیکھنا۔“ اس کا بازو
جھٹک کر دیوار سے پشت نکائے گھٹنوں پر سر رکھ کے
روئے لگی۔ ”میں کو بے حد ترس آ رہا تھا اس پر۔
”مت رو، میں خود چچی جان سے بات کروں
گا۔“ انہیں منانے کی کوشش کروں گا۔“ وہ اس کے
جھکے سر پر ہاتھ رکھ گیا تھا۔
”مما بھی نہیں مانیں گی۔“ رنکھی آواز میں کہتے اس
نے جھٹکے سے سر اٹھایا تھا۔ اس کا اندازہ تو ہمیل
غازی کو بھی تھا۔ ہادی سے بات کرنا بے کار تھا۔ مرد
جب عورت کے اشاروں پر ناچنا شروع کر دیتا ہے تو
اس کی اپنی عقل گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔
”اویس کا نمبر ہے تو مجھے دو۔“ وہ جیسے کوئی قدم
اٹھانا چاہتا تھا۔

”کوئی فائدہ نہیں..... اس بے غیرت سے
بات کر کے اسے ساری صورتحال بتا چکی ہوں تاکہ وہ
خود منع کر دے مگر وہ لوہر پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں۔“ علیہا
نے بتایا تو اسے سمجھ میں آیا کہ وہ کیوں اس قدر
پریشان ہے۔ ہر طرف سے ناکامی نے اسے زور ورج
بنادیا تھا کہ وہ بار بار روئے لگی تھی۔

”مما بھی نہیں مانیں گی۔ تمہارے لیے۔ تم
سول میرج کے لیے نہیں مان رہے..... تمہارے
پاس اب بھی وقت ہے۔ سوچ لو۔ یاد رکھنا اگر مجھے
ہمیل غازی ناما تو علیہا ہادی بھی کسی کو نہیں ملے گی۔“
اسے ہکا بکا چھوڑ کر اک شہید کی بھری نظر ڈالی کر

وہ کھڑکی طرف بڑھی تھی۔ اک یہ ہی دھڑکا تو روز
اول سے ہمیل کے دل کو لگا تھا اگر سونیا ناما میں تو اور
وہ نہیں مان رہی تھی۔

ابھی وہ کھڑکی کے قریب پہنچی ہی تھی جب دھڑ
سے کچھ کھولنے کی آواز آئی تھی۔ غالباً اس کے کمرے
کا دروازہ کھلا تھا اور اگلے ہی لمحے تعقد بپ ہوئی۔
”تمہاری ماں نے یہ یہ تربیت کی ہے تمہاری
کہ تم رات کے اندھیرے میں میری بیٹی کو چور
دروازہ دکھا کر ورغلاؤ۔“ سونیا کا چہرہ اک دم سے
کھڑکی سے نمودار ہوا تھا۔ علیہا ہادی ڈر کے اک دم
سے پیچھے ہوتی تھی۔ ہمیل جو ان کی بات پر ہل بھی
نہیں سکا تھا۔ اس کے ڈر کے پیچھے ہٹنے پر مکا کی
بھرے انداز میں اٹھ کر اس تک آیا تھا۔ اسے دیکھتے
کھڑکی کا سلاخ پوری طاقت سے چلتی سونیا بری
طرح چلانے لگیں۔

”ماں باپ کے منہ پر کالک مل کر تجھے کیا مل رہا
ہے۔ کون سے گناہ کی سزا ہے تو.....“ سونیا، علیہا پر
برسنے لگی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے ہادی بھی آگئے
تھے۔ شور کی آواز سے غازی اور ثانیہ بھی آگئی تھیں۔
ہمیل کو عجیب سی شرمندگی نے آلیا وہ سب کیا سوچ
رہے ہوں گے۔

”چچی جان آپ ناحق ہم پر الزام لگا رہی ہیں۔
دیوار کھڑکی کر کے چور راستہ کا دروازہ آپ نے ہی
دکھایا ہے۔ جب جانتی ہیں کہ ہم اک دوسرے کو اپنا نا
چاہتے ہیں تو آپ کیوں ضد لگائے بیٹھی ہیں.....
آپ کو جو شرط رکھنی ہے رکھیں، جو منوانا ہے
منوائیں..... ہمیں گی کی تو آپ کے جیروں پر پڑ کے
معافی بھی مانگ لوں گا لیکن، پینز یہ نکاح رکوادیں۔“
وہ علیہا کی ڈھال بن کر آگے آ گیا تھا۔ نہایت
عاجزی و انکساری سے ان کے آگے ہاتھ جوڑنے لگا
تھا۔

”ٹھیک ہے رکوادیتی ہوں نکاح اور تم سے
رکوادیتی ہوں لیکن میری اک شرط ہے۔“ سونیا
کے اک دم بیٹرا بدلتے سے سب ہی اک سے کی
خوش محسوس کر کے چوکتا ہو گئے۔

”مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔“ ہمیل فوراً بولا۔
”پہلے شرط تو سن لو۔ علیہا سے تمہارا نکاح اسی
صورت ہوگا جب تم اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر گھر واپس
بن کے رہو گے۔ ہمیل غازی کا منہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس
کی غیرت و خرد پر کیسے تازیانہ لگانے والے جیلے تھے۔
ثانیہ اور غازی کو بھی افسوس ہونا کی ذہنیت پر۔

”ہمیل ہاں یا ناں کرے اس سے پہلے مجھے یہ
شرط منظور ہے۔ میں بھی نہیں چاہوں گی کہ آپ کی
گھنٹہ کے آگے ہمیل سر جھکاے۔ یہ شخص غرور ہے
میرا۔“ علیہا ہادی کے تنک کے کہنے پر سونیا اسے گھور
کے رہا تھیں۔ کچھ بعید تھا قریب ہوئی تو اب تک
اک آدھ پھڑ بھی کھا چکی ہوئی۔

”بچوں کی زندگیاں مت خراب کرو سونیا۔ اک
بار خنڈے دل سے سوچ لو۔“ ثانیہ نے اک بار پھر
التجائی۔ زمانے بھر کی نفرت و حقارت سونیا کے لہجے
میں آسانی۔

”تم سب لوگ ایڑیاں رگڑ کر مر بھی جاؤ گے تب
بھی یہ خواہش پوری نہیں ہونے دوں گی..... اندر آؤ
کر لی۔“ ان کی کھڑکی کا بھی علاج۔“

سونیا اک ساتھ سب سے غلط تھیں۔ ثانیہ
اور غازی بچپن تھے انہوں نے علیہا کے چور
دروازے کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی مگر علیہا نے
ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ وہ ملے بتا رہے نہیں سکتی۔
اور اب علیہا کا عمل ان کے لیے تازیانہ بن گیا تھا۔
سونیا مت بھر بھر کے باتیں سن رہی تھیں۔

☆☆☆

خود کو سکندر جان کر زندگی کو اپنے اشارے پر
پیلانے کی خواہش رکھنے والے جب وقت کے بچے
تھے آتے ہیں تو سارے کس بل نکل جاتے ہیں۔

ہادی صاحب کے بھی شکل رہے تھے۔ ملازموں
کی آئے روز کی چھٹی، خالی خالی کیمبن ان کا منہ
چڑھنے لگے تھے۔ ان کا زعم خاک سے ملنے لگا تھا کہ
وہ اکیلے اتنا بڑا اسٹور چلائیں گے۔ عید سر پر بھی اور
اسٹور خالی سا ہو رہا تھا۔ مال کب آئے گا۔ کتنا
آئے گا۔ یہ ساری ذمہ داری غازی صاحب اٹھاتے

تھے۔ ان کے چھوڑنے کے بعد یہ ملازموں میں
بھی بے قاعدگی دیکھنے میں آ رہی تھی۔ جس کی وجہ
سے آئے دن وہ اب ان کے عتاب کا نشانہ بنتے
تھے۔ سونیا کے سامنے تو بھی بولنے کی ہمت نہیں
ہوتی تھی وہ ساری ہمزاس ملازموں پر نکال کر اپنی
مردانگی کو سہلاتے رہتے تھے۔ لیکن الٹا ہی ہوا تھا۔
ان کی ڈانٹ پھینکار سے تنک آ کر دو ملازموں نے
کام بھی چھوڑ دیا تھا۔ سیزن کے موقع پر ملازم کی کی
ان سمیت گا پک کو بھی بہت محسوس ہو رہی تھی۔ انہوں
نے کئی لوگوں کو بول رکھا تھا۔ مگر اتنی جلدی ملازم ملنا
ممکن نہیں تھا۔ اوپر سے مال کی کمی نے انہیں سوچ
بچار پر مجبور کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے سلاٹر سے
رابطہ کیا تھا اور اس نے ساری بے منت عیش کی
صوت میں کہہ کر انہیں حیران کر دیا تھا۔

”کیش.....؟“ رضوان بھائی، آپ برسوں
سے ہمارے سلاٹر ہیں ہر بار ادھا مال کیش اور ادھا
ادھار پر آتا ہے..... آدھی بے منت آپ کو ہم بعد
میں کرتے تھے۔ پھر آج کیا ہوا؟“ ہادی صاحب کو
چیرائی ہوئی رضوان نے طائرانہ نگاہ اسٹور پر ڈالی
تھی۔ اور جگہ جگہ خالی خانے انہیں مسکرانے پر مجبور
کر گئے۔

”بھائی ہادی! کاروبار چلتا ہے ایمانداری اور نیک
نیتی سے..... جن لوگوں سے جان بچان ہے ان سے
مرتے دم تک اسی اصول پر کام کروں گا۔ غازی بھائی
تھے تو یہی معاملہ ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ لیکن جب وہ
نہیں رہے تو اصول تو بدلنا پڑیں گے نا۔“

”پچھلے مال کے میسے گئے ان کا اندازہ جتنا ہوا تھا۔
”م ان ہی کے بھائی ہو لیکن جب تم غازی جیسے
فحش کے گئے بھائی ہونے کے باوجود، اسے سائیڈ
لگا کر سارے اسٹور پر قابض ہو گئے تو میں غیر ہو کر تم
پر بھروسہ کیسے کر سکتا ہوں۔ جو گئے کوڈس چکا ہو وہ تو
غیر کو پتہ پھاڑ کھائے گا۔“

”متہ پھٹ رضوان صاحب، ہادی کو دن میں تارے
دکھا گئے تھے۔ وہ کئی کئی تک کچھ بول بھی ناسکے۔
”کیش پر جتنا مال چاہے ملے لو۔ حاضر ہوں۔“

”کہا تھا تا، علیہا ہادی تم پر قربانی تو ہو سکتی ہے قربانی نہیں دے سکتی۔“ مسکراتے کیوں کے ساتھ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

”ہاگل لڑکی!“ متاع حیات کی طرح سمیٹے وہ اپنی مضبوط پٹیلی سے اس کی کلائی دبا گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے اسے اٹھا کر باہر کی سمت بھاگا تھا۔ غازی صاحب پہلے ہی گاڑی نکالنے کو دوڑے تھے۔ ثانیہ تقریباً بچھاگ کر مکمل کے ہر قدم ہونے کی کوشش کر رہی تھیں ہادی صاحب بھی متحوش پیچھے لگے تھے۔ سونا حق دق لڑکھڑا کر دروازے سے اچھٹی تھیں۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو دواؤں کی بو..... اسینڈ پر گئی ڈرپ، ہاسٹل کی چھت کو دیکھتے اس نے کرب سے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ دوسرا ہاتھ کی گھنٹوں سے تھامے فھیل جو بنا پلٹیں جبکہ اس پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اس سے یہ عمل پوشیدہ تارہ سا۔ کبھی پیچ کر کلائی میں لگے ناگوں میں کھپاؤ صاف محسوس ہوا تھا۔ اس کی طرف گردن موڑے بنا وہ اس کو پہچانتی تھی۔ ”میں زندہ کیوں ہوں؟“ آنسو آنکھ کے کونے سے نکل کر تکیہ میں جذب ہونے لگا تھا۔

”میرے لیے۔“ ہتھیلی پر نرزی سے دباؤ ڈال کر اس نے ہولے سے کہا تھا۔

”کتنے گھنٹوں کی اذیت دی ہے تم نے، کچھ خبر ہے۔ جان نکال دی تھی۔“ دھیمی آواز میں گدہ کر رہا تھا۔ بند پلکوں سے گرم گرم آنسو بے جا رہے تھے۔

”جب اپنا نہیں بنا سکتے تو بچایا کیوں..... مرنے دیجئے۔“

”اگر جو خبر ہوتی میری بچی اتنا انتہائی قدم اٹھالے گی تو کب کا اپنا چکا ہوتا۔ یوں اس وقت اتنی ذیت میں نا ہوئیں۔ آئے ہیٹ مائے سلیف“

ندامت پھرے لہجے میں اس کی سماعت کو نرم دھیمے لہجے میں بھگور رہا تھا۔

”کہا تھا تا، جان دار سکتی ہوں..... تم نے کبھی مجھے سجدیگی سے لیا ہی نہیں۔“ بند پلکوں سے گدہ کرنی

وہ سیدھی دل میں اتاری جا رہی تھی۔

”اب یہ خطا دوبارہ نہیں ہوگی..... صرف تمہاری نانوں گا.....“ ہولے سے اعتراف ہوا تو اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

”وعدہ!“ تصدیق چاہتی تھی۔

”لیکا وعدہ!“ مسکرا کر نرزی سے ہتھیلی میں دباؤ بڑھا یا۔ ٹھکانے کی آواز کے ساتھ سب اندر آئے تو سب کی موجودگی کو محسوس کر کے فھیل غازی اس کا ہاتھ چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

”کیسی سے میری بچی۔ کیا بے وقوفی کی۔ حرام موت کی سزا کتنی طویل ہے پتا ہے۔“ ثانیہ پیار کرنے کے ساتھ سرزنش بھی کر رہی تھیں اور وہ مسکرا کر ان کی ڈانٹ سن رہی تھی۔

”کچھ لوگ زندگی اتنی حرام کر دیتے ہیں کہ حلال موت کا انتظار گراں گزرتا ہے۔“ وہ ہلکی سے مسکرائی۔

”اچھا بس بس..... ایسی باتیں نہیں۔“ ثانیہ کے سمجھانے پر وہ مسکرا کر رخ پھیر گئی۔ سونا اور ہادی پر نظر پڑتے ہی اس کے لب پیچ گئے تھے۔

”تا جان! جلدی سے میرے ڈسچارج کی بات کریں۔ مجھے گھر جانا ہے۔ اب سے میں آپ کی طرف رہوں گی۔ آپ رہیں گے نا مجھے اپنے گھر۔“ اس کی فرمائش پر سب ہی اک بل کو حیران ہوئے تھے۔ وہ منت آس سے غازی صاحب کو دیکھ رہی تھی۔

”کیوں نہیں بیٹا..... ہمارے ساتھ ہی چلو گی۔ اب میں بھی دیکھتا ہوں کون تمہیں زبردستی لے جاتا ہے۔ غازی صاحب سر پر مان سے ہاتھ رکھتے ہادی صاحب کو دیکھنے لگے تھے کہ شاید وہ کچھ کہیں مگر وہ نظر چرا گئے تھے۔

”تم ان کے ساتھ نہیں جاؤ گی..... میں بھی دیکھتی ہوں کیسے کوئی تمہیں لے جاسکتا ہے..... اغوا کی ایف آئی آر کنواڈوں کی میں۔“ سونا اس وقت بھی چٹھاڑنے لگیں تو علیہا ہادی کے چہرے پر زمانے بھر کی سختی دور آئی۔

”کس کے خلاف ایف آئی آر کنواکس گئی.....؟ میں عاقل و بالغ ہوں۔ اپنی مرضی سے

آپ کو چھوڑ کے جانا چاہ رہی ہوں۔ ہے کسی قانون میں بچھ روک لینے کی ہمت.....“ وہ پوری قوت سے چلائی تھی۔ سونا پچھلی پچھلی آنکھوں سے دیکھنے لگی تھیں۔ ٹیل سینے اسے نرم پڑنے کا اشارہ کیا مگر وہ حواسوں میں نہیں تھی۔ سونا کو تارے دکھانے لگی۔

”آپ نے دنیا کو زیر کیا ہوگا۔ مگر غلطانہ مشورہ ہے۔ مجھ سے مت اچھے گا۔ میں ثانیہ یا غازی نہیں ہوں جو آپ لوگوں کی ہر زیادتی پر صبر کروں..... میں علیہا ہادی ہوں..... آپ کا خون..... آپ ہی کی طرح خندی، خود غرض.....“

بہت کچھ باور کراتا لہجہ تھا۔ بہت جتنا ہی ہوئی نظریں تھیں۔ سونا جیسے آئینے کے آگے کھڑی ہو گئی تھیں۔ انہیں سکھ سا ہو گیا تھا۔ غازی صاحب اسچارج کی بات کرنے چلے گئے تھے۔ کمرے میں خاموشی رہ گئی۔

”تانی جان پلٹے تھوڑا سا پانی ملا دیں۔ گلاس کوکھ رہا ہے۔“ ماں باپ کو مکمل نظر انداز کیے وہ ثانیہ سے پانی مانگ رہی تھی۔ فھیل اس کے نزدیک بیٹھا تھا۔ اور وہ گئے ہونے کے باوجود غیروں کی طرح کھڑے تھے۔ مکمل خاموشی سے اس کی بند پلکوں کو دیکھ رہا تھا جو پانی پینے کے بعد اس نے دوبارہ بند کر لی تھی۔ صاف ظاہر تھا وہ ان کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

”سونا بیگم کہا ملا تمہیں یہ فساد کچھ بو کے.....؟ بھائی کو بھائی سے الگ کر کے.....؟ بیویوں کی حرص میں نظروں سے گرا کے.....؟ تم نے سالوں کی کوشش سے ہمیں الگ کر دیا۔ لیکن تمہاری بیٹی نے ایک ہی جھگڑے میں ہمیں تمہاری اوقات دکھادی..... آج ہم یہاں ملانی تھیں مگر ہواور تمہاری سگی بیٹی جسے تم نے پیدا کیا وہ ان کے گھر اپنی مرضی سے رہ رہی ہے۔ جن سے تم ملوث کرنی ہو، دشمن سمجھتی ہو۔ دیوار اوپنی کردی لیکن فی کے دل سے وہاں کا گھر نا نکال سکیں۔

ہو گیا شوق پورا۔ مل گئی انا کو تسکین؟، مقابلے بازی نے تمہیں نہیں کا نار کھا۔ تم نے اپنی آخری حد آزمائی مگر تمہیں شکست ہو گئی۔ جانتی ہو کیوں کیونکہ

مقابلہ سیدھی سادی و درگزر کرنے والی ثانیہ بھابی نہیں، تمہارا پر تو..... تمہارا اپنا عکس تمہاری بیٹی تھی..... جسے تم نے جنم دیا اور اس کی رگوں میں دوڑتے خون نے بتا دیا کہ وہ بھی تمہاری طرح خندی اور جیتنے کے لیے بنی ہے۔

تم ہار گئی ہو سونا بیگم! اپنی ہی بیٹی کے ہاتھوں جاؤ بیویوں کو بوجھ، دیوالیہ ہوتے اسٹور کا جشن مناؤ..... بھابی بیگم کو مل کر دو۔ کیونکہ تمہاری بیٹی ماں کی گرمی ان میں محسوس کرتی ہے تم میں نہیں۔

تم ماں ہو ہی کب تم تو رقابت و حسد کی آگ میں جلنے والی اک کٹی عورت ہو، تم نے تو کوئی رشتہ ہی نہیں نبھایا سوائے حسد و رقابت اور خود نمائی کا۔

تم اک کم طرف عورت ہو سونا بیگم جو رشتوں کو سمیٹنے کے لیے قربانی نہیں دیتی بلکہ ڈائن بن کر سب سے قربانی چاہتی ہے..... بیٹھو آرام سے..... جشن مناؤ اپنی ہار کا..... میں جا رہا ہوں اپنے بھائی اور بھابی سے معافی مانگنے..... تمہاری صحبت میں، میں نے ان کا دل دکھایا۔ وہ کاروبار میری محنت سے نہیں بلکہ بھائی صاحب کی نیک نیتی پر چل رہا تھا اور تم جیسی ناکام عورت نے مجھے بھی ناکام درسا کر دیا۔

ہمارے گھر دو بیٹیں ایک ساتھ آئی تھیں کاش کہ تمہاری فطرت بھی بھابی بیگم جیسی ہوتی تو تم یوں خالی ہاتھ نہ رہتیں..... افسوس مجھے اب تم پر ترس بھی نہیں آ رہا۔“

ہادی صاحب زمانے بھر کی بھڑاس نکال کر جا چکے تھے۔ علیہا تھاپھل سے وہیں واپس آئی تھی اور اب ہادی بھی چلے گئے۔ نکاح کے عین موقع پر اس حادثے کے باعث اوپس اور آئی نے انہیں جی بھر کے ذلیل کیا تھا لیکن انہیں کچھ سناپی نہیں دے رہا تھا۔ انہیں بس ہار ہو گئی تھی..... ضد اور مقابلے بازی میں وہ اپنی اندھی ہو گئی تھیں کہ بیٹی کے جذبات بھی قتل کرنے افسوس نہیں ہوا تھا۔ اسے موت کے منہ میں ڈھکیل دیا تھا۔ گھر سائیں سائیں کر رہا تھا اور ان کے اندر بھی دور تلک سناٹا پھیل گیا تھا۔ نظریں اوپنی دیوار پر تھیں اور ان کا دم گھٹنے لگا تھا۔

Medora
Perfumed Talc

خوشبو جو دل کو بہا دے
تازگی جو ہر کوئی چاہے



خوشبو کی دنیا کے 8 شگفتہ حسان

MEDORA OF LONDON

”آؤ سونیا.....!“ انہیں تھکتے جانچنے نے خوش دلی سے کہا تو سونیا ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیں۔
”بھابھی بیگم! معاف کر دیں گی مجھے.....“ بہت بڑے حال انداز میں سوال ہوا تھا۔ سب کو اس کا یا ملت کی امید نہیں تھی۔ تب ہی حیران ہوئی تانیہ نے آگے بڑھ کر گلے لگا لیا تھا۔

”معافی کس بات کی۔ تم چھوٹی بہنوں کی طرح ہو۔“ سالوں کے گلے شکوے غموں میں دور ہو گئے تھے۔

”یہ عید قرباں میں کبھی نہیں بھولوں گی جس میں میں نے اپنے اندر کی حاسد عورت کو قربان کیا۔ جانوروں کی قربانی تو فرض ہے۔ اپنی ذات میں بیٹے غلط عناصر کی قربانی ہی اصل قربانی ہے۔

بھابھی بیگم! اب سے میں آپ سے کوئی حسد نہیں کروں گی۔ سچنے کی کوشش کروں گی۔ آپ کی اچھی عادت اپنانے کی لگن رکھوں گی۔“

سونیا اعلا ظفر کی کا مظاہرہ کرنی اعتراف کر گئیں تو سب نہال ہو گئے۔

”حقاً مجھے کوئی شکست نہیں دے سکتا تھا۔ تم بھی نہیں اگر میری اولاد نہ ہوتیں.....“ اسے گلے لگائے سونیا سرگوشی میں اعتراف کر گئی تھیں۔
”بھائی صاحب، بھابھی بیگم! عید الاضحیٰ پر مفتی کریں ان دو بچہروں کی یا نکاح؟“ سونیا خوش دلی سے سوال کر رہی تھیں۔

”میرا خیال ہے میل اپنی آزادی قربان کرنے میں زیادہ خوشی محسوس کرے گا۔

تانیہ نے چھیڑا تو وہ مسکرا کر سر جھکا گیا۔ سب کے لپوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

سمیل غازی کی نگاہ بے ساختہ اس پر اٹھ گئی تھی اس لگی کی محبت نے بچہروں میں جو تک لگادی تھی۔ نگاہ کی تپش پر علیہا کی نظر ٹپکی۔ دو دل آسودہ ہو کر اک ہی لے پڑھنے لگے تھے۔

☆☆

☆☆☆

”اف تو بہ ہے تانی جان۔ اب میں اتنی بھی کوئی بیمار نہیں کہ سوپ، دلیہ، چھڑی کھا کھا کر منہ کا ڈانگہ خراب کرو۔“ تانیہ اسے سوپ پلا رہی تھیں اور وہ بینڈ لگی کلائی کو دیکھتے منہ بسورے دہائی دے رہی تھی۔ غازی اور میل مسکرا رہے تھے۔

”پوری کلائی ادھیڑ ڈالی اور سوپ پیتے شور کر رہی ہو۔ خون اتنا الگ بہا۔ جب تک ٹانگے کچے ہیں یہ ہی ملے گا۔“ تانیہ نے لگی پٹی رکھے بنا کہا تو وہ منہ بسور کر سوپ پیتے لگی۔ ساتھ ہی سیل فون اٹھا کر پیج ٹائپ کرتے لگی۔

”گول گپے لاکر اپنے کمرے میں چھپا کے رکھنا۔ تانی جان نا دیکھیں۔“ فرمائش کے ساتھ ہدایت فری تھی۔

”سچ بڑھ کر قریل غازی نے ہاتھ کی روک بنا کر لیوں پر رکھتے بے ساختہ اللہ آنے والی مسکراہٹ چھپائی۔

اسی اثناء میں ہادی صاحب آئے تھے اور آتے ہی جس طرح غازی کے پاؤں پڑ گئے۔ انہوں نے گھبرا کر انہیں کھڑا کر دیا۔

”چھوٹے بھائی جی جگہ دل میں ہوتی ہے۔ قدموں میں نہیں۔“ بنا کچھ جتاے خوش دلی سے گلے لگائے تو ہادی صاحب اپنی نادانی پر پھوٹ پھوٹ کے رو دیے۔ وہ بار بار سب سے معافی مانگ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے باپ کو شرمسار دیکھتی خوش تھی کہ انہوں نے غلامی کی نوخیزیں تو توڑ دیں۔

”میری کم ہمتی اور بزدلی نے سونیا کے ہاتھ مضبوط کر کے ہری بی بی کی جان پر بنادی۔“ انہیں قلیں تھا۔

”جو بہت گیا اسے دہرا کے کیا فائدہ.....“ آنے والے کل کی فکر کرو۔“ تانیہ نے مدبرانہ انداز میں کہا تو سب کی نظریں سونیا کو دیکھ کے ساکت رہ گئیں۔

”تانی جان! اگر آپ لوگوں نے مجھے دوبارہ ان کے پاس بھیجا تو میں قسم کھا رہی ہوں دوبارہ کلائی کاٹ لوں گی۔“ علیہا ہادی کو یہی لگا تھا دونوں اسے لینے آئے ہیں۔

گفت عبداللہ

پہلیں رات بیکش

حیدر علی اور احمد علی دو بہائی تھے۔ حیدر علی بوڑھے تھے، چھوٹے بھائی احمد علی کے لیے وہ مشفق باپ تھے۔ احمد علی کا انتقال ہو چکا تھا اور حیدر علی جس حد تک ممکن ہوتا بھادراج اور بچوں کی مدد کرتے ہیں۔
حیدر علی کو ان کے مزاج کے برعکس بیوی ملی تھیں۔ وہ جتنے نرم خوتھے حیدر علی کی اسی قدر تیز و طرار اور کسی حد تک بد زبان بھی۔ احمد علی کی بیوی فاخترہ ان ہی کی طرح نرم مزاج اور درگزر کرنے والی تھیں۔
حیدر علی کی تین بیٹیاں سیدہ، خیزیت اور شہرینہ تھیں جبکہ احمد علی کے دو بچے حمزہ اور بیلا تھے۔
سیدہ کی شادی ہو چکی ہے۔ خیزیت اپنے باس تیمور غزنی کو پسند کرتی ہے جبکہ خیزیت کا خال زاد بھائی اس کو چاہتا ہے۔ حمزہ اور شہرینہ کا رشتہ، حیدر علی نے حیدر علی کی مرضی کے خلاف بھائی کی زندگی ہی میں ان کی کم عمری ہی میں کر دیا تھا جو وقت کے ساتھ ان کے دلوں میں بھی مضبوط ہو چکا ہے۔
حیدر صاحب کا آفس میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو جاتا ہے۔ حمزہ کو جاب مل جاتی ہے لیکن اس کے باس حسان صاحب کی بیٹی ریکا اس کو پسند کرتی ہے جو ثقافتاً حمزہ کو اپنی باتوں سے پریشان کرتی ہے۔
تیمور غزنی اور سارہ کی کوئی اولاد نہیں ہے سارہ مس کیرج ہونے کی وجہ سے اب بھی ماں نہیں بن سکتی۔ سارہ، تیمور سے اپنی دوست زدنی کا بے بی لینے کا کہتی ہے لیکن تیمور اس بات پر دل سے رضامند نہیں ہے۔



دسویں قسط



سونا کے مشورے پر تیمور دوسری شادی کے لیے سوچنے لگتا ہے اور خیزیت اسے بالکل موزوں نظر آتی ہے۔ وہ خیزیت سے جھوٹی محبت کا اظہار کرتا ہے اور اسے سارہ کے بارے میں نہیں بتاتا اور کہتا ہے کہ فی الحال گھر کے راضی نہیں ہیں اس لیے وہ خیزیت سے چھپ کر شادی کرے گا اور بعد میں انہیں منالے گا۔ خیزیت تیمور کی محبت میں رضامند ہو جاتی ہے اور حیدر علی کی بھی اس شادی پر راضی کر لیتی ہے۔ تیمور خیزیت کو ایک الگ قلیٹ میں لے جاتا ہے۔

”چلاؤ مت۔ میں نے اپنی مرضی دان ضرور کی تھی لیکن اپنی اتنا خودداری گروی نہیں رکھی کہ تم جب جہاں چاہو مجھے ڈکیل کر لویا کروالو۔“ وہ جھمی بے قابو ہو گیا تھا۔

”حزہ..... یہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے کہ میں تمہیں ذلیل..... اومانی گاڈ! حزمہ میں نے تمہیں اپنے دل کی سب سے اونچی مسند پر بٹھایا ہے۔ اور میں چاہتی ہوں لوگ تمہیں سر اٹھا کر دیکھیں۔ اور تم میرے بارے میں ایسا گمان کر رہے ہو۔“ وہ تاسف میں گھر گئی تھی۔

”یہ صرف گمان نہیں ہے ربیکا! تم مجھے اپنے گھر لے گئیں کیا مقصد تھا تمہارا۔“

”میں تمہیں مٹا دینا چاہتی تھی۔“ ربیکا نے بتایا تو وہ فوراً بولا۔

”جبکہ وہ مجھ سے ملنا تو دور کی بات، میرا نام تک سننا پسند نہیں کرتیں۔“

”یہ تم سے کس نے کہا۔“ وہ ٹھٹھکی تھی۔

”نکسی نے نہیں۔ میں نے خود دیکھا ان کی آنکھوں میں میرے لیے کتنی نفرت کتنی حقارت تھی اور تم مجھے بھی دکھانے لے گئی تھیں۔“ وہ اسے بھی ساتھ گھسیٹ رہا تھا۔

”اف.....“ ربیکا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے اتنا بدگمان کیوں ہو گیا ہے۔

”سوری ربیکا۔ میں تحقیر، تذلیل برداشت نہیں کر سکتا۔ تم اگر میرا ساتھ چاہتی ہو تو تمہیں میرا ساتھ دینا پڑے گا۔ میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔ اندر اسٹینڈ۔“ وہ اسے باور کرا کے اٹھنا چاہتا تھا کہ وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔

”ایک منٹ حزمہ! تمہارے دل میں کچھ اور ہے تو وہ بھی کہہ دو.....“ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر سر کر رہا لگا کر گویا ہوا۔

اور یہ کہ میں جو ہوں جیسا ہوں، میری حیثیت یہ ہے کہ میں تمہارے ڈیڑکے فرم میں ملازم ہوں اور تم مجھے میری اس حیثیت کے ساتھ اپنے لوگوں میں متعارف کراؤں گی۔ کراسکتی ہو؟“ حزمہ نے اسے یوں دیکھا جیسے وہ تھلا کر اٹھ جائے گی لیکن وہ بڑے آرام سے بولی تھی۔

”کیوں نہیں۔ جب چاہو بلکہ ایسا ہے کہ آج شام میں حسن شیرانی کے ہاں ایک تقریب ہے تو وہاں ساتھ چلتے ہیں۔“

”شٹ.....“ وہ خود تھلا گیا تھا لیکن اس پر ظاہر نہیں کیا کدھے اچکا کر بولا..... ”ٹھیک ہے ایڈریس سٹاپ کرو۔ میں پہنچ جاؤں گا۔“

”میں تمہیں پک کر ملتی ہوں۔“

”نہیں، وہیں ملیں گے۔“ اوکے۔ وہ اٹھا اور مضبوط قدموں سے اسے پیچھے چھوڑ آیا۔ لیکن یہ شخص اس کا خیال تھا۔ ربیکا پیچھے رہ جانے والوں میں سے نہیں تھی۔ اس کا پہنچ قبول کر کے وہ جانے کیا کرنے والی تھی۔

حزمہ نے سوچا ضرور لیکن پھر سر جھٹک دیا تھا۔ وہ ابھی صرف ربیکا کی ماما کو تھلا تا ہوا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ جو انتہائی حقارت سے کہہ رہی تھیں۔

”آئے ہو تو بیٹھو کچھ کھاؤ۔“

”بہر حال شام ڈھلے جب آسمان پر ستارے جگمگانے لگے تھے وہ حسن شیرانی کے عالی شان بیٹنگلے طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اندر آ کر رک گیا۔ وسیع لان میں روشنیوں کا سیلاب اتر آیا تھا۔ اس نے ربیکا کی حائل میں نظریں دوڑائیں تو وہ اسے حسن شیرانی کے ساتھ کھڑی نظر آئی۔ بلاشبہ وہ ہمیشہ سے زیادہ حسین نظر آ رہی تھی کہ وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ اور جانے کب تک بہوت رہتا کہ اس کے سیل فون کی بیل نے چونکا دیا۔

اس نے جیب سے موبائل نکال کر دیکھا شہرینہ کی کال تھی۔ اس نے کال نہیں لی۔ موبائل واہیریت پر لگا کر واپس جیب میں ڈالا اور پھر دیکھا تو ربیکا وہاں موجود نہیں تھی۔

”کہاں چلی گئی۔“ وہ سوچتے ہوئے چند قدم آگے بڑھ کر پھر رک گیا۔ اب اسے جھکا لگا تھا کہ نظروں کے میں سامنے تیور غزنی ایک حینہ کی کمر میں بازو حمال کیسے سب سے بیلو ہائے کر رہا تھا۔ اگر صرف تیور غزنی ہوتا تو وہ آگے بڑھتا لیکن اب وہ اگلے قدموں دھیرے دھیرے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تیور غزنی اسے دیکھے۔

جب ہی گیٹ سے نکلے ہی وہ تقریباً بھاگتے قدموں سے بایک تک آیا اور پھر بایک بھگاتے ہوئے اس نے کھرا کر ہی جیسے سانس لیا تھا۔ لیکن ابھی تک اس کے حواس بحال نہیں ہوئے تھے۔ بیلا سے چائے کا کپہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اور گو کہ وہ اہتمام سے تیار نہیں ہوا تھا۔ روزمرہ جیسی تیاری تھی۔ پھر بھی اس نے چائے آنے تک کپڑے بدل لیے۔

”آپ تو کسی دعوت میں گئے تھے۔“ بیلا نے چائے کا کپ اسے تھماتے ہوئے کہا تو وہ بس ہوں کر کے رہ گیا۔

”کیا ہوا دعوت کینسل ہو گئی کیا؟“ بیلا کچھ اچنبھے سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم کیا تفتیش کرنے کھڑی ہو جاتی ہو۔ چلو جاؤ۔“ اس نے ڈانٹ کر بیلا کو بھگایا پھر چائے پیتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب گیا اور اب اس کی سوچوں کا محور ربیکا نہیں، تیور غزنی اور اس کی پارٹنر تھی۔ اور وہ نادان نہیں تھا۔ ان دونوں کے انداز سے ان کے بیچ تعلق کو بھی سمجھ گیا تھا۔

”تو کیا خزینہ بھی جانتی ہے یا اسے اندھیرے میں رکھا گیا ہے۔“ وہ اب اس بچ پر سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ حزمہ سے سخت ناراض تھی اور اس پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ ایک تو اتنے دن سے شکل نہیں دکھائی تھی، دوسرے ل شام سے وہ اسے فون کر رہی تھی تو نہ اس کی کال ریسوی اور نہ کسی میج کا جواب دیا۔ اگر مصروف تھا تو دوسرے وقت میج دیکھ کر جواب دے سکتا تھا۔ وہ اپنے آپ سے لڑ رہی تھی۔ سامنے آ جاتا تو پتا نہیں کیا کر ڈالتی۔ کتنی بار پاپا صیدہ بیگم سے اس کے بارے میں پوچھے لیکن ہمت نہیں ہوئی۔ غصہ اپنی جگہ، سوطر کے دسو سے بھی پریشان کر رہے تھے۔

اسی غصے اور پریشانی کی ملی جلی کیفیت میں وہ کالج آ تو گئی تھی لیکن نہ پڑھنے میں دل لگا، نہ کسی اور بات میں۔ جیسے تیسے وقت گزار کر کالج سے نکلی تو دل چاہا باز کر گھر پہنچ جائے۔ اصل میں رونا چاہتی تھی کہ وہ اپنے اٹل روم میں ہی کر سکتی تھی۔

تیز تیز چلتے ہوئے اسٹاپ پر آ کر رہی تھی کہ حزمہ نے بایک اس کے بالکل قریب لا روکی۔

”جلدی بیٹھو۔“ حزمہ نے کہا تو اسے دیکھتے ہوئے دانت پیس کر وہ پھر آگے چل پڑی۔

”وہ مجھ راستے میں غصہ کرنا اچھی بات نہیں ہے۔“ حزمہ کی بایک اس کے ساتھ رہنے لگی۔

”بات مت کرو مجھ سے۔“ وہ دھواڑی تھی۔

”نہیں کروں گا۔ پکا وعدہ تمام راستہ چپ رہوں گا۔ بیٹھو شاباش“ اس کے پچکارنے پر وہ آنسو پیتے ہوئے بیٹھی حزمہ نے بایک بھگادی۔

”مجھے سیدھا گھر لے جا کر اتارو۔“ اس کی آواز غصے سے بھری ہوئی تھی۔

”سن رہے ہو۔“ حزمہ نے اب نہیں دیا چپ رہنے کا وعدہ جو کر چکا تھا۔ اپنے کندھے پر اس کے کچے بھی

چپ چاپ برداشت کرتا رہا۔ اور جب اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں اسے لاکر بٹھایا تب اس کا رونا برداشت نہیں ہوا۔

”دیکھو..... میں پہلے ہی پریشان ہوں تم رو کر مجھے مزید پریشان مت کرو۔“ حزرہ نے کہا تو وہ آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”تمہیں کیا پریشانی ہے؟“

”ہا ہا..... تمہارا مطلب ہے مجھے کوئی پریشانی ہوئی نہیں سکتی۔“ حزرہ نے حسرت بھری آہ کھینچ کر کہا تھا۔

آنکھیں رگڑ کر استغفار نظروں سے دیکھنے لگی تو حزرہ نے گلاس اس کے سامنے کر دیا۔

”پانی پیو۔“

”نہیں پیانا۔“ روٹھا انداز تھا۔ حزرہ نے اصرار نہیں کیا خود ہی گھونٹ گھونٹ پانی پینے لگا تو وہ کچھ دیر خشکی نظروں سے اسے گھورتی رہی پھر دانت پیس کر بولی تھی۔

”بتاتے کیوں نہیں تم کیوں پریشان ہو۔“

”پہلے تم بتاؤ۔“ کہیں کیا ہوا ہے۔ اتنے آنسو بہانے کا مطلب۔“

”بس میرا دل چاہ رہا تھا۔“ وہ کہہ کر دوسرے طرف دیکھنے لگی۔ سمجھ گئی تھی کہ اس کا غصہ دور کرنے کی غرض سے حزرہ نے خواہ مخواہ اپنی پریشانی کا شوشا چھوڑا ہے۔

”اور میرا دل چاہ رہا ہے بس کہیں دور بھاگ جاؤں۔“ حزرہ نے غمگین لہجے میں کہا تو وہ ایک دم اسے دیکھنے لگی۔

”ہاں یار..... چلو کہیں بھاگ چلتے ہیں اس عہد کے ساتھ کہ پلٹ کر نہیں دیکھیں گے۔“ وہ اس کی طرف جھک کر بولا اور وہ اچھل پڑی۔

”تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔ کیسی ہلکی باتیں کر رہے ہو۔ اگر تم سمجھتے ہو تمہاری ان باتوں میں الجھ کر میں غصہ تھوک دوں گی تو بھول جاؤ۔ میں تم سے ناراض ہوں اور ناراض ہی رہوں گی۔“ سمجھے۔“

”سمجھ گیا لیکن ناراضی کی وجہ تو بتاؤ۔“ حزرہ نے معصوم شکل بنا کر استفسار کیا تو وہ بیٹھ پڑی۔

”میں بتاؤں۔ اتنے دن سے غائب ہوا اور کل میں فون کر کر تھک گئی اتنے سچ کیے کسی ایک کا جواب نہیں دیا کیوں؟“

”کیونکہ تمہارے سچ میں نے صبح دیکھے اور دیکھو بھاگا چلا آیا۔“ آفس بھی نہیں گیا تمہاری خاطر۔“ حزرہ کا جواب اسے ہضم نہیں ہوا۔

”جھوٹ مت بولو۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ رات اصل میں موبائل داہرہ ریت پر تھا۔ اس لیے مجھے پتا نہیں چلا ورنہ پتہ ہو سکتا ہے کہ تم مجھے کال کرو اور میں فوراً تمہیں کال بیک نہ کرو۔ بتاؤ ایسا ہوا ہے کبھی؟“ وہ اب نرمی سے اسے رام کر رہا تھا۔ شہرینہ نے نفی میں سر ہلایا لیکن منہ پھولا ہوا تھا۔

”پھر بھی ایم سوری۔“ حزرہ نے مزید ہاتھ جوڑ کر اسے بے بس کر دیا۔

”یہ کیا کر رہے ہو۔“

”معافی مانگ رہا ہوں موڈ ٹھیک کرو ورنہ یہیں ناک سے لکیریں کھینچنی شروع کر دوں گا۔“ حزرہ نے ٹھنڈے ٹھنڈے اسے وارن کیا تو وہ زچ ہو کر بولی۔

”میرا موڈ ٹھیک ہے۔ اب گھر چلو۔“

”چلتے ہیں کچھ کھا پی تولیں۔ بلکہ کھانا گھر جا کر کھائیں گے ابھی آنسکریم۔“ حزرہ نے کہہ کر آنسکریم آرڈر کر دی۔ پھر اسے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”خزینہ کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے جب سے گاڑی ڈرائیو کرنے لگی ہے اکثر آ جاتی ہے۔ کل بھی آئی تھی۔“ اس نے بتایا تو حزرہ کی نظروں میں کل شام کا مظہر گھوم گیا جب ہی پوچھنے لگا۔

”اور غری، وہ نہیں آئے؟“

”نہیں ان کا تمہیں پتا تو ہے، بس دن میں خزینہ کے پاس جاتے ہیں۔ پھر آفس پھر اپنے گھر.....“

”ہاں..... آں.....“ اس نے ہاں کو لمبا کھینچ کر پوچھا۔ ”خزینہ خوش ہے؟“

”بہت، کسی دن بیلا کو لے کر آؤ ناں پھر ہمیں خزینہ کے ہاں لے چلنا۔“ شہرینہ نے فوراً پروگرام سوچ لیا۔

”بیلا کو لانے کی کیا ضرورت ہے ہم دونوں چلیں گے۔“ حزرہ نے آنسکریم کا چمچ منہ میں ڈال کر کہا تو وہ فوراً

”جی نہیں اکیلے تو ای نہیں جانے دیں گی۔“

”اکیلے کیوں، میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔“

”تم تو ابھی بھی میرے ساتھ ہو اور اگر ابھی امی یہاں آ جائیں تو پہلے تم اٹھ کر بھاگو گے۔“ وہ اپنی دھن میں بولی تھی۔ حزرہ کو لمبی روکنا مشکل ہو گیا۔ آنسکریم کے مزے لینے کے ساتھ وہ منہ بھی جا رہا تھا۔

”سنو..... میں نے کوئی لطیفہ نہیں سنا یا۔“ وہ اسے کبھی نظروں سے دیکھنے لگی۔

”لطیفوں پر ہنسی کہاں آتی ہے۔“ وہ ابھی بھی محظوظ ہو رہا تھا۔

”بہر حال اب چلو اور آئندہ اتنے دلچسپ غائب مت رہنا۔ ورنہ میں.....“ شہرینہ نے شہادت کی انگلی اٹھا کر وارنک دی پھر اس سے پہلے ہی باہر نکل آئی تھی۔ دوسو سے سے نکل کر جہاں دل لگا ہوا وہاں سب اچھا اچھا لگ رہا تھا۔

☆☆☆

دوپہ کے کھانے کے بعد وہ چندرہ منٹ کی فینڈ ضرور لیتا تھا اس کے بعد فریش ہو کر دوبارہ آفس جاتا۔ اس وقت وہ ابھی سو رہا تھا کہ ”آ“ کی آواز پر چونک کر اٹھ بیٹھا۔

”خزینہ۔ خزینہ کہاں ہو؟“ اس نے گھبرا کر پکارا تو ڈریسنگ روم سے اس کی آواز آئی۔

”یہاں ہوں۔“ وہ ایک ہی جھٹ میں اس تک جا پہنچا۔

”یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”وہ چیکٹ اوپر رکھ رہی تھی۔“ خزینہ نے الماری کے اوپر اشارہ کیا تو اس کی گھبراہٹ میں غصہ بھی شامل ہو گیا۔

”تمہیں کیا ضرورت ہے یہ سب کرنے کی۔ اور یہ تم اسٹول پر مانی گاڑا اگر بلب ہو جائیں تو.....“

”اوہو غزنی! آپ تو یوں پریشان ہو رہے ہیں جیسے میں پہاڑ پر چڑھ گئی تھی۔“

”یہ تمہارے لیے پہاڑ سے کم نہیں ہے۔ چودا دھر۔“ وہ اسے تمام کر کرے میں لے آیا اور بیڈ پر بیٹھا کر پوچھنے لگا۔ ”تم کراہی گئی ناں۔“

”نہیں وہ تو بس اسٹول سے اترتے ہوئے۔“ خزینہ اسے اس قدر متوجش دیکھ کر خائف ہو گئی تھی۔

”تمہارا ڈرائیو، امی، مری جاواں۔“ لگا کر خزینہ نے چہرہ دیا۔

”ماما ننھی ابھی تک نہیں آ۔“

”ظاہر ہے۔ اگر بیٹی ہوئی تو ماں جیسی ہوگی اور اگر بیٹا ہوا تو.....“ تیمور غزنی نے ایک دم ٹپکلا ہونٹ دانتوں دابا کر ننگے کھینے حار ماتھا۔

”میرے جیسا“ اور وہ اپنی دھن میں تھی۔ پوچھنے لگی۔

”کیسا ہے وہ پل“

”مائی گاڑ سارہ پھر تم پوچھو گی اس کے دادا دادی کیسے ہیں یعنی وہ جیسے بھی ہوں، بچہ ہمارے پاس آئے اور ہمارے جیسا ہی ہو جائے گا۔ آئی سمجھ۔“ وہ اس بالوں کی لٹ بچھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور گلے سے مائی بچھ کر نکالی اور سارہ کو احساس ہوا۔

”سوری بھی۔ میں نے تم سے کھانے کا تو پوچھا ہی نہیں۔ چلو تم جلدی سے چینیج کرو میں کھانا گرم کر رہی ہوں۔“

”کیا مطلب تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا؟“ وہ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھتے رک گیا۔

”میں نے تو کھالیا ہے تمہارے لیے۔“

”نہیں میں صرف کافی پیوں گا۔۔۔۔۔۔ بلیک کافی۔“

”ابھی لائی۔“ اس نے کھانے کی جرح نہیں کی اور فوراً کمرے سے نکل آئی۔ پھر کافی بناتے ہوئے وہ دروازے کے بارے میں سوچتی رہی اور یہ کہ اس کے لیے اسے کیا کیا لینا ہوگا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں ناموں کی فہرست بننے لگی تھی۔

☆☆☆

حزہ کو اندازہ تھا کہ ربیکا اس کا کیا حشر کرنے والی ہے۔ اور شاید وہ اس کا یقین بھی نہیں کرے گی کہ وہ حشر وانی کے ہاں تقریب میں شرکت کی غرض سے گیا تھا لیکن اس سے نہیں ملے گا۔ وجہ کو کہ تیور غزنی تھا ڈیکھتے ہی وہ واپس پلٹ آیا تھا۔ لیکن ربیکا کو وہ یہ وجہ نہیں بتا سکتا تھا کیونکہ تیور غزنی سے اس کا ایسا رشتہ بن چکا کہ اب وہ کسی مقام پر اسے خود سے نظریں چراتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ اور بہت کچھ سوچ کر آفس آیا تھا۔ اور اس کی توقع کے عین مطابق کچھ دیر بعد ہی ربیکا غصے میں بھری اس کے روم میں داخل ہوئی تو اس کے سامنے سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔

”دیکھو۔ پہلے میری بات سن لو۔“

”کیا سناؤ گئے تم یہی کہ سوری میں آتا چاہتا تھا لیکن میری بائیک خراب ہو گئی یا پھر۔“

”یا پھر یہ کہ میں آیا تھا۔ واقعی آیا تھا۔“ وہ فوراً بولا تھا۔

”جھوٹ۔“

”کس کس بات کو جھوٹا کی۔“ وہ جیسے چیلنج کر رہا تھا۔

”مطلب۔۔۔۔۔۔“

مطلب یہ کہ تم نے بلیک ٹراؤڈرز پنک شرٹ پہن رکھی تھی جو تمہارے رنگت سے میچ کر رہی تھی اور تمہارا دائیں کاٹائی میں فقط ایک لیکن تھا یا چوڑی جواتی دور سے میں سمجھ نہیں پایا البتہ کمر بلیک تھا اور تمہارے کانوں میں جو ناپس تھے وہ بھی بلیک تھے بس یا مزید بیان کروں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا تو وہ چپا کر بولی۔

”آئے تو مجھ سے ملے۔ اس نہیں؟“

تمہارے پاس ہی آ رہا تھا کہ گھر سے فون آ گیا اماں کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ بس پھر پھر پریشانی میں وہیں سے واپس پلٹ گیا۔ جس کا خود مجھے افسوس ہے۔ ورنہ میں بہت خوش تھا کہ تم نے میری

مان لی۔“ وہ بولے چلا جا رہا تھا کہ ربیکا نے ٹوک دیا۔

”اچھا بس۔ اب مجھے اپنے گھر کوئی فنکشن کرنا پڑے گا۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ وہ کہہ کر ایک دم خاموش ہو گیا۔ ربیکا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر پوچھنے لگی۔

”کیا سوچنے لگے؟“

”ہم وہ اسے دیکھ کر کہنے لگا۔ سوچ رہا ہوں یہ سب تو تمہارے پرنس کو کرنا چاہیے۔ اگر وہ مجھے قبول کرتے ہیں تو۔“

”سنو، شادی مجھے کرنی ہے اپنی پسند اپنی مرضی سے اور میرے پرنس کو اگر میری پسند سے اختلاف ہو ابھی تو انہیں اعتراض کا کوئی حق نہیں۔ اس کی ہٹ دھرمی پر وہ جیسے کوئین کی گولی نکل کر بولا تھا۔

”تو چلو پھر ابھی کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔“

”تم۔۔۔۔۔۔ تم بہت شارپ ہو جزہ، میری کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔“ وہ تنفر سے بولی تھی۔

”یہی تو نہیں کر رہا۔ خیر چھوڑ دو۔“ وہ سر جھٹک کر اپنے آپ میں عجیب سا محسوس کرنے لگا تو۔ ربیکا اس کی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھی۔ اچانک غالباً اسے آزمانے کی غرض سے کہنے لگی۔

”پتا ہے جزہ میں نے اپنی فرینڈز سے کہا تھا کہ آج میں انہیں ایک خاص بندے سے ملواؤں گی۔ اور وہ سب تو جانے کب سے اس انتظار میں تھیں۔ اتنے شوق سے تمہارا انتظار کرنے لگیں کہ کیا بتاؤں۔۔۔۔۔۔ بار بار پوچھتیں کب آئے گا خاص بندہ۔ میں نے کہا جب بھی آئے گا تم لوگ اسے دیکھتے ہی پہچان جاؤ گی۔“ جزہ صرف نظریں اٹھا کر اسے دیکھنے جا رہا تھا۔ اور وہ اپنے آپ محظوظ ہوتے ہوئے مزید گویا ہوئی۔

”پھر پتا ہے کیا ہوا۔ جب میں حسن شیر وانی سے بات کر رہی تھی تو میری تمام فرینڈز نے دھوا بول دیا اور حسن شیر وانی کو مبارک باد دینے لگیں۔ اب پتا نہیں وہ بے چارہ کیا سمجھا میں بہر حال وہاں سے بھاگ گئی تھی۔“ وہ ہنس رہی تھی۔

”پھر تم نے اپنی فرینڈز کی غلط فہمی دور نہیں کی؟“ جزہ نے قدرے رک کر پوچھا تو وہ اسی محظوظ انداز میں بولی۔

”نہیں۔۔۔۔۔۔ میں انہیں سر براؤز دوں گی۔“

”ہوں۔۔۔۔۔۔“ جزہ ذرا سا مسکرایا پھر اچانک خیال آنے پر کہنے لگا۔

”میں نے شاید وہاں غزنی انٹر براؤز کے اوپر کو بھی دیکھا تھا کیا نام ہے بھلا ان کا؟“

”تیور۔۔۔۔۔۔ تیور غزنی، ہاں وہ بھی تھے اپنی مسز کے ساتھ۔ ٹاس پل ہے ناں۔“ ربیکا نے بتا کر اس کی تائید چاہی تو وہ ذرا سا سر ہلا کر دیکھا جبکہ اس کا ذہن پھر منتشر ہو گیا تھا۔

”اچھا سنو۔۔۔۔۔۔ شام میں آؤ شک پر چلو گئے۔“

”سوری۔ آج نہیں۔ پھر کسی دن، اب پلینز مجھے کام کرنے دو۔“ جزہ نے معذرت کے ساتھ کہا۔ تو وہ مسکرا کر اکر کے کہتے ہوئے اٹھ کر چلی گئی۔

جزہ نے اپنے سامنے رکھی فائل کھول لی لیکن اس کا ذہن بار بار بھٹک رہا تھا۔ کبھی تیور غزنی اور اس کی مسز پھر خزیہ کو سوچنے لگتا کہ اگر خزیہ نے اپنے خوشی سے تیور غزنی کی دوسری بیوی بننا منظور کیا تھا تب تو کوئی بات نہیں مگر دوسری صورت میں یہ سراسر اس کے ساتھ دھوکا تھا۔ اور وہ خزیہ کے ساتھ دھوکا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

خزینہ نے نجمہ خالہ سے اون سلاٹیاں منگوئی تھیں اور اب ان ہی سے سوکڑ بننا سکھ رہی تھی۔ گوکہ بچے کے لیے کتنے اونٹنی سوٹ خرید چکی تھی۔ لیکن پھر بھی اسے شوق چرایا تھا اور یہ چھوٹے چھوٹے کام اسے انوکھی خوشی سے ہنساتے کرتے تھے۔

”بازاری چیزیں دیکھنے میں تو اچھی ہوتی ہیں پر پائندہ نہیں ہوتیں۔ پہلی دھلائی میں ہی ستیاناس ہو جاتا ہے۔“ نجمہ خالہ سلاٹیاں میں پھنڈے ڈالتے ہوئے بول رہی تھیں۔ ”بیری بہو بڑے شوق سے بازاری چیزیں اٹھا لیتی ہے۔ پھر بیٹھی دکھاروں کو کوئی ہے۔ پیدا لگ برباد۔“

”تو خالہ آپ نے اسے نہیں سکھایا۔“ اس نے خالہ کے چلتے ہاتھوں پر دھیان رکھ کر یونہی پوچھ لیا۔

”لو میں تو بہت کبھی رہی پر وہ سنتی نہیں۔ یوں بھی بیٹا ساری بات شوق کی ہوتی ہے۔ اب دیکھو ہمیں تو کوئی کی نہیں لیکن شوق ہے اور تم جلدی دیکھ لوگی۔“

”جی! وہ خوش ہوگی۔“ لایے اب میں بناتی ہوں۔“

”ہاں لو۔ کوئی پھنڈا گرانامست۔“ نجمہ خالہ نے سلاٹیاں اسے پکڑائیں پھر اس کے ہاتھ پکڑ کر بتانے لگیں تو ایک سلاٹیاں میں ہی وہ پھنڈی۔

”اب میں بن لوں گی خالہ۔ آپ دیکھتی جائیں۔“

”پریشی لکھی ہوتاں جب ہی جلدی سمجھ گئیں۔“ نجمہ خالہ نے کہا تو وہ ہنس پڑی۔

”تمہیں خالہ دیہاتی لڑکیاں جو پریشی لکھی نہیں ہوتیں ان کی بنائی سلاٹیاں، کڑھائی کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

”ہاں وہ تو بچپن سے یہی کام کرتی ہیں۔ پر بے چاروں کو اتنی اجرت نہیں ملتی۔ سارا منافع تو یہ شہری لوگ لے جاتے ہیں۔“ نجمہ خالہ ابھی مزید کچھ کہتیں کڑھائی کے بیچنے سے وہ ہاتھ روک کر انہیں دیکھنے لگی۔

”کون آیا ہے۔“ نجمہ خالہ اٹھ کر دروازے پر گئیں تو حمزہ کی آواز سن کر اس نے جلدی سے اون سلاٹیاں

شارپ میں رکھ کر دوپٹا پھیلا کر اوڑھ لیا۔

”السلام علیکم..... حمزہ سے پہلے شہرینہ اور بیلا آگے آئی تھیں۔“

”وعلیکم السلام..... وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں سے گلے کر حمزہ کو دیکھا تو وہ کہنے لگا۔

”بڑے دنوں سے شہرینہ کہہ رہی تھی تمہارے ہاں لے چلوں آج آفس سے جلدی آ گیا تو آنے کا پروگرام بن گیا۔“

”اچھا کیا..... بیٹھو امی اور چچی جان کو بھی لے آتے۔“ اس نے کہا تو شہرینہ بول پڑی۔

”ہاں وہ تو جیسے آ جاتیں۔ ہمیں اتنی مشکل سے اجازت ملی ہے۔“

”کیوں؟“ وہ شہرینہ کو دیکھنے لگی۔

”بس امی کہتی ہیں خزینہ آ تو جاتی ہے پھر تمہیں کیا ضرورت ہے جانے کی۔“

”یا اللہ لڑکیوں کو موقع ملنا چاہیے شکایات کا۔“ حمزہ گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

”میں شکایت نہیں کر رہی جو امی نے کہا وہی بتا رہی ہوں اور تمہارے سامنے ہی تو امی نے کہا تھا۔“

”اچھا بس اب تم دونوں لڑنا مت شروع کر دو۔“ خزینہ نے دونوں کوٹھکا پھر بیلا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ

بھاگتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”تم کیسی ہو بیلا اور چچی جان؟“

”ٹھیک ہو امی! راستہ یاد کرتی ہیں آ۔ کو..... بیلا اس جھکے دیکتے گھر میں پہلی بار آئی تھی۔ اس لیے کچھ

ریکا آفس سے لوٹی تو آگے حسن شیردانی اپنے بیزنس کے ساتھ موجود تھا جیسے دیکھتے ہی اس کی نظروں میں اپنی سہیلیوں کا اس پر جھاد بولنے کا منظر محسوس کیا تو بے ساختہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر آگئی۔ اس کے ساتھ وہ گھڑے کھڑے اس سہیلی کے ساتھ پہلو ہانے کر کے اپنے کمرے میں آگئی۔

پہلے میسرول کو سینڈل کی قید سے آزاد کیا پھر واش روم کی طرف بڑھ رہی تھی کہ ٹھرہ کو آتے دیکھ کر رک گئی۔

”رائی جلدی سے فریش ہو کر آ جاؤ۔ حسن ہماری باتوں سے بور ہو گیا ہے۔“ ٹھرہ نے آتے ہی کہا تو وہ کچھنا

سجھی سے دیکھنے لگی تھی۔

”بیٹا تمہارے ڈیڈی پر پانچ کب آئیں گے۔ جب تک تم حسن کو کہنی دے سکتی ہو۔“

”آپ چلیں میں آتی ہوں۔“ وہ کہہ کر واش روم میں بند ہو گئی اور تقریباً دس منٹ بعد وہ حسن شیرازی کو

وہاں سے اٹھا کر اس کے ساتھ لان میں آگئی تھی۔

موسم پچھلے کی دنوں سے خوش گوار چل رہا تھا اور ابھی تو بادل بھی اٹھا کر آ رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بارش جم کے برے گی۔ ہوا میں ہلکی سی محسوس ہو رہی تھی۔

”آپ نے کیا خود کو آفس کے لیے ہی وقف کر دیا ہے؟“ حسن شیردانی نے اس کے ساتھ ٹھلٹے ہوئے

پوچھا۔

”نی الحال تو ایسا ہی ہے۔“ ریکا نے ذرا سے کندھے اچکائے تھے۔

”اور آئندہ..... آئندہ کا کیا پروگرام ہے۔ آئی مین شادی؟“ حسن شیردانی نے لمبی تمہید نہیں باندھی تھی۔

وہ آیا ہی اسی مقصد سے تھا۔

”شادی ابھی ہو جائے گی۔“ وہ ہنوز بے نیاز تھی۔

”ہو جائے گی.....؟“ حسن شیردانی رک کر اسے دیکھنے لگا۔

”یعنی جب اللہ کو منظور ہوگا۔“ اس کی وضاحت پر حسن شیردانی مطمئن نہیں ہوا۔

”آپ کی بات ٹھیک ہے ہر کام اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے لیکن ہم اپنے طور پر بھی تو کچھ سوچتے ہیں اور میں

بہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے کیا سوچا ہے؟“

”کچھ نہیں ابھی تک تو میں نے کچھ نہیں سوچا۔“ وہ کندھے اچکاتی حسن شیردانی کے دل میں اتر رہی تھی۔

”تو اب سوچ لیں۔ اسپتالی میرے بارے میں۔“ میں آپ کو پوچھ کر رہا ہوں..... دل سے۔“ حسن

شیردانی نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ بولنے لگی قدرے نرم ہو کر دوسری سمت دیکھنے لگی۔ سوچیں گی ناں؟ محبت بھرا اصرار تھا۔

ریکا نے بے دھیانی میں پھر اس پر نظر پڑھا۔ عارضہ بن گئیں اور ہلک گیا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ

حسن شیردانی اس کی بے دھیانی نوٹس کرتا حسان صاحب کی گاڑی کے باروں سے دونوں چوہک کر ادھر متوجہ ہو گئے۔

”ڈیڈی آ گئے۔ آئیے اندر چلیں۔“ ریکا نے کہنے کے ساتھ قدم بڑھا دیے تو حسن شیردانی نے پہلے

آسمان پر نظر ڈالی پھر اس کی تقلید کی تھی۔

اندرا کر وہ رک کی نہیں سیدھی اسے کمرے میں آگئی اور بیڈ پر اوندھے منہ گرتے ہوئے بو بولی تھی۔

”حسن شیردانی تو سیریس ہی ہو گیا۔“ اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اسے سوختے لگی تھی۔ سر جھٹکتی لیکن پھر

سوچ کا سراں وہاں سے جڑ جاتا اور پھر غیر ارادی طور پر وہ اس کا سوا نہ حمزہ سے کرنے لگی تھی۔

سراسیمہ سی تھی۔
”میں آؤں گی کسی دن۔ میرا بھی بہت دل چاہتا ہے۔ چچی جان سے ملنے کو۔“

”پورے دن کے لیے آئیے گا۔“

”اچھی بات ہے۔“ اس نے بیلا کے گال پر پیار سے چٹکی کاٹی پھر حمزہ کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”ہاں بھئی کیا موڈ ہے۔ شہنشاہ گرم۔“

”میں صرف چائے پیوں گا اور ان دونوں کے لیے کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔“ حمزہ نے کہتے ہوئے شرارت سے شہرینہ کو دیکھا تو وہ اسے منہ چڑا کر بولی۔

”جی نہیں کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ آؤ بیلا تمہیں گھر دکھادیں۔“ بیلا نے حمزہ کو دیکھا اور اس کے اشارے پر شہرینہ کے ساتھ اٹھ گئی۔

”اور سناؤ..... غزنی کیسے ہیں۔“ حمزہ نے آرام دہ انداز اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔

”ٹھیک ہیں۔ تم لوگوں کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی گئے ہیں۔ بلکہ میں نے زبردستی بھیجا تھا۔“ وہ ہنسی تھی۔

”کیوں.....؟“

”بس جتنی دیر رہتے ہیں سر پر سوار رہتے ہیں۔ یہ نہ کرو وہ نہ کرو، ایسے مت اٹھو، ایسے مت چلو میں تنگ آ جاتی ہوں۔“

”ارے، تمہیں تو خوش ہونا چاہیے، اتنا خیال کرتے ہیں تمہارا..... کوئی اور ہوتی تو خود پر رشک کرتی۔“ حمزہ نے قصداً کوئی اور کدھر اس کے تاثرات دیکھنے چاہے تھے۔

”رشک تو میں بھی خود پر کرتی ہوں حمزہ۔ بس کسی کسی وقت طبیعت اکتا جاتی ہے۔ خیر تم سناؤ جاب کسی جا رہی ہے تمہاری۔“

”غزینہ ناراض بات کر رہی تھی۔ حمزہ نے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا اور یونہی ادھر ادھر کی باتوں کے دوران چائے پی پھر بیلا کو پکار کر گلے کا کہا تو غزینہ ناراض ہونے لگی۔

”یہ کیا بات ہوئی۔ کیا صرف چائے پینے آئے تھے۔ آرام سے بیٹھو رات کا کھانا کھا کر جانا اور شہرینہ تم رک جاؤ تا میرے پاس۔“ اس نے اچانک شہرینہ کو مخاطب کر کے رکھنے کا کہا تو وہ فوراً بولی۔

”نہیں بھئی ای ای کی ہوں گی۔“

”ہاں تو امی کو ابھی سے اکیلے رہنے کی پریکٹس کر لینی چاہیے۔ میں بات کرتی ہوں امی سے۔“ غزینہ نے اس کی ایک نہیں سنی اور سیل فون کی تلاش میں نظریں دوڑاتے ہوئے اٹھ کر بیڈروم میں آ گئی۔ سیل فون وہیں موجود تھا۔ اس نے حمیدہ بیگم کو کال ملائی اور ریسور ہونے پر پہلے ان کا حال احوال پوچھا پھر کہنے لگی۔

”امی اگر آپ کو برا اہم نہ ہو تو شہرینہ میرے پاس رہ جائے۔ نہیں میں اپنی وجہ سے کہہ رہی ہوں طبیعت کچھ بوجھل سی ہے۔ جی..... پھر میں دو تین دن میں خود اسے چھوڑ جاؤں گی۔“

”چلیں یہ ٹھیک ہے آپ دو دن عالیہ خالہ کے پاس رہ آئیں ان کی شکایت بھی دور ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے امی پھر میں شہرینہ کے ساتھ آؤں گی۔ اللہ حافظ۔ وہ فون رکھ کر واپس آئی تو شہرینہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔

”امی نے اجازت دے دی ہے۔“

”لیکن.....“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ امی دو دن کے لیے عالیہ خالہ کے ہاں جا رہی ہیں اور اب تم لوگ آرام سے بیٹھو کھانا کھا کر جانا۔“ دوسری بات اس نے حمزہ کو دیکھ کر کہی تھی۔

☆☆☆

کھانے کے بعد حمزہ بیلا کو لے کر چلا گیا تو غزینہ کچھ دیر شہرینہ کے ساتھ ٹیس پر بیٹھتی رہی۔ ڈاکٹری ہدایات کے مطابق اس کے لیے اب داک بہت ضروری تھی۔

”غزنی امی سچ میں عالیہ خالہ کے ہاتھ جائیں گی۔“ شہرینہ نے اچانک خیال آنے پر پوچھا۔

”ہاں بتا رہی تھیں عالیہ خالہ نے شرنیل کے لیے کوئی لڑکی دیکھی ہے اور وہ امی کو بھی دکھانا چاہ رہی ہیں۔“ غزینہ نے بتایا تو شہرینہ اچھل پڑی۔

”کیا شرنیل بھائی شادی کے لیے مان گئے۔“

”کیوں اس نے کیا شادی نہ کرنے کی قسم کھائی تھی۔“ وہ رک کر شہرینہ کو دیکھنے لگی۔

”نہیں قسم تو نہیں کھائی تھی۔ لیکن مجھے لگتا تھا کہ وہ کم از کم دس سال تو ضرور تمہاری بے وفائی کا غم مناتے رہیں گے۔“ شہرینہ سنجیدہ نہیں تھی جب ہی وہ بھی ہنس کر بولی تھی۔

”شٹ اپ میں نے اسے کوئی آس نہیں دلائی تھی۔“

”لیکن غزنی، وہ تو تمہیں پسند کرتے تھے ناں اور بتا ہے جب سے تمہاری شادی ہوئی ہے وہ ہمارے گھر کا راستہ ہی بھول گئے ہیں اس کا مطلب ہے وہ صرف تمہارے لیے آتے تھے۔“ اس نے شہرینہ کی بات میسران سنی کر دی۔ پھر بھی وہ بولنے لگی۔

”ویسے غزنی تم نے اچھا فیصلہ کیا تھا۔ گو کہ اس وقت مجھے افسوس ہوتا تھا کہ تم شرنیل بھائی کی محبت کو سمجھ نہیں رہیں۔ لیکن اب دیکھتی ہوں غزنی بھائی تمہیں ان سے زیادہ چاہتے ہیں۔ پھر جو آسائشات تمہیں یہاں میسر ہیں وہ شرنیل بھائی تو نہیں دے سکتے تھے۔ ہیں ناں.....“ آخر میں اس کی تائید چاہی تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولی تھی۔

”یہ سب نصیب کی باتیں ہیں۔“

”ہاں تمہارے جیسا نصیب اللہ سب کا بنائے۔“

”اچھا اندر چلو میں تمک گئی ہوں۔“ اس نے کہنے کے ساتھ ہی قدم اندر کی طرف بڑھا دیے۔

”تمہارا کیا اب سونے کا پروگرام ہے؟“ بیڈروم میں آتے ہی شہرینہ نے پوچھا۔

”تم کیا جانتی ہو؟“ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

”مجھے تو ابھی نیند نہیں آرہی لیکن میں تمہیں ڈسٹرب بھی نہیں کرنا چاہتی۔“

”تو ایسا کر دلاؤں میں چلی جاؤ۔ ٹی دی دیکھو یا حمزہ کے ساتھ چینگنگ کرو۔“ اس نے بڑے آرام سے کہہ کر اسے ان کر دیا۔

”دونوں کام کروں گی۔“ شہرینہ ہنستے ہوئے بیڈروم سے نکل گئی تو اس نے لائٹ آف کر دی۔ پھر اسے سونے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ ان دنوں وہ بے خبری کی نیند سوتی تھی۔ جب ہی پتا ہی نہیں چلا شہرینہ کب اس کے پاس آ کر سوتی تھی۔

صبح معمول کے مطابق وہ اٹھ گئی۔ اس وقت شہرینہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر اسے نہیں اٹھایا اور فریش ہو کر کمرے سے نکل آئی۔ نیمہ خالہ روزانہ کی طرح کچن کو مزید چمکانے میں لگی تھیں۔ اسے دیکھا تو جلدی سے ناشتا بنا کر میز پر لا رکھا۔ اور اس کے بیٹھے پر پوچھنے لگیں۔

”تمہارا ڈاکٹر ناشتا بنا کر لے کر ہے۔“

”ابھی تو سو رہی ہے خالہ۔ میں نے اٹھایا نہیں۔ پانچ رات کب سوئی تھی۔“ وہ سلاکس پر جام اچھٹائی گئی۔
 ”ہاں رات بہت دیر تک جاگتی رہی تھی اور پتا اب یہ تم سو کے تھو کھانا چھوڑو، پراٹھا نہیں۔“ تو کم از کم کھن
 ہی لگا لیا کرد۔ اس وقت کا کھانا کیا کام آتا ہے۔“ نجمہ خالہ حسب عادت پھر دینے سے باز نہیں آئیں۔
 ”اچھا کھل سے میرے لیے پراٹھا بنا دیجیے گا۔“ اس نے مزید پھر سے بچنے کی خاطر کہا تھا۔
 ”اچھی بنا دیتی ہوں۔“

”نہیں کل سے۔ اس نے جلدی سے چائے کا کپ اٹھالیا تو نجمہ خالہ بڑبڑاتے ہوئے پھر اپنے کام سے لگ
 گئیں۔

ناشنے کے بعد وہ پھر اون سلائیاں لے کر بیٹھی تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ بارہ بجے شہرینہ انہی تھی اور
 صرف چائے کا کپ لیے اس کے پاس آ کر بیٹھی تھی کہ تیسور غزنی آ گیا۔
 ”ارے آج آپ جلدی آ گئے۔“ خزینہ کے منہ سے بلا ارادہ ہی نکلا تھا۔
 ”آپ کہیں تو واپس چلا جاتا ہوں۔“ تیسور غزنی نے آگے بڑھتا قدم روک لیا۔
 ”نہیں آپ ہی آ گئے ہیں تو قشریف رہیں۔“
 ”شکر یہ۔۔۔۔۔“ وہ بیٹھا تب شہرینہ کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے فوراً سلام کیا۔
 ”السلام علیکم۔۔۔۔۔“

”علیکم السلام کسی ہو۔ کب آئیں۔۔۔۔۔“
 ”کل شام میں آئی تھی میں نے روک لیا۔“ شہرینہ سے پہلے خزینہ بول پڑی تو تیسور غزنی سانس کھینچ کر کہنے لگا۔
 ”سوری بیگم صاحب! میں آپ سے اجازت لینا بھول گیا تھا کہ مجھے براہ راست سالی صاحبہ سے بات کرنی
 چاہیے یا نہیں۔“

”بس سالی صاحبہ کے سامنے پوز مارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آپ کو اچھی طرح جانتی ہے۔“ خزینہ نے ہنس
 کر کہا تو وہ منصوبہ سی شکل بنا کر شہرینہ کو دیکھنے لگا۔
 ”واقعی۔۔۔۔۔“

”جی میں جانتی ہوں آپ بہت اچھے ہیں۔“ شہرینہ جھینپی ہنسی کے ساتھ بولی تھی۔
 ”بہت اضافی لفظ ہے صرف اچھے کہہ سکتی ہوں۔“ خزینہ نے کہا تو تیسور غزنی کا بے ساختہ قہقہہ سارے میں گونج گیا۔
 پھر جتنی دیر تیسور غزنی رہا بلی بلی کی نوک جھوک جاری رہی۔ اس کے جانے کے بعد خزینہ کچھ دوسرے کی غرض
 سے لیٹتی تھی کہ شہرینہ اس کے سر ہانے آ بیٹھی اور اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہنے لگی۔
 ”غزنی میں حمزہ کے ساتھ چلی جاؤں؟“

”نہیں آج کیسے جاسکتی ہو۔ ای عالیہ خالہ کے ہاں ہیں۔“ خزینہ نے اپنی بھجھ کے حساب سے کہا تو وہ جھلا کر بولی۔
 ”میں گھر جانے کی بات نہیں کر رہی۔“
 ”پھر۔۔۔۔۔؟“ خزینہ آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگی۔ تو وہ خفیف مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔
 ”ایسے ہی گھومنے پھرنے۔“

”کوئی ضرورت نہیں یہاں تم میری ذمہ داری ہو۔“ خزینہ نے کہا تو شہرینہ اچھل کر اس کے سامنے ہو بیٹھی۔
 ”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“

”مطلب اگر حمزہ تمہیں لے کر کہیں بھاگ گیا تو میں امی کو کیا جواب دوں گی۔“ خزینہ اپنی بات پر خود ہی ہنس
 دی۔ شہرینہ دانت پیستے ہوئے بولی۔

”غزنی کی بچی، پاگل ہو گئی ہو کیا۔“

”اچھا لطیفہ تھا۔“

”سوری تم تو برا مان گئیں۔“ خیر یہ بتاؤ کہاں جانے کا پروگرام بنایا ہے تم دونوں نے۔“ خزینہ نے بمشکل سنجیدہ ہو کر پوچھا۔
 ”کہیں نہیں۔“ وہ ہنوز روکھی ہوئی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے پھر میں سو رہی ہوں۔ حمزہ سے کہنا زیادہ دیر نہیں بس کھٹے دو کھٹے میں واپس آ جانا۔“ خزینہ نے
 کہہ کر کمرٹ بدل لی تو وہ اس کے کندھے پر گھونسا مار کر کھٹی تھی۔

☆☆☆

جانی گرمیوں کی خوش گوار سی شام تھی۔ گوکہ حمزہ اکثر اسے کالج سے پک کرتا تھا لیکن یوں باقاعدہ پروگرام کے
 تحت وہ کبھی باران کی اس کے ساتھ نکلتی تھی۔ سلونی شام میں اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بادلوں کے سنگ اڑتی جا رہی
 ہو۔ حمزہ بھی تو سستی میں بانیگ بھگتا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ گنگنا بھی رہا تھا۔ پھر اچانک غالب خیال آنے پر پوچھنے لگا۔
 ”کہاں چلیں؟“

”کہیں نہیں اور ہر جگہ۔“

”مطلب۔۔۔۔۔؟“

”مطلب سارا شہر گھما دو۔“

”اتنا پٹرول نہیں ہے بانیگ میں۔“

”ڈالوا لیتا۔“ میسے میں دے دوں گی۔“

”پھر تو بیٹکی فلی کرالوں گا۔“ وہ پٹرول پمپ کی تلاش میں نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھنے لگا۔
 ”کچھ کھاؤ گی۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔“

”کچھ پیو گی۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔“

”دربارے کے کنارے بیٹھو گی؟“

”نہیں اور شیر آئے گا تو ڈروں گی بھی نہیں۔“ وہ اس کے کان کے پاس چپچی تھی۔
 ”اف۔۔۔۔۔“ وہ کان کھجا کر بولا۔ ”ایسا لگ رہا ہے جیسے چڑیا گھر سے نکل کر بھاگی ہو۔“

”کچھ بھی کہہ لو میں اس وقت تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانوں گی۔“ وہ بہت مزے میں تھی۔
 ”کی بات۔۔۔۔۔؟“

”کی۔۔۔۔۔“

”تو پھر سنو، میں تمہیں ایسی جگہ لے جا رہا ہوں جہاں سے واپسی کا راستہ مجھے بھی معلوم نہیں۔“ حمزہ نے اپنے
 تئیں اسے ڈر لایا تھا، لیکن وہ لا پر والی سے بولی۔
 ”کوئی مسئلہ نہیں۔“

”تو پھر تیار ہو جاؤ سامنے سے ٹرالر آ رہا ہے۔ جو ہمیں سیدھا اوپر پہنچا دے گا۔“ حمزہ نے کہہ کر اتنی زور سے اللہ
 اکبر کا نعرہ لگا یا کہ اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

☆☆☆

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

سچ کہنا

وہ بابا سائیں کے ساتھ ان کا سفری سامان اٹھائے بانٹتا ہوا دروازے سے اندر داخل ہوا تو سامنے ہی حطیم اور ارجمان منتظر کھڑے ملے۔ ان کو دیکھ کر جھٹ سے قریب آئے اور باری باری بابا سے بغل گیر ہوئے۔

”ارے بابا! سامان اٹھاؤ۔ مجھ سے کیا لیٹ رہے ہو۔“ بابا نے حطیم کی پیٹھ پر دھپ ماری تو وہ ہلپلا اٹھا۔ ارجمان نے فوراً آگے بڑھ کر حطیم کے ہاتھوں سے بابا کا سفری بیگ لیا۔

”بھئی۔“ حطیم نے کندھے سے ٹٹکا ایک اور بیگ حطیم کو تھمایا۔

”نادر کہاں ہے؟“ بابا کو ملازم کا دھیان آیا۔

”جی وہ سبزی لینے گیا ہے۔“ ارجمان نے بتایا۔

”بڑا اثر ڈال (چھپورا) چھپورا ہے۔ اسے سننا ل کر پیسے دیا کرو۔“ انہوں نے کہا تو عینوں نے مشتق ہو کر سر ہلایا۔

”جی چھپورا اور چھو بڑ بھی۔ بہت ہی برا کھانا پکاتا ہے۔“ حطیم نے گنگے ہاتھوں گنوا یا۔

”تم لوگوں کو ایسا ہی ملازم مل سکتا ہے۔“ بابا نے لاؤنج کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”بھئی میں ارجمان کا فرض نمٹانے یہاں آیا ہوں۔ ندری سے لگ گیا ہے شادی کر لے گا تو تم دونوں بھی سہولت ہو جائے گی۔ بھابھی کے ہاتھ کا پتا کھانا۔“ وہ اطمینان سے بولے تو دونوں نے بے ساختہ ارجمان کو

دیکھا۔ جو کان کی لو کھانے لگا۔

”کوئی اچھا سا کنگ رکھ لیں گے۔“ پھر پست سی آواز میں بولا تو بابا چونک گئے۔

”کیوں بابا۔ باورچی کیوں رکھو گے گھر میں عورت کے ہوتے ہوئے۔“ ان کی آواز سخت تھی ارجمان خاموش ہو گیا۔ ”اچھی بیوی اپنے گھر کو کندھوں پر اٹھا لیتی ہے۔“ بابا اپنی شلوار جھاڑ کر کہنے لگے۔

”کندھوں پر پورا گھر۔“ حطیم نے جھٹ کو بغور دیکھا اور صنف نازک کے کندھوں کا تصور کیا۔

”مخاورا ہے پنگے۔“ حطیم نے شہو کا دیا۔

”لیس بابا صحن نہیں۔“ ارجمان بچن سے مجرا جگ اوپر گلاس لے آیا۔

”نہیں بھی کوئی پینے کی چیز ہے۔“ بابا نے ایک گلاس لی کر واپس کر دیا۔

”کوئی ٹھنڈی لسی بناتے۔ بابا۔“

”جوسر کی بنی لسی آپ کو پسند نہیں۔ ہم کیا کریں۔“ ارجمان نے کندھے اچکائے۔

”بس بابا! میرا خیال تو تمہاری ماں رکھتی تھی۔ تم بچے تو اپنے مزاج کے ہو۔ خیر حطیم بیٹا! میرے چری ٹیک سے میرا حق تو کال کر دینا۔“ وہ صوفے پر پیر پھیلا کر لیٹ گئے۔

”بابا! اندر چل کر آرام کریں۔“ حطیم نے کہا تو انہوں نے ٹٹی میں سر ہلایا۔

”وڑ بے جتنا تو فلیٹ ہے تمہارا۔ اندر کمروں میں دم گھٹتا ہے۔ میرا ستر رات کو نہیں لگا دینا۔“ وہ اطمینان سے بولے تو حطیم گھبرا گیا۔

”نن..... نہیں بابا! اندر سوئے گا۔ ادھر تو اسے سی بھی نہیں۔ اندر لگا ہے۔“

”اوہ چھوڑو، اس مصنوعی ٹھنڈ کو۔ ہم کیا جانیں کھلے صحن میں سونے والے۔“ بابا نے ہاتھ جھٹکا۔ حطیم ان کا حق لایا۔ پھرتی سے اس کو سیٹ کیا اور چلم تازہ کر لی۔

”حطیم! کھڑکی کھولو کچھ ہوا تو آئے۔“ بابا نے

حقے کی منہ میں ڈال کر کہا تو حطیم نے ناچار کھڑکی کھولی۔ چھوٹے سے لاؤنج میں بابا کے حقے کی گز گز اٹھ اور ان کے منہ سے نکلا دھواں فضا میں رقص کرنے لگا۔ حطیم نے کچھ پریشان ہو کر کھڑکی کو دیکھا۔

”حطیم کھڑکی پوری کھولو۔ ذرا ہوا اندر آنے دو۔“ حطیم نے اس کی کیفیت کا لطف لیا تو حطیم نے اسے گھورا۔ اتنے میں نادر کھلے دروازے سے اندر داخل ہوا۔

”ہو بھالو..... ہو بھالو۔“ وہ اندر دھواں میں



شاپراٹھائے گھٹکتا آ رہا تھا کہ سامنے بابا کو کچھ کرکشی
گم ہوگئی۔ ”سلام بابا سائیں!“ وہ فوراً نزدیک آیا۔
بابا نے سر پر ہاتھ رکھا۔

”وہیکم السلام۔ خوش ہو۔“

”جی بابا سائیں!“

”ہاں ہماری خوشیاں برباد کر کے بہت خوش
ہے۔“ حطیم جل کر بڑبڑایا۔

”کیوں بھی میرے بیٹوں کو تنگ کر رکھا ہے؟
کھانا صحیح کیوں نہیں پکاتے۔“ بابا نے آنکھیں
دکھائیں تو نادر سر کھجانے لگا۔

”بابا میں تو اے دن کھانا پکاتا ہوں۔ بھائی
لوگوں کو پتا نہیں کیوں پسند نہیں آتا۔“ وہ معصوم شکل
بنا کر بولا۔

”اچھا پکایا کرو سچے! میں گاؤں سے سچا گھی لایا
ہوں اب اسے ڈال کر کھانا پکاتا۔“ بابا کے کہتے ہی
نادر اچھل پڑا۔

”ارے واہ۔ اب مزا آئے گا۔“ وہ چنچارہ
لے کر بابا کے بیک کی طرف دوڑا۔

”بابا! کیوں لائے اصلی گھی۔ اب یہ پگلا ہمیں
بھر بھر کھلائے گا۔“ حطیم نے ناپسندیدہ نظر نادر پر
ڈالی جو گھی کا ڈبا بیک سے نکال رہا تھا۔

”خالص چیز جتنی کھاؤ گے اتنی صحت سنے گی۔
شہر آ کر تینوں لڑکے چھو ہارے بن گئے ہو۔“ بابا کی
مثال پر تینوں نے احتجاجاً انہیں دیکھا۔ مگر وہ بے
نیازی سے حق گڑ گڑاتے رہے۔

☆☆☆

رات کو بابا کا بستر لاؤنج میں لگاتے نادر کی ہنسی
بے قابو تھی۔ بابا نے رات کے کھانے کی بہت
تعریف کی تھی۔ انہوں نے اس کو دو سو روپے انعام
بھی دیا جبکہ تینوں لڑکوں کے منازرے ہوئے تھے۔
ارحمان تو ذرا سا کھانا کچھ کر میز سے اٹھ گیا۔ حطیم اور
حاطب بھی مارے باندھے کھاتے رہے تھے۔

”نادر بیٹا! میرا بستر لگا دیا۔“ بابا دھوتی پہنے
لاؤنج میں داخل ہو کر بولے تو حطیم کی جان پر بن

گئی۔

”جی! کھڑکی کے بالکل سامنے لگایا ہے۔“ وہ
حطیم کو دیکھ کر ہنسا۔

”بہت اچھے۔“ بابا نے دھوتی کو ہاتھوں سے
سمیٹا اور بستر پر بیٹھ گئے۔ ”ادھر آ کر میرے چیر دبا دو
حطیم!“ پھر بستر پر لیٹ کر کہا تو حطیم بڑی سانس
کھینچتا ان کے پاس آیا۔

”تم کیوں کھڑے ہو، جاؤ یہاں سے۔“ اس
نے نادر کو گھر کا تو وہ بد مزہ ہو کر بچن میں چلا گیا۔

”جیتے رہو بیٹا! میرا خیال کر کے یہاں بیٹھے
ہو۔“ بابا نے پیار سے حطیم کو دیکھا۔

”ان کو آپ کا خیال کم کسی اور کا زیادہ ہے۔“
نادر نے بچن سے سر نکالا تو حطیم نے پاس بڑی چپل
اٹھالی۔ بابا نے کروٹ بدلی اب ان کا چہرہ کھڑکی کی
طرف تھا۔ جدید طرز کی قد آدم کھڑکی کے کچلے
سلائڈز سے دو دفعت کے فاصلے پر ایک اور فلیٹ کی
کھڑکی نظر آرہی تھی۔ بابا نے بغور دیکھا تو چونک
سے گئے۔

”حطیم..... بڑوں کے فلیٹ کی بجلی کیوں جھٹکے
کھا رہی ہے۔“ انہوں نے فکر مندی سے حطیم کو متوجہ کیا تو
اس نے دوسری طرف کی لائٹ جلتے بجتے دیکھی اور
سر پیٹ لیا۔

”یہ کیا حرکت ہے۔ میرے بابا ساتھ بیٹھے
ہیں۔“ حطیم نے تیزی سے تاج ٹاپ کر کے سینڈ
کیا۔

”لائٹ کا جواب لائٹ سے چاہیے۔ سچ سے
نہیں۔“ فوراً رپلائی آیا۔ حطیم نے غصے والا ایسوجی
سینڈ کر دیا۔ جواباً شیطانی شکل والا ایسوجی چلا آیا۔
”ان کی لائٹ کو ہوا کیا ہے کچھ پتا تو کرو۔ آخر
بڑی ہیں۔“ بابا ہنوز فکر مند تھے۔

”سچ..... جی..... وہ ان کی لائٹ میں یہی
مسئلہ ہے جلتی بجھتی رہتی ہے۔ آپ توجہ نہ دیں۔“ وہ
ان کے چیر تیز تیز دباتے گھبرا کر بولا۔

”ہیں..... ایسا کیوں؟“ وہ سوچ میں پڑ گئے۔

”صرف ایک منٹ کے لیے اپنی لائٹ بند
کر کے کھولو اور اپنی محبت کا ثبوت دو۔“ بیل پر
فرمائشی میسج آیا۔ حطیم نے بے بس ہو کر دور سے
جھٹک دکھلاتی عروہ کو دیکھا۔

”بابا میں چپک کرتا ہوں کیا مسئلہ ہے۔“ وہ
اٹھ کر اپنے سوچ بورڈ تک گیا اور ٹیوب لائٹ بند
کر کے دوبارہ کھولی۔

”گڈ ورک.....“ حوصلہ افزائی کا میسج ان
باکس میں آ موجود ہوا۔

”یہ تم اپنی لائٹ کیوں چپک کر رہے ہو۔ مسئلہ
تو ادھر ہے۔“ بابا نے نا بھگی کے عالم میں حطیم کو
دیکھا۔

”وہ..... بات دراصل یہ ہے کہ ادھر کا مسئلہ
ادھر سے حل ہوتا ہے۔“ وہ گڑبڑا کر بولا تو نادر کی ہنسی
گوشتی۔ حطیم نے بچن سے باہر نکلے نادر کو آنکھیں
دکھائیں۔

”اب دیکھیں، صحیح ہو گیا نا۔“ پھر وہ اطمینان
سے دوبارہ ان کے پاس آ بیٹھا تو بابا نے حیرت سے
سامنے دیکھا۔ جہاں اب لائٹ بالکل ٹھیک طرح
جل رہی تھی۔

☆☆☆

”بابا آج رومبہ آپ سے ملنے آرہی ہے۔“
ارحمان نے انہیں اطلاع دی تو بابا نے حیران ہو کر
اسے دیکھا۔

”مجھے بچی کے والدین سے ملنا ہے بیٹا!“
”بابا اس کے والدین تو امریکا ہوتے ہیں۔“
دراصل ان کے بیٹے وہیں رہائش پذیر ہیں۔“
ارحمان نے وضاحت کی۔

”پھر میں رشتہ کدھر لے کر جاؤں گا؟“ بابا نے
بد مزہ ہو کر پوچھا۔

”رشتہ کیسا؟ ہم دونوں نے شادی طے کر رکھی
ہے۔ اس کا بھائی پاکستان آئے تو ڈیٹ فکس کر لیں
گئے۔“ ارحمان نے کندھے اچکا کر کہا تو بابا خاموش
ہو گئے۔

دنیا بھر سے منتخب تحریری ادب

عمران ڈائجسٹ

Email: id@khawateendigest.com

اگست
2018

کے شمارے کی
ایک جگہ

ضرب آہن

خزانے کی تلاش میں جھٹکتے ہوئے نوجوان کی سرگزشت
جاوید راہی کے قلم کا ہادر

محبت خواب

محبت میں انسان اپنی خواہش محبوب کی خواہش کے
طالع کر دیتا ہے محبت کا جہز رکھنے والوں کے لیے
ایم اے راحت کا قلم خاص

خیال باطل

قل اور کوار کی مثال کج کر دینے والے پروفیسر کی
بہادری و شجاعت کی داستان

سببین شیخ کے خیالات کی پرواز

کایا پلٹ

ایک ایسے شہر کا قصہ جہاں کی کایا پلٹ تو ایک انہونی
افتادہ بڑی اور انسان انسان نہیں رہا

جرمن ادب سے ماخوذ عبد العزیز خان کی ایک پرستنی تحریر

مقید خاک

پراسرار سرزمین سے وابستہ حیرت انگیز واقعات کی بازگشت
ایک شخص کی آپ بیتی

ضواریہ ساحر کی ایک منفرد کہانی

اس کے علاوہ ایس ڈی ایس کی روٹینس، سسٹین اور تجسس سے
بھرپور 9 مشہور و معروف مصنفین کی طبع زار و ترجمہ کہانیاں

اگست 2018 کا ۲۴ شمارہ آج ہی خرید لیں

”جب تم دونوں خود طے کر چکے ہو تو میرا یہاں کیا کام۔ میں کل گاؤں واپس جا رہا ہوں۔“ بابا نروٹھے پن سے بولے تو ارجمان مسکرایا۔

”ایسے کیسے جانے دوں آپ کو۔ آپ تو میرے بابا جی ہیں اور ماں بھی۔“ وہ ان کے کندھے پر سر رکھ کر بولا تو بابا ابدیدہ ہوئے۔

”آج تمہاری ماں زندہ ہوتی تو وہی ان باتوں کو کہتی۔“

”بابا پلیز! آپ رنجیدہ نہ ہوں۔“ ارجمان ان کے گلے لگا گیا۔

”بس بیٹا جیسی رب کی مرضی۔“ وہ سنبھل کر رد مال سے چہرہ صاف کرنے لگے۔

☆☆☆

”یو آر سو سوٹ بابا۔“ رومیہ نے ان کے ہاتھ سے گاؤں کی جگہ (کڑھائی) والی قمیص لیتے خوشی کا اظہار کیا۔ وہ انتہائی ماڈرن لڑکی جس کا لباس بھی مغربی تھا ان کے ساتھ پچھلے آدھے گھنٹے سے خوب باتیں بگھا رہی تھی۔ وہ اس بہت بڑی لکھی لڑکی کی باتوں سے نہ یور ہو رہے تھے نہ ہی خوش۔

”اس سے تو بہتر میری موی (بھئی) ہے۔“ کتنی سادی بھولی بھالی لیکن ان لڑکوں کو کون سمجھائے جو گٹ ہٹ انگریزی بولتی ماڈرن لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں۔“ انہوں نے دل میں سوچا۔

”نادر اونا دار! میرا حق تو لے آ۔“ آخر وہ حق منگوا بیٹھے۔ حالانکہ ارجمان نے رومیہ کے سامنے حق پینے سے منع کر رکھا تھا۔

”جی لایا۔“ نادر فوراً حق لے آیا۔

”شاباش بچے۔“ بابا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”یہ دمی شیشہ ہے۔“ رومیہ نے بغور دیکھ کر پوچھا۔

”شیشہ! ارے نہیں بیٹا! اس میں شکل کہاں دکھتی ہے۔“ بابا نے سادگی سے کہا تو حاطب کی ہنسی نکل گئی۔ اتنے میں ارجمان لاؤنج میں آیا تو سامنے کا

منظر دیکھ کر بوکھلا گیا۔ نادر کان دبا کر بھاگا اور جا کر بابا کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

ارجمان بہ مشکل اپنے تاثرات نارمل کرتا ان کے قریب گیا۔

”ارجی! انکل کتنے سہیل ہیں۔ اتنے بڑے لینڈ لارڈ تو فیملی ہی نہیں ہوتے۔“ رومیہ ارجمان کو دیکھ کر اٹھلائی۔

”یو! لینڈ لارڈ! کیا مطلب؟“ بابا نے چونک کر رومیہ کو دیکھا۔

”آئی مین۔۔۔۔۔ ارجی نے بتایا۔ ادھر گاؤں میں آپ کی ہزاروں ایکڑ زمینیں ہیں تو میرے ذہن میں آپ کا چمک اور تصور بناتا تھا۔ بڑی موچیں، بڑی سی گھڑی اور غصہ ور۔۔۔۔۔ بابا۔“ اپنی بات پر وہ خود ہی ہنسی۔ بابا نے ارجمان کو گھورا جس نے نظریں چرا لیں۔

”رومیہ آؤ تمہیں گھر چھوڑ آؤں کافی دیر ہو گئی۔“ وہ فوراً بولا تو رومیہ کھڑی ہو گئی۔

”اوکے بابا! ٹائٹل ٹو میٹ یو۔“ وہ خوش دلی سے بولی تو بابا نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر وہ دونوں دروازے سے باہر نکل گئے اور پیچھے بابا گہری سوچ میں پڑ گئے۔

☆☆☆

”السلام علیک بابا!۔“ وہ نادر کے ساتھ ٹی وی پر ڈرامہ دیکھ رہے تھے کہ ٹیلی ویژن پر متوجہ ہوئے۔ سامنے ایک من موٹی لڑکی کھڑی تھی۔

”ولیکم السلام!۔“ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگے جو نادر کو ایک ڈونگا تھا رہی تھی۔

”آپ کیسے ہیں بابا؟ میں پڑوس سے آئی ہوں۔ وہ سامنے والا فلیٹ ہمارا ہے۔“ لڑکی نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ کا نام کیا ہے بیٹی۔“

”عروہ نام ہے بابا!۔“ اس کی آواز بہت خوش نما تھی۔ شلواری قمیض پر سلیٹ سے دو پٹاؤں تھے عروہ ان کو اچھی لگی۔

”پڑھتی ہو؟“

”جی انٹر کر رہی ہوں۔“ وہ متلاشی نظریں گھمانے لگی۔

”بابا! آپ کا۔۔۔۔۔“ حطیم کسی کام سے ادھر آیا تو عروہ کو دیکھ کر سانس تھام لیا۔

”یہ سامنے سے آئی ہیں بیٹا۔“ کھڑکی کے اس طرف سے۔“ بابا نے ”کھڑکی“ پر زور دے کر کہا تو حطیم چونک گیا۔

”تو کیا بابا اس کا کھڑکی کے آس پاس منڈلاتا محسوس کر گئے تھے؟“ وہ کچھ جھنجھب کر زور دیکر آیا۔

”ہم نے آج کبھی بیانی تو آپ کے لیے لے آئی۔“ وہ وضاحتی لہجے میں بولی۔ ”جب ہمارے گھر میں کچھ اچھا پکا ہو بابا! امی یہاں ضرور بھیجتی ہیں۔“ ہنسی میں بے چارے لڑکوں کی نہ ماں ہے نہ بہن۔ کون پکا کر کھلاتا ہوگا۔“ وہ مزید بولتی رہی۔ حطیم نے اسے گھورا۔

”بہت شکر ہے بیٹے! آپ لوگ اتنا خیال رکھتے ہو۔ دیے ایک لڑکا رکھا ہے۔ ان کو پکا کر دیتا ہے۔“

”کون نادر! اس کو تو صرف دماغ پکانا آتا ہے۔ وہ کھلکھلائی۔

”آپ تو بہت کچھ جانتی ہیں بیٹا۔“

”بہت کچھ بابا! میں یہ جانتی ہوں کہ جب یہ بیٹیوں چھوٹے سے تھے جب ان کی ڈنڈھ ہوئی۔ آپ نے ہی اپنے بیٹوں کو ماں با۔۔۔ من کر پالا اور اتنی زمینوں کے ہوتے ہوئے اس کی سادگی سے پرورش کی۔ ان کو پڑھا لکھا کر اپنے زور بازو پر کمانے کے لیے شہر بھیجا اور۔۔۔۔۔“ عروہ کی زبان نان اسٹاپ چل رہی تھی اور بابا بالکل سن ہو کر اسے سن رہے تھے۔

”عروہ! باہر آپ کا چھوٹا بھائی آیا ہے۔“ حطیم نے گھبرا کر کہا۔

”وہ کس لیے آیا ہے؟“ عروہ بد مزاج ہو گئی۔

”اچھا بابا! میں چلتی ہوں۔“

”جلدی جائیں عروہ! حطیم نے دانت نہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے
بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	معدہ	قیمت
خوبصورت کھانا	نیا پڑھو	500/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	250/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	400/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	250/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	500/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	350/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	300/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	400/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	400/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	200/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	180/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	450/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	300/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	120/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	300/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	300/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	300/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	500/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	180/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	180/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	250/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	150/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	350/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	300/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	400/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	400/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	300/-
نیا پڑھو	نیا پڑھو	400/-

ناول نگار نے 50 روپے کا ناول لکھا۔ 30 روپے
کچھ عروہ کی جگہ 30 روپے کا ناول لکھا۔
فون نمبر: 32216361

کر کہا۔

”جاری ہوں نا۔“ عروہ جبر پختی پائر نکل گئی۔
بابا کی گھوڑیاں حطیم کو بھی وہاں سے نو دو گیارہ ہونے پر مجبور کر گئیں۔

☆☆☆

”حطیم! یہ لڑکی عروہ تمہیں پسند ہے؟“ رات کو بیدر باتے حطیم کے ہاتھ بابا کی بات پر رک گئے۔

”جی بابا! میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ بے اختیار بولا۔ ”دراصل میں جس فارما سہتی میں اسٹرن شپ کر رہا ہوں وہیں سے جاب کی آفر آئی ہے تو سوچا ہے جاب ملے ہی گھر بسا لوں۔ ویسے بھی ارجمان بھائی شادی کے بعد بھابھی کے اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جائیں گے اور پھر چند سالوں بعد امریکا۔“ حطیم آج انکشافات کر رہا تھا۔ بابا چپ سے ہو گئے۔

”اچھی بات ہے۔ سب کو اپنا مستقبل سنوارنے کا حق ہے۔ تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں کل ہی اس بچی کا ہاتھ تمہارے لیے مانگنے جاؤں گا۔“ وہ سنجیدگی سے بولے۔

”کل.....“ حطیم حیران ہوا۔

”نیک کام میں دیری کیسی؟ دیے بھی پرسوں مجھے گاؤں جانا ہے۔“

”آپ پرسوں جا رہے ہیں۔“ حطیم رکھا سا ہوا۔

”ہاں بہت رو لیا۔ خیر کل شام کو چلیں گے عروہ کی طرف۔“ انہوں نے حتیٰ لچے میں کہہ کر کروٹ بدل لی۔

☆☆☆

عروہ کے والدین سے مل کر ان کو حقیقتاً خوشی ہوئی۔ بہت پر خلوص لوگ تھے۔ ان کے لیے حطیم کا رشتہ آنا حیران کن نہیں تھا۔ لڑکا لڑکی کی پسند سے وہ واقف تھے۔ ان کی دوسری بیٹیاں تھیں تو حطیم ان کا بیٹا بن کر اندر باہر کے کئی کام کر دیا کرتا تھا۔ بابا نے عروہ کی والدہ کی زبانی بہت کچھ جان لیا اور اپنے بچے کی اداکاری پر دل میں داد دی جو پڑوسیوں سے گہرا تعلق

چھپا رہا تھا۔ انہوں نے عروہ کو گلن کے پیسے دیے۔
”آپ لوگ اس بڑی عید پر ہمارے گاؤں ضرور آئیے گا۔ میرے بیٹے بھی وہیں ہوں گے۔ آپ ہمارے خاندان سے مل کر خوشی محسوس کریں گے۔“ آتے وقت انہوں نے عروہ کے والدین کو دعوت دی جس کو انہوں نے گرم جوشی سے قبول کیا۔ حطیم کا چہرہ اتر گیا۔ وہ بابا کو روک بھی نہیں سکتا تھا۔

دوسرے دن ان کی رومیصہ کے بھائی سے فون پر بات ہوئی۔ اس نے عید الاضحیٰ پر اپنی آمد کا عندیہ دیا۔ بابا نے اس کو بھی گاؤں آنے کو کہہ دیا۔ ارجمان بوکھلا گیا لیکن وہ دعوت دے چکے تھے۔ اب دونوں بھائی سرچھو کر بیٹھے تھے اور بابا مزے سے اپنا سامان پیک کر کے گاؤں جانے کو تیار کھڑے تھے۔
”اللہ کی امان میں بابا!“ کچھ بھی تھا دونوں کو باپ سے محبت بہت تھی سو انہیں اسٹیشن تک چھوڑنے آئے تھے۔

☆☆☆

اور آج عید الاضحیٰ کا دن تھا۔ فجر کے بعد دھوپ کی کرنیں جب کھلے محن میں استراحت فرماتے شہری لڑکوں کی بند آنکھوں میں چیسے لگی تو چار بابائوں پر ان کے وجود کسمانے لگے۔ ساتھ ہی مرغ کی زوردار آواز نے کانوں میں گھس کر ان کو بستر چھوڑنے پر مجبور کیا۔

”اف ہوا! کیا مسئلہ ہے۔ ٹھیک سے سونے بھی نہیں دیتے۔ رات میں پچھر دن میں یہ مرغ!“ ارجمان بے زاری سے جسم کھجاتا بولا۔

”بابا ان بکروں کو تو کوئیں اور باندھتے۔ ساری رات میرے سر ہانے میں میں“ کر کے سر کھا گئے۔ حطیم نے تنگی بخ کر دہائی دی۔ حاطب البتہ اوندھے منہ چار پانی پر مزے سے پڑا تھا۔

”آج عید کا دن ہے۔ نہادھو کر اللہ کا نام لو۔ پھر قربانی کرنی ہے۔“ بابا نے بکروں کے گے چار ڈالتے ان تینوں کو گھر کا جو بنیان اور شلوار۔ مایوس بنائیاں روک رہے تھے۔

”لینڈلارڈ باپ کے خرلے بیٹوں! جلدی اٹھو۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے تو ارجمان اور حطیم نے ان سے نظریں چرائیں۔ پھر تینوں فریش ہو کر بابا کے ساتھ نماز پڑھا آئے تو قربانی کے تین صحت مند بکرے اور ایک گائے کو گھونٹے اور بانٹنے میں ہی پورا دن نکل گیا۔ ذرا فرمت ملے ہی یہ اپنے اپنے موہاں کان سے لگائے گھر سے بھاگ نکلے کہ گھر میں تو سارا خاندان اٹھ آیا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن شام کے وقت رومیصہ اور اس کا بھائی اور عروہ کے والدین گاؤں آئے تو ارجمان اور حطیم کو وہ جگہ نہیں مل رہی تھی جہاں ان کو بٹھائیں۔ دونوں لڑکے انتہائی بوکھلاہٹ کا شکار تھے حالانکہ اچھا خاصا کشادہ گھر تھا مگر ان کے بتائے گئے حویلی تارپ گھر کے معیار پر پورا نہ اترتا تھا۔ بابا کے ساتھ تیار اور چاچا نے بھی شہری مہمانوں کی بڑھ چڑھ کر عداوت کی۔ خاندان کی عورتوں نے رومیصہ اور عروہ کی والدہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ذائقہ دار کھانوں سے ان کی تواضع کی گئی۔ میزبان، مہمانوں کے آگے بچھے جا رہے تھے۔ یہی ان کی روایت تھی، یہی ان کا طریقہ تھا کہ مہمان کو آنکھوں پر رکھتے تھے۔

”مجھے آپ لوگوں سے کچھ کہنا ہے۔“ خوش گوار ماحول میں باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ بابا نے گلا کھٹکار کر کہا تو سب ہمدن گوش ہوئے۔

”میں بہت بڑا جاگیردار نہیں ہوں۔ چھوٹا سا زمین دار آدمی ہوں۔ عزت سے گزارا ہو رہا ہے۔ رب کا کرم ہے۔ میری کل جاگیر میرے بیٹے ہیں۔ ان کی ماں بہت بچپن میں ان کو چھوڑ گئی تھیں میں ان کی ماں بھی بن گیا اور باپ بھی۔“ وہ ذرا خاموش ہوئے۔ ”کسی قیمتی متاع کی طرح میں نے ان کی پرورش خالص اور بناوٹ سے پاک ماحول میں کی۔ ان کو ہمیشہ سچ کہنا اور سنا سنا سکھایا۔ ان کو باشعور اور خواندہ بنانے کے لیے ہر سال اپنی زمین کا ایک ٹکڑا بیچا۔ بدلے میں انہوں نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ تعلیمی اور اخلاقی لحاظ سے اچھے رہے۔ پانچ سال ہو گئے

ان کو شہر گئے۔ میرا چڑھایا کچ کا رنگ کب اتر ۱۱ کب انہوں نے خود پر جھوٹ کا ملمع چڑھالیا پتا ہی چلا۔“ ان کی آواز پر مٹی نے غلب پالیا۔

”یہ گاؤں میں سادگی اور وضع داری کو تو عزت سمجھتے تھے لیکن شہر جا کر یہ مغالطے میں پڑ گئے ان کو لگا عزت کا معیار پیسہ ہے اسی لیے انہوں نے آپ لوگوں سے غلط بیانی کر ڈالی جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر بولے تو ارجمان اور حطیم کے سر شرمساری سے جھک گئے۔

”آپ سب کو یہاں بلانے کا مقصد اپنی حیثیت سے آپ کو آگاہ کرنا ہے۔ سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔ ہم اتنے ہی دولت مند ہیں جتنے آپ کو نظر آ رہے ہیں۔ اب فیصلہ آپ کا ہے۔“ انہوں نے کہہ کر گہری سانس بھری۔ کچھ لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

”اُس ادا کے بابا!“ رومیصہ کی آواز سب سے پہلے ابھری۔

”ہمیں آپ کی سادگی اور سچائی نے بہت متاثر کیا ہے انکل!“ اس کا بھائی بھی بول پڑا۔

”سچ بات تو یہ ہے بھائی صاحب! ہمیں ان کی بڑی بڑی باتوں نے نہیں بلکہ آپ کی گئی تربیت نے متاثر کیا ہے۔ بہت مہذب اور شریف بچے ہیں آپ کے۔“ عروہ کے بابا نے حطیم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ محل اٹھا۔

”بالکل انکل! روپیہ پیسہ تو آنی جانی چیز ہے۔ ہماری رومیصہ کی پسند نے ہمیں مایوس نہیں کیا۔ ارجمان ایک بہتر لڑکا ہے۔“ رومیصہ کا بھائی حزیہ بولا۔ بابا کی مسکراہٹ گہری ہو گئی انہوں نے اپنے بیٹوں کو بغور دیکھا جو چھٹی چھٹی مسکراہٹ کے ساتھ تقریریں وصول کر رہے تھے۔

ان سب کو گاؤں بلانے کا ان کا فیصلہ درست ثابت ہوا تھا۔ اس طرح ان کے بیٹوں کو ہمیشہ کے لیے ایک سبق مل گیا تھا جو شاید ان کی ذانت ڈپٹ اور غصہ سے سکھ پانا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔

☆☆☆

لڑکھائے عشق

دوسری قسط



”دل آویز..... پیلو“ مبین نیازی کلر پنڈن شاہنگ سینئر آکسفورڈ میں کوشا کیفے کی باہر لکی میسر پر بیٹھا کیپو چینو کے ساتھ چیز اینڈ ٹماٹو ٹوسٹ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس وقت شاہنگ سینئر میں بے تحاشا شرس تھا۔ کیفے کے بالکل سامنے ”زارا“ میں ونٹر سیل عروج پر تھی۔ دھڑا دھڑ لوگ ”زارا“ میں لگی اس سیل سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں تھے، مبین نیازی نے چیز اینڈ ٹماٹو ٹوسٹ کا بائٹ لیا اور دوسرے بل آتے جاتے لوگوں کو دیکھتے اس کی نظر کیفے میں داخل ہونے والی اس لڑکی پر پڑی۔ جس کی حلاں میں وہ پچھلے دو ہفتوں سے سرگرداں تھا۔ اور یہ تو ممکن تھا ہی نہیں کہ وہ اس کو پہچان نہ سکتا۔

مبین نیازی نے اسے پکارا لیکن شاید اس کی سماعت تک اس کی آواز نہ پہنچی تھی۔ اس لیے اپنا ٹوسٹ اور براؤنیز اور کیپو چینو وین چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ایکسیکوز می..... دل آویز.....“ مبین لوگوں کے جھوم میں کاؤنٹر کے پاس اسے نمبر کا انتظار کرتی دل آویز کے بالکل پاس گھڑا اس کو پکار رہا تھا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔

”لیس..... ہو آر یو؟“ (آپ کون ہو) اس کے الفاظ، اس کا لہجہ، اس کی نظریا جہنیت سے بھرپور تھے۔ ہلکا سا بھی پہچان کا شاہد تک نہ تھا۔ مبین نیازی کے لیے یہ لمحات نہایت پرسوز ثابت ہو رہے تھے۔ اسے یوں اپنا تعارف کروانا بہت محض لگ رہا تھا۔

کبھی یک دم ایک انجانی سی خوشی جانے لپیاں سے کہیں کوئے کھدرے سے نکل کر دل میں ایک اھل پھل بچا دیتی ہے، اور جی چاہتا ہے ساری دنیا کو اس خوشی کی خبر ملے، کوئی مجھ اس خوشی کو چاروں طرف پھیلا دے..... اور بھی بیٹھے، بٹھائے اچانک ایک انجان ہی یا سبت آ میر کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

ایک ایسی کیفیت جو بل بھر میں ہی غڈ حال کر دیتی ہے۔ اور حیران کن بات یہ ہوتی ہے کہ ہم اس وہ کوکھ کو نہیں پاتے ہیں یا شاید دل کی ان کیفیات کو لفظوں میں ڈھالا ہی نہیں جاسکتا ہے۔

محبت بھی انہی کیفیات میں سے ایک ہے جو لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی، صرف محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس دھڑکن کی طرح جو دل میں تو موجود ہوتی ہے لیکن دکھائی نہیں دیتی، اسی خوشی کی طرح جو دل میں پھونکتی ہے لیکن نظر نہیں آتی، اس اضطراب کی طرح جو یک دم طاری تو ہوتا ہے لیکن وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ اس ہوا کی طرح جو فضا میں ہر پل موجود ہوتی ہے لیکن نگاہوں کی پکڑ میں نہیں آتی۔

مبین نیازی کا دل بھی آج کل انہی رنگا رنگ کیفیات سے دو چار تھا۔ لیکن سچی ہو، دل میں محبت ہو، جذبوں میں صداقت ہو تو مثل مشہور ہے کہ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ مبین یازنی بھی اپنی لگن میں سچا تھا۔ محبت کی شدت پر بھروسہ تھا۔ بھی تو دیدار یار نے نظروں کی نشانی کو سیرابی عطا کی تھی۔

مبین نیازی نے حیرانی سے دل آویز کو دیکھا جو ابھی تک ان کو پہچان نہ سکی تھی۔

”آپ کی یادداشت کمزور ہے یا میں اتنا معمولی کہ آپ کے ذہن سے میرا عکس مٹ گیا؟“ مبین نیازی مسکرا کر پوچھنے لگا۔

”میری یادداشت کمزور نہیں ہے اور آئی الیم شیور آپ بھی معمولی نہیں ہوں گے۔“

”ایکسیکوزی آئی ہو تو پلیس مائی آرڈر۔۔۔۔۔“

دوسرے بل وہ کاؤنٹر میں کھڑی سب کو سرور کرتی لڑکی کی طرف متوجہ ہوئی۔

”ہم بہت بڑی ہیں میم آپ کو تقریباً نوٹینی منٹ انتظار کرنا پڑے گا۔“ وہ اس کے بے لگ انداز کی وجہ سے واپس پلٹنے لگا تھا کہ کاؤنٹر پر کھڑی سرور کی لڑکی کی آواز پر پلٹ کر اسے دیکھا جو کسی خالی میز کی تلاش میں نظریں دوڑا رہی تھی۔

”میری ٹیمبل پر ایک چیز ایکسٹرا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو یوزر کر سکتی ہیں۔“ چند سیکنڈز میں مبین نیازی پھر اس کی سامنے کھڑا تھا۔ دل آویز نے اسے دیکھا۔ ابھی تک اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں کوئی یاد، مبین نیازی کے نام کی نہ ابھری تھی۔

”چلیں۔۔۔۔۔“ اس کا ایک لفظ مبین نیازی کو زندگی کی نوید بنا گیا۔

”آپ نے واقعی مجھے نہیں پہچانا؟“ مبین نیازی جو اقرار محبت کے لیے الفاظ ترتیب دے رہا تھا، ایک بار پھر پہچان کے مرحلے میں آکھڑا ہوا۔

”آئی ایم سوری۔۔۔۔۔ نہیں پہچانا۔۔۔۔۔“ دل آویز نے صاف لہجے میں اس کو بتایا۔

”اس کا مطلب ہے آپ لوگوں کو جلدی بھول جاتی ہیں۔“ مبین نیازی نے گہری نظر سے اسے دیکھا اور ٹھنڈی کیپو چین کو اٹھا کر کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

”نہیں تو۔۔۔۔۔ آپ کا لہجہ کچھ کچھ جانا پہچانا لگ رہا ہے لیکن بائیس آپ ابجینی ہیں۔“ دل آویز سرسری لہجے میں اس کو بتانے لگی تھی۔

”آپ کو بارش پسند ہے؟“ مبین نیازی کے

سوال پر دل آویز نے اسے دیکھا تھا۔

”بارش پسند؟ پسند بہت۔۔۔۔۔ معمولی لفظ ہے بارش سے تو مجھے عشق ہے۔“ دل آویز انتہائی مضبوط لہجے میں بولی۔ تو مبین نیازی کی حیرت یک لخت گہری مسکراہٹ میں ڈھل گئی۔

”کاش گریٹ۔۔۔۔۔ مبین پر جوش انداز میں بولا۔

”کیوں؟“ دل آویز نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”بارش تو رحمت ہوتی ہے۔۔۔۔۔ پھر چاہے وہ بارش پر غلوں جذبوں کی ہو، پھولوں کی ہو، پانی کی ہو یا۔۔۔۔۔ محبت کی۔۔۔۔۔ اس سے عشق کرنا دل کی خوب صورتی کو ظاہر کرتا ہے۔“ مبین کی آنکھوں میں ایک چمک انتہائی واضح تھی۔ دل آویز نے اسے دیکھا۔

”اس کا مطلب ہے آپ کو بھی بارش سے عشق ہے؟“ دل آویز نے اس سے استفہار کیا۔

”تھا۔۔۔۔۔ پر ختم ہو گیا تھا۔ اب پھر ہو گیا۔۔۔۔۔ مبین نیازی بلکے قہقہے کے ساتھ بولتا اس کو حیران کر گیا۔

”یہ عشق کی کون سی قسم ہے جو بھی ہوتا ہے اور کبھی ختم ہو جاتا ہے؟“ دل آویز نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا تھا۔

”مجھے بارش بہت اچھی لگتی تھی۔۔۔۔۔ میں اور میرا دوست ہمیشہ بارش میں سائیکل چلایا کرتے تھے۔“

”پھر۔۔۔۔۔؟“ مبین اسے بتانے لگا تھا۔ یک دم چپ ہوا تو وہ پوچھنے لگی۔

”تقریباً آٹھ سال پہلے بہت تیز بارش میں ہم بائیک چلا رہے تھے تو وہ ایک نہر میں جا کر۔۔۔۔۔ اور اس کی ڈیڑھ ہو گئی۔۔۔۔۔ اس کے بعد مجھے بارش نہیں اچھی لگتی تھی۔“ مبین نیازی نے دل آویز کو بتایا۔ تو وہ خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”اوہو۔۔۔۔۔ رینلی سینڈ۔۔۔۔۔“ وہ بولی۔ تو مبین دھیسے سے مسکرایا۔

”دل آویز۔۔۔۔۔“ مبین نے جیسے مصری کا ٹکڑا منہ میں ڈالا تھا۔ دل آویز نے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا۔

”آپ نے ابھی تک مجھے نہیں پہچانا لیکن آئی

پروس آج کے بعد آپ بھی مجھے نہیں بھولیں گی۔“

مبین نیازی مسکرایا تھا۔ دل آویز گھبراہٹ کا شکار ہوئی لیکن خود پر قابو پالیا۔

”بارش۔۔۔۔۔ غبار ہے۔۔۔۔۔ اور ایک ڈرائیو۔۔۔۔۔ دھیما میوزک۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔“

”او مائی گاڈ۔۔۔۔۔ لیس لیس۔۔۔۔۔ آئی نو یو۔۔۔۔۔“ دوسرے بل اس سے پہلے کہ مبین نیازی مزید کوئی حوالہ دیتا، دل آویز چیخ اٹھی۔ تو مبین نے اپنی مسکرائی نظروں کو چمپ کر ایک گہری نظر سے اسے دیکھا تھا۔

”آئی ایم سوری مسٹر مبین۔۔۔۔۔ میرے ذہن سے وہ شام بالکل ہی نکل گئی تھی۔“ دل آویز اب شناسائی کے مرحلے میں داخل بے تکلفی سے گویا ہوئی اور اگلے بل کاؤنٹر کی طرف متوجہ ہوئی۔ شاید اس کا آرڈر تیار ہو چکا تھا۔

”اگر آپ کا آرڈر تیار ہے تو یہاں ہی لے آئیں۔“ میرا نہیں خیال کوئی اور میز خالی ہوگی۔“ مبین اس کی کھوجتی نظروں کو گہری نظر سے دیکھ کر کہنے لگا تو دل آویز نے خاموشی سے اسے دیکھا۔

”ویسے آپ نے پوچھا نہیں کہ میرا عشق دوبارہ کیسے شروع ہوا تھا۔۔۔۔۔“ مبین کی بات پر دل آویز اپنے آرڈر کو لینے کے لیے اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔“ حیرانی اس کے لہجے میں عیاں تھی۔

”ہا ہا ہا۔۔۔۔۔ آرڈر لے آئیں پھر مطلب بتاتا ہوں۔“ مبین نیازی کا ارادہ ابھی وہیں براہجان رہنے کا تھا۔ دل آویز تنگدلی میں جلاواں سے اٹھی تھی۔

”جہاں تک میں جانتی ہوں عشق ایک بار ہوتا

ہے بار بار نہیں۔۔۔۔۔“ دل آویز اپنے آرڈر کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے بولی۔

”عشق ایک ہی بار ہوتا ہے اور ہونا بھی ایک ہی بار چاہیے۔ لیکن کبھی کبھی عشق کو دوبارہ ہونا پڑتا ہے۔ ایک لمحہ۔۔۔۔۔ صرف ایک لمحہ لگتا ہے عشق کو دوبارہ ہونے میں۔۔۔۔۔ اور وہی ایک لمحہ۔۔۔۔۔ میرے عشق کو۔۔۔۔۔“

”بارش سے میری محبت کو جگا گیا تھا۔“ مبین مدھم لہجے میں کہہ رہا تھا۔ دل آویز کے چپس پر ہنک چھڑکتے ہاتھ ساکت ہوئے تھے۔

”میں۔۔۔۔۔ میں نہیں سمجھی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ دل آویز کی آنکھوں میں بے تحاشا الجھن تھی۔

”آپ کے پاس واٹس اپ ہے؟“ دوسرے لمحے مبین نیازی کا سوال اس کو چونکا گیا۔ بنا کچھ بولے، اپنی الجھن زدہ نظروں سے اس کو دیکھتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”نمبر دیں میں آپ کو وہ لکھ بھیجتا ہوں۔ جس نے میرے عشق کو مجھ سے ملا دیا تھا۔“ مبین نیازی اس لمحے اس کی الجھن کو بھینسنے سے قاصر تھا۔ یا شاید وہ سمجھنا ہی نہ چاہتا تھا۔ دل آویز غائب دماغی سے اگلے بل اس کو اپنا نمبر دے چکی تھی۔

”تھینک یو۔۔۔۔۔ ایک بار پھر میرا اعتبار کرنے کے لیے۔“ مبین نیازی مسکراتے ہوئے اس کا نمبر سیو کرتے ہوئے بولا۔ تو دل آویز نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ اس کا انداز ایک لاطینی لہجے کا تھا۔

”آپ سنج چیک کریں۔ میں چلتا ہوں۔“

”واٹ۔۔۔۔۔ واٹ از دیس؟ یہ تو میں ہوں۔۔۔۔۔“ دل آویز انتہائی بے یقینی سے مبین نیازی

کیون اور آپ

اس ماہ ”نغمہ جہول“ کو کیون اور آپ میں انعام کا حق دار قرار دیا ہے۔ ادارے کی طرف سے ”انغم جہول“ کو تین ماہ کے لیے ”ماہنامہ کرن“ مفت دیا جا رہا ہے۔

”تم لالہ سے بات کرو میں ابھی آتی ہوں۔“
 عروش نے عفاف کو ابھی وہاں سے اٹھنے کے لیے
 برتن لے دیکھ کر سرگوشی کی۔ تو وہ لاچار سی اس کو
 دیکھ کر رہ گئی۔ اور عروش سفینہ کا کپ اٹھا کر باہر نکل
 گئی۔

مبین مسلسل خود کو مصروف ظاہر کرتے ہوئے
 اپنا کپ پکڑے بیٹھتے تھے۔ عفاف نے اسے دیکھا۔
 ایک عجیب شش و پنج میں مبتلا عفاف نے پہلو بدل کر
 سامنے میز پر رکھا کپ اٹھایا۔
 ”آپ کی جاب کیسی جا رہی ہے؟“ عفاف جو
 اس کو مخاطب کرنے کے لیے الفاظ کو تڑپ دے رہی
 تھی اس کے سوال پر چونک کر اسے دیکھا۔
 ”کوئی مسئلہ نہ ہو تو آپ بلا جھجک ڈسکس کر سکتی
 ہیں۔ آپ کی مدد کر کے مجھے خوشی ہوگی۔“ اس کے
 لب و لہجے میں کوئی ایسا تاثر ضرور تھا کہ عفاف شیشا
 گئی۔

”جینک پو سوچ۔۔۔۔۔ فی الحال مجھے کسی مدد کی
 ضرورت نہیں ہے۔“ عفاف قدرے ساٹ انداز
 میں بولی۔

”آہم۔۔۔۔۔ ہوں۔۔۔۔۔“ مبین نے مدھم
 مسکراہٹ کو چھپانے کی خاطر کپ کو ہونٹوں سے لگا
 لیا۔ ایک بار پھر ایک خاموشی چھا گئی۔

”بارش۔۔۔۔۔“ مبین کی آواز پر اس نے یک دم
 باہر دیکھا۔۔۔۔۔ اور پھر حیرت سے مبین کی طرف۔
 ”بارش سے تو لگاؤ ہوگا آپ کو؟“ مبین نے اس کی
 طرف دیکھ کر سوال کیا تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ مجھے بارش سے کوئی لگاؤ نہیں
 ہے۔“ عفاف نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”عموماً لڑکیوں کو تو بارش بہت پسند ہوتی ہے
 پھر آپ کیوں اتنی مختلف ہیں۔“ مبین کو اس کے
 جواب پر واقعی حیرت ہوئی تھی۔

”مسٹر نیازی۔۔۔۔۔ میں یہاں عروش کے حوالے
 سے بات کے لیے رکی ہوں اپنی پرسنل باتیں ڈسکس
 کرنے کے لیے نہیں ٹھہری ہوئی ہوں۔ بہتر ہوگا

آپ اس طرف توجہ دیں۔۔۔۔۔ عفاف نے لہجے کی
 غیر معمولی نجی مبین نیازی کے اندر ایک اطمینان کی لہر
 دوڑائی۔

”نہیں شیور۔۔۔۔۔ کیری آن۔۔۔۔۔“ مبین نے اس
 کے جیسے تیوروں کو بغور دیکھ کر نہایت محل مزاحی سے کہا
 تھا۔ عفاف نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”مسٹر نیازی میں ایک پروفیشنل اور انٹرپرائسٹ
 ادارے کی انچارج ہوں اور جہاں تک میرا علم ہے
 آپ بھی ایک ویل ایجوکیٹڈ مین ہیں اور ایک ویل
 اسٹبلشڈ بزنس کو نہایت خوش اسلوبی سے چلا رہے
 ہیں۔ میں یہاں اس وقت ایک اہم مسئلے کو ڈسکس
 کرنے کے لیے ہوں میں اس وقت آپ کی طرف
 سے کسی بھی غیر سنجیدہ رویے کی توقع بالکل نہیں رکھ
 رہی ہوں۔ سو پلیز آپ اپنے اپنی ٹیوڈ کو پیچور کریں
 تاکہ میں بات کر سکوں۔۔۔۔۔“ عفاف نے مبین کی
 اپنے آپ پر جی نظروں اور غیر سنجیدہ رویے کو مد نظر
 رکھتے ہوئے کہا۔

مبین نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

”اوکے آپ بویس میں پوری کوشش کروں گا
 کہ اپنے آپ کو ویل ایجوکیٹڈ اور ویل میٹر ڈیپروف کر
 سکوں۔۔۔۔۔“ مبین بظاہر مکمل سنجیدگی سے گویا ہوا تھا
 لیکن اس کے اندر قہقہے گونج رہے ہیں یہ وہ بھی جانتا
 تھا اور عفاف سے بھی یہ حقیقت پوشیدہ نہ تھی۔

”آئی ایم سوری۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ آپ پر شاید میرا
 بہت برا ایمپریشن ہے۔ اسی کو زائل کرنے کی کوشش
 کر رہا تھا۔“ مبین نیازی نے مسکرا کر کہا۔ تو عفاف
 کے چہرے پر حیرانی در آئی۔

”برا ایمپریشن۔۔۔۔۔؟“ عفاف نے غائب
 دماغی سے کہا۔

”عروش کے ساتھ مجھے تھوڑا سا سخت رویہ رکھنا
 پڑتا ہے۔ بہت ضدی ہے اور سن مانی بہت کرتی
 ہے۔ لیکن کچھ معاملات سوچ سمجھ کر دیکھے جاتے
 ہیں۔“

”آپ ہینیس پلیز۔“ مبین نے قدرے صلح

جو اور دوستانہ انداز اپنایا تو عفاف کو مجبوراً دوبارہ بیٹھنا
 پڑا۔ مبین اپنی سیٹ کی طرف بڑھا۔

”آپ نے کیا بات کرنی تھی؟“ مبین نے
 عفاف کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”عروش پو کے جانا چاہتی ہے۔“ عفاف نے
 بنا تہیہ اپنی بات شروع کی تھی۔

”وہ پو کے نہیں جاسکتی۔“

”لیکن کیوں؟“ اس سے پہلے کہ مبین مزید کوئی
 بات کرنا عفاف نے تیزی سے پوچھا۔ تو مبین نے
 گھر اسٹنس لے کر اسے دیکھا۔

”عروش کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ
 اکیلی پو کے جائے۔“ مبین نے کشن کو گود میں رکھ کر
 اپنے مخصوص انداز میں یوں کہا کہ عفاف چند بل کچھ
 بول نہ سکی۔

”اس میں نامناسب کیا ہے؟“ عفاف جھنجھلائی
 تھی۔

”دیکھیں مس عفاف۔ عروش یہاں سٹنل ہے
 اسٹیوٹ کو چوبیس گھنٹے اس کی توجہ کی ضرورت ہے۔
 بے شک میں اس کے ساتھ ہوں، دیکھ بھال میں اس
 کی مدد کرتا ہوں لیکن میں مکمل ذمہ داری نہیں لے سکتا
 ہوں میری اپنی ذاتی ذمہ داریاں بھی بہت ہیں۔“
 مبین نے محل مزاحی سے کہا تو عفاف یک لخت
 خاموش ہو گئی۔

”عروش جانا چاہتی ہے۔ کچھ عرصے کی بات
 سے زیادہ سے زیادہ دو سال۔“ عفاف نے پھر کوشش
 کی۔

”دو سال میں چوبیس مہینے بھی ہوتے ہیں۔“
 مبین کے پاس تو جیسے ہر انکار کا جواز موجود تھا۔ عفاف
 نے اسے دیکھا۔

”اگر معاملہ صرف اسٹیوٹ کا ہے تو۔۔۔۔۔“
 عفاف نے ہاتھ مروڑتے ہوئے تھوک نگلا تھا۔
 مبین نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”تو میں عروش کی جگہ
 ان معاملات کو سمجھال سکتی ہوں۔“ عفاف نہ چاہتے
 ہوئے بھی اپنی خدمات پیش کرنے لگی تھی۔

”اور آپ کی اپنی جاب؟“ مبین بے حد حیران
 ہوا تھا۔

”میں اتنی نازک نہیں ہوں کہ ایک وقت میں دو
 ذمے داریاں نہ اٹھا سکوں۔“ اس کے لہجے کی
 جھنجھلاہٹ اور خفیف سا طنز مبین کو مسکرانے پر مجبور کر
 گیا۔

”ایسی بات نہیں کہ میں ذمہ داری نہیں لے سکتا
 لیکن مکمل طور پر اسٹیوٹ کی دیکھ بھال نہیں کر
 سکتا۔۔۔۔۔ اور میں نہیں چاہتا کہ میری کوئی بھی ذاتی
 مصروفیت اسٹیوٹ کی ریسپونسیبلٹی کو متاثر کرے۔ اس
 لیے میں نے حالی نہیں بھری۔۔۔۔۔“ مبین انتہائی
 پرسکون انداز میں اس کو بتا رہا تھا۔

”اور اگر آپ ذمہ داری لیں گی تو وہ بھی فل ٹائم
 نہیں ہوگی۔ آپ کی اپنی جاب بھی ہے۔“ مبین مزید
 گویا ہوا۔ عفاف مسلسل سوچ میں تھی۔

”آپ کی بات میں سمجھ رہی ہوں مسٹر نیازی
 لیکن عروش کی خوشی کے لیے آپ کو تھوڑی بہت قربانی
 تو دینی ہی پڑے گی۔۔۔۔۔“ عفاف کا لہجہ نجائے کیوں رخ
 تھا۔ شاید وہ مبین کی اپنے آپ پر پڑی نظروں سے
 جھنجھلا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مبین اس کی جھنجھلاہٹ
 سے باخبر ہے اس کی مدھم مسکراہٹ، بولتی آنکھیں اور
 شائستہ انداز، خواہ مخواہ کا دوستانہ رویہ۔۔۔۔۔ عفاف
 ایک ہندو کی کمی کو شدت سے محسوس کر رہی تھی۔

”آپ مجھے مبین کہہ سکتی ہیں۔ مجھے خوشی ہوگی
 اور آپ کے لیے بھی مشکل نہیں ہوگی۔“ مبین ایک
 بار پھر اپنی پوشیدہ شرارت سے اس کو زبرد کرنے لگا تھا۔

عفاف نے متوجہ نظروں سے اسے دیکھا۔
 ”اگر آپ عروش کے بھائی نہ ہوتے تو۔۔۔۔۔“ وہ
 دانت پس کر آہستہ سے بڑبڑائی۔

”تو۔۔۔۔۔!“ مبین نیازی اس کے پلٹے لبوں
 سے ادا کیے گئے الفاظ سے بخوبی واقف تھا۔ عفاف
 نے اسے دیکھا۔ شعلہ انگلی نظریں، مسکراتی نگاہوں
 کے مقابل تھیں۔ ایک طرف مسکراہٹیں ٹھہری تھیں
 تو دوسری طرف جھنجھلاہٹیں عروچ پر تھیں۔ ایک طرف

جھٹلا ہوں سے لطف لیا جا رہا تھا تو دوسری طرف مسکراہٹیں زچ کیے جا رہی تھیں۔

”تو آپ کا صرف بال بن چکا ہوتا۔“ عفاف بتانا غلط و مردت دانت چیں کر بولی۔

”ہا ہا ہا..... آئی انجوائے ویٹ۔“ مبین خلاف معمول ایک شوخ و خشک لڑکے کا کردار ادا کر کے عروش کو جھوٹا ثابت کر رہا تھا۔

”لالہ.....“ اسی لمحے عروش کمرے میں داخل ہوئی۔ مبین کا قہقہہ اور عفاف کی شعلے برسانی لگا ہیں عروش کو کسی جنگ کے ہونے کی پیش گوئی دے رہی تھیں۔

”عروش مجھے اب جانا ہے۔“ عفاف یک لخت اٹھی تھی عروش نے حیرت سے اسے دیکھا جب مبین مسلسل مسکرا رہا تھا۔

”کیوں کیا ہوا؟“ عروش کو عفاف کے خطرناک تیوروں پر کچھ ایسا ہونے کا شبہ ہونے لگا تھا جو اس کے موڈ میں بگاڑ پیدا کر گیا۔

”کچھ نہیں کانی دیر ہو گئی ہے نا تو اب جانا ہے۔“ عفاف سیاٹ لہجے میں بولی۔

”جانے کی فکر نہ کرو میں اور لالہ تمہیں ڈراپ کر دیں گے۔“ عفاف لالہ؟“ عروش کہتے ہوئے مبین سے تعقدیق چاہنے لگی تھی۔

”ہاں شیور۔“ مبین نے ہامی بھری تو عفاف نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”لیکن وہ اب متوجہ نہ تھا۔“

”عفاف اگر آپ انسٹیٹیوٹ کی ذمہ داری بھا سکتی ہیں تو عروش تم اپنے گورس کے لیے یو کے جاسکتی ہو۔“ مبین موبائل اسکرین پر نظریں جماتے بولا تو دونوں حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگی۔

”ریکی لالہ.....!“ عروش یک دم ہی پر جوش لہجے میں اس سے پوچھنے لگی جبکہ عفاف ابھی تک خاموش تھی۔

”عفاف کیا یہ ذمہ داری بھال سکتی ہیں؟“ مبین براہ راست اس سے مخاطب تھا۔ ”مکمل پروفیشنل طریقے سے آپ کو اپائنٹ کیا جائے گا۔ سیکڑی طے

کی جائے گی۔“ اس سے پہلے کے عفاف کچھ بولی مبین مزید گویا ہوا۔ لہجہ بھر کو وہ چٹکی لیکن اگلے لمحے نارمل ہو گئی۔ اس کی تجویز نے عفاف کو حیران تو کیا ہی تھا ساتھ ایک سوچ میں بھی مبتلا کر دیا تھا۔

”لیکن عفاف کی اپنی جاب.....؟“ عروش نے اس کو سوچ میں گم دیکھا تو بولی۔

”اپنی دوست کی خوشی کے لیے ان کو تھوڑی سی قربانی تو دینی ہی پڑے گی۔“ مبین عفاف پر اپنی مسکرائی نظریں جمائے بولا۔

”میں سب کر لوں گی۔“ یک دم عفاف بولی۔ تو عروش نے متعجب نظروں سے اسے دیکھا۔

”عروش تم ساری تفصیل مجھے ای میل کر دینا۔ کل میں تھوڑی مصروف ہوں گی۔ پرسوں میٹنگ رکھ لیتے ہیں۔“ مجھے انسٹیٹیوٹ کی پالیسی کے بارے میں معلومات چاہیے ہوں گی۔“ عفاف مبین کو نظر انداز کرتی مکمل طور پر عروش سے مخاطب تھی۔

”لیکن پرسوں میرے پاس ٹائم نہیں ہوگا میٹنگ کا۔“ مبین کی آواز پر دونوں چونکیں۔

”آپ کی شمولیت ضروری بھی نہیں..... میں نے عروش سے ذیل کی ہے۔“ عفاف ایک بار پھر رخ لہجے میں اس سے مخاطب ہوئی۔

”شاید آپ کے علم میں نہیں کہ میں انسٹیٹیوٹ میں پچاسی فی صد کا حصہ دار ہوں اور قانونی طور پر کوئی بھی تبدیلی آنے تو دونوں پارٹنرز کا میٹنگ میں موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔“ مبین نیازی سنجیدگی سے اس کو بتاتے اسی کو حیران کر گئے۔ عفاف نے استغناء مہ نظروں سے عروش کو دیکھا۔ تو اس نے اثبات میں سر ہلا کر مبین کی بات کی تصدیق کر دی۔

”میٹنگ کی ساری ڈیٹیل کے نوٹس آپ تک پہنچ جائیں گے۔“ عفاف نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”لیکن مس عفاف..... چونکہ آپ عروش کی جگہ چارج لیں گی اس لیے اصولی طور پر یہ میٹنگ میرے ساتھ ہونی چاہیے کیونکہ عروش کے جانے کے

بعد آپ کو میرے ساتھ ساری چویشیں ڈسلس کرنی پڑے گی۔“ مبین نجائے کیوں اپنی سی ایک انجانی کوشش میں مبتلا اس کو زیر کرنے کے لیے طرح طرح ہتھکنڈے آزمانے لگے تھے۔

”کیا سلیپنگ پارٹنر بن سکتے ہیں؟“ عفاف نے بمشکل خود کو کسی رخ دکھائی سے باز رکھا تھا۔

”نہیں.....“ مبین مسکراہٹ دبا کر بولے۔ جبکہ عروش کے لیے مبین کا یہ انداز قطعی نا تھا۔ یہ مسکراہٹ، یہ شوخیوں ابھی مبین نیازی کی شخصیت کا حصہ رہی تھیں لیکن اب عرصہ دراز سے مبین ایک خول میں بند تھا۔ یوں اچانک یکا یک اس کا رویہ بدل جانا یقیناً ایک حیران کن منظر تھا۔

”اور دیسے بھی سلیپنگ بیوٹی ہوتی ہے سلیپنگ پارٹنر نہیں۔“ جو کہ میں کسی صورت بھی نہیں بن سکتا جا ہوں جب بھی نہیں.....“ مبین کے لہجے میں ایک شرارت پنہاں تھی۔ جس نے عفاف کو تو حیران کیا ہی تھا ساتھ میں عروش کو بھی چونکا دیا تھا۔ عفاف نے کبھی نظروں سے عروش کو دیکھا جن میں صاف صاف درج تھا کہ تم تو کبھی بھی کہ لالہ بہت غصے والے ہیں۔ بہت سخت مزاج ہیں لیکن یہاں تو انوکھے ہی انداز براجمان ہیں۔ عروش نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔ عفاف نے بے اعتبار سر تھا۔ جانتی تھی اب حامی بھری ہے تو اس کو نبھانا بھی پڑے گا۔

”او کے جب ٹائم ملے گا میٹنگ کا وقت بتا دینا میں پہنچ جاؤں گی۔“ عفاف اب اس فصول بحث سے مابرا آ چکی تھی۔ مبین جھٹلا کر بولی۔ عروش نے اسے دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

”لیکن ایک مسئلہ ابھی تک ویسے کا دیا ہی پڑا ہے؟“ مبین نیازی نے ان دونوں کو دیکھ کر کہا۔

”اب کیا مسئلہ ہے لالہ.....“ عروش نے مبین کو دیکھ کر پوچھا۔

”تمہاری وہاں رہائش کا بندوبست؟“ مبین شکرانہ انداز میں مدھم آواز میں بولا۔

”عروش کے رہائش کے لیے فکر مند نہ ہوں۔ وہ

ذمہ داری میری۔“ عفاف نے محبت پاش نظروں سے عروش کو دیکھ کر کہا۔

”کیا مطلب.....؟“ اس سے پہلے کہ عروش اس اطلاع پر خوشی کا اظہار کرتی مبین نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

”عروش میرے والدین کے ساتھ رہ سکتی ہے۔ کوئی براہم نہیں ہوگی۔“ عفاف نے عروش کی طرف دیکھ کر کہا۔

”آپ کے گھر.....؟“ مبین کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

”میرے گھر، میرے بابا جان اور می کے پاس.....“ عفاف اعتماد سے بولی۔ عروش نے بھی حیرت سے اسے دیکھا۔

”آپ چاہیں تو بابا جان سے بات کر سکتے ہیں۔“ عفاف نے کہا۔

”وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ عروش کو می اور بابا جان سے بہت تحفظ اور محبت ملے گی۔“ عفاف پھر بولی۔

”ہاں میری ان سے بات کروادیں۔ تاکہ تسلی ہو جائے۔“ مبین نیازی نے ذمہ دارانہ سنجیدگی سے کہا تو عروش نے فخریہ انداز سے اسے دیکھا۔ عفاف نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ابھی شاید بابا گھر نہ ہوں۔ عروش کے جانے سے پہلے بات کروادوں گی۔ لیکن فکر نہ کریں عروش کو وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ مجھ سے بھی زیادہ اس کو وہاں پیار ملے گا۔“ عفاف نے یقین دہانی کرائی۔

اس کے ذہن میں عدی کی خواہش گونج رہی تھی۔ عروش کے رہائش کا مسئلہ سامنے آنے سے پہلے ہی اس نے یہ سوچ لیا تھا۔

”او کے میری بات کروادینا..... اور آپ اپنا نمبر دے دیں تاکہ میں آپ سے انسٹیٹیوٹ کے حوالے سے رابطے میں رہ سکوں.....“ مبین نے اٹھتے ہوئے کہا۔ تو عفاف شپٹا گئی۔

”زیر و تھری..... آگے؟“ اس سے پہلے کہ

عفاف کسی قسم کا کوئی ری ایجنس ظاہر کرنی یا انکار کرتی۔ مبینہ دودھ قدم چلا اس کے پاس آکھڑا ہوا اور موبائل ہاتھ میں پکڑے انتہائی چالاک کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا نمبر لینے لگا۔

”مجھے جب ضرورت پڑے گی میں آپ سے خود رابطہ کر لوں گی۔“ عفاف نے عروش کی موجودگی کے باوجود انتہائی تلخ انداز میں انکار کیا تو مبینہ، جس کو غصہ آتا چاہیے تھا نے مسکرا کر موبائل واپس پاگٹ میں ڈال دیا۔

”اوکے..... جب آپ نے جانا ہو بتا دیجیے گا۔ میں ذرا فریٹش ہوں۔“ مبینہ نے عروش کی طرف دیکھ کر کہا تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔

”یار تو بہت ہی زبردست ہو گیا۔“ اس کے جاتے ہی عروش کو بھی اپنی خوشی کا کھل کر اظہار کرنے کا موقع مل گیا۔ عفاف دھیمے سے مسکرائی لیکن اس کے ذہن میں مبینہ نیازی کی بے تکلفی بری طرح چبھ رہی تھی۔

”ویسے بہت عجیب بات ہے۔ میں تو جب سے باہر جانے کے چانس کا پتا چلا تھا لالہ کو کہے جارہی تھی۔ ہمیشہ آگے سے نا ہی جواب میں ملا لیکن تم نے تو ایک ہی ملاقات میں لالہ کو راضی کر لیا۔ آئی ریٹی نو یو مینی.....“ عروش متجھبہ لہجے میں کہتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔

”اچھا اب کافی وقت ہو گیا ہے۔ دادو سے مل لوں پھر میں نے جانا ہے۔“ عفاف نے باہر کی جانب قدم بڑھانے تو عروش بھی اس کے پیچھے پکی۔ ”لیکن میں اور لالہ تمہیں ڈراپ کر دیں گے ناں کیا جلدی ہے۔ جانے کی؟“ عروش اس کے ہمراہ چلتی کہنے لگی تھی۔

”ایک دوسرو کی کام کرنے ہیں اس لیے اب جاتی ہوں اور اپنے لالہ کو آرام کرنے دو۔ میں گاڑی لائی ہوں آج.....“ عفاف سفینہ کے کمرے کے دروازے کو کھولتے ہوئے بولی۔

”دادو اب میں جا رہی ہوں۔ بہت مزے دے کھانا تھا اور بہت اچھا لگا آج کی شام آپ کے سامنے گزار کر۔ ان شاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔“ عفاف سفینہ سے ملنے ہوئے بولی اور ان سے دعائیں لے کر واپس آنے لگی۔

”عجیب بات نہیں کرتے آج ڈرائیو کی عروش نے اسے دیکھ کر اپنی حیرت اس پر آشکار کی۔ ”بھی بھئی عجیب باتیں کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوتا۔“ عفاف نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”کیا لالہ کو نہیں بتانا کہ تم جا رہی ہو؟“ عروش کے سوال نے قدم بڑھاتی عفاف کو چونکا گئے۔

”تم بتا دینا۔ ویسے اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔“ عفاف نے بیک سے چابی لیا نکال کر قدم بڑے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”تمہاری لالہ سے لڑائی ہوئی ہے کیا؟“ عروش نے حیرت سے اس کے تیور کو دیکھا تھا۔

”نہیں تو..... میری بھلا ان سے لڑائی کیوں ہو گی؟“ عفاف نے اچھی نظر اس پر ڈالی۔

”پھر..... تم اتنی خفا کیوں ہو رہی ہو.....؟“ عروش نے پوچھا تو عفاف ٹھٹھکی گئی۔

”تم جانتی ہو میں لڑکوں سے زیادہ بے تکلفی سے بات نہیں کرتی ہوں۔ تمہارے فیصلے لالہ کی بے وجہ کی شوخی اور تکرار مجھے پسند نہیں۔“ عفاف نے صاف گوئی سے کہا۔

”میرے لالہ ایسے نہیں ہیں۔“ عروش نے مبینہ کا دفاع کیا۔

”جی بالکل ایسے نہیں ہیں۔“ عفاف کے تمسخرانہ انداز پر عروش ہنسنے لگی۔

”تمہیں لالہ کو بتانا چاہیے کہ تم جا رہی ہو۔ ورنہ وہ ناراض ہوں گے اور ویسے بھی وہ گھر کی لڑکیوں کے لیے بہت پرمٹیکٹیو ہیں۔ تمہارا اکیلے جانا انہیں اچھا نہیں لگے گا۔“ عروش باہر کی جانب بڑھتی عفاف کا ہاتھ پکڑ کر مبینہ کے کمرے کی طرف بڑھی۔ تو چاہتے

کے باوجود عفاف اپنا ہاتھ پھڑاندہ کی۔ دھتک دیے پر اندر سے آواز آئی۔ ”کون ہے.....؟“ اور اس سے پہلے کے عروش کچھ کہتی ہاتھ میں پکڑا اس کا موبائل بج اٹھا اور بنا جواب دیے وہ ذرا سائیڈ پر ہو گئی۔ اسی لمبے دروازہ کھلا..... مبینہ نیازی عفاف کو دیکھ کر ٹھٹھکیا گیا جبکہ وہ ٹپٹپٹا کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

”آگے ٹریفک دیکھو اور اپنے آپ کو ہر طرح کی صورت حال کے لیے تیار رکھو۔“ مانی نے اسے بتایا۔ وہ ایک بار پھر ڈرائیو لگ لیسن کے لیے مانی کے امراہ تھی۔

”اب گاڑی اسٹارٹ کرو..... اور یوں سمجھو تم ایسی ہو..... میں اب صرف ایک ٹینیجر ہوں جس نے تم سے لفٹ لی ہے.....“ مانی نے اسے تھوڑی سی ہدایت دی اور دوستانہ انداز میں کہا۔ دل آویز نے اسے دیکھا اور مسکرا کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

”انڈیکسٹر آن کرو، بلائینڈ اسٹاپ چیک کر کے گاڑی موو کرو۔“ دل آویز نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی طرح چاروں طرف دیکھ کر گاڑی کو موو کیا۔

”تمہارے انٹرست کیا ہیں؟“ ریڈیو فیشل لائن سے ہٹ کر کیا گیا سوال دل آویز کو چونکا گیا تھا۔

”مجھے بارش سے عشق ہے۔ مجھے باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔ موویز دیکھنا پسند ہے، سونگز سننا میری لہوٹ پیٹ ہے۔ ان سب میں اب ایک چیز کا اضافہ ہوا ہے۔“ دل آویز پر جوش لب و لہجہ کے ساتھ پوٹی مانی کو چونکا گئی۔

”وہ کیا.....؟“ اس کے خاموش ہوتے ہی مانی نے پوچھا۔

”آپ سے ڈرائیو لگ سیکھنا.....“ دل آویز نے مسکرا کر ذرا کی ذرا سر جھکا کر اسے دیکھا۔

”تمہاری اسٹیڈیز مکمل ہو گئی ہے؟“ وہ اب ایک لمبی قدرے تنگ سڑک پر ڈرائیو کر رہی تھی۔ انوں طرف گاڑیاں پارک تھیں۔ دل آویز کو تنگ

سڑک پر ڈرائیو کرتے ہوئے مشکل چبھتی آرہی تھی۔ مانی دیکھ رہا تھا لیکن وہ بولا کچھ نہیں، کوئی ہدایت، کوئی مفید اشارہ نہیں دے رہا تھا۔ وہ دیکھتا چاہتا تھا کہ وہ اس مشکل روڈ کو کیسے ہینڈل کرے گی۔

”میری ڈگری اگلے سال مکمل ہو جائے گی۔“ دل آویز ہنسنے لگی۔

”تمہاری عمر کیا ہے؟“ مانی نے پھر پوچھا۔

”اگلے مہینے ایس سال کی ہو جاؤں گی۔“ دل

آویز نے ساری توجہ روڈ کی طرف مبذول کرتے ہوئے جواب دیا۔ اب وہ ایسی جگہ پر بھی جو بہت تنگ تھی۔ دوسری طرف سے بھی گاڑیاں آرہی تھیں۔ وہ ایک ایسی جگہ رک گئی تھی جہاں سے دوسری طرف سے آنے والی گاڑی کو روکنا پڑا تھا۔ دل آویز ریورس گیر سے گاڑی کو پیچھے بھی نہیں لے جاسکتی تھی کیوں کہ اس کے پیچھے گاڑیوں کی ایک لمبی لائن لگی تھی۔ سامنے سے آنے والی گاڑی کے پیچھے بھی تین چار گاڑیاں موجود تھیں۔ ایسی صورت حال سے مکمل کنٹرول کے ساتھ گاڑی کو ٹکالنے کے لیے بہت مہارت درکار تھی۔

دل آویز کے لیے اس لمحے کچھ کنٹرول بھی محال ہو رہا تھا۔ مانی خاموش بیٹھا تھا۔ دل آویز کو ٹھنڈے پسینے آنے شروع ہو گئے۔ اس نے مانی کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا۔ مانی نے اسے دیکھا اور اگلے لمحے وہ مدد کرنے لگا۔

”اگر تم اس تنگ موڑ تک آنے سے پہلے گاڑی کو روک لیتیں تو تمہیں اتنی مشکل پیش نہ آتی۔ ٹیمپٹ میں ایسی چوینیشن پر تم ٹپل ہو.....“ مانی اپنے مخصوص انداز میں ایک بار پھر اس کو سمجھا رہا تھا۔

”اپنی توجہ روڈ کی طرف رکھنی پڑتی ہے تا کہ ہم جلد از جلد سامنے کی کسی طرح کی بھی صورت حال کو منج کر کے اس سے نکل جانے کی تدابیر کر سکیں..... بریک، بریک، بریک..... سلو ڈاؤن..... لک ایس ہینڈ..... لیکن نہیں تم..... تمہاری نظریں تو روڈ پر ہوتی ہیں لیکن دماغ غائب..... جلدی فیصلے لینے پڑتے ہیں..... کسی قسم کی تبدیلیوں کو جلد از جلد پک کرنا

پڑتا ہے۔۔۔۔۔“ دل آویز سر جھکائے بیٹھی تھی اور مانی قدر سے رعب دار آواز میں اس سے کہہ رہا تھا۔
 ”تم میرے کیریئر کی مشکل ترین اسٹوڈنٹ ہو
 دل آویز اور مجھے خود پر حیرت ہو رہی ہے کہ میں تمہیں
 کیوں نہیں سکھا پا رہا ہوں۔۔۔۔۔ میں تمہارے ساتھ اتنی
 رعایت کیوں برت رہا ہوں۔۔۔۔۔ مانی پر ایک
 جھجلاہٹ غالب آئی تھی۔

”نہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کو مجھ سے محبت ہوگئی
 ہے۔“ ایک لخت ہی دل آویز شوشی سے بولی۔ مانی
 نے خفیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اور لب بلیجھ
 لیے۔ جب کہ دل آویز شرمندہ ہو کر ایک بار پھر سر
 جھکا گئی۔

”دل آویز میں نے انسٹرکٹرن کر تمہیں
 سکھایا۔ دوست بنا کر بھی تمہیں سکھانے کی کوشش کی
 لیکن تم سنجیدگی سے سیکھنے پر آمادہ نظر نہیں آتی ہو۔
 میری انرجی اپنا پیچہ اور وقت برباد کر رہی ہو۔۔۔۔۔ اور
 یہ محبت کہاں سے آگئی؟“ مانی اس کی حرکتوں پر
 حیران ہو رہا تھا۔

دل آویز مانی کے لیے بے حد مشکل اسٹوڈنٹ
 ثابت ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ مانی وہ مانی کو ایک چیلنج تھی تو کبھی
 کسی معرکہ کی طرح اس کے سامنے ہوتی تھی۔۔۔۔۔ جو
 مانی کاظم بھی (کہ اس سے اچھی طرح ڈرائیونگ کوئی
 سکھا نہیں سکتا) تو ڈر رہی تھی۔ اور اس کو زچ بھی کر رہی
 تھی۔ ایسے میں مانی کا بھڑک جانا یقیناً ایک فطری عمل
 تھا۔

”آئی ایم سوری۔۔۔۔۔ ریلی سوری۔۔۔۔۔ شاید
 واقعی سنجیدگی سے سیکھنے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ شاید
 میں ڈرائیونگ سیکھنے کے لیے آپ کے ساتھ ہوں ہی
 نہیں۔ ڈرائیونگ تو کسی سے بھی سیکھی جاسکتی ہے۔
 کوئی بھی سکھا سکتا ہے۔ لیکن میں نے آپ کو۔۔۔۔۔“
 دل آویز نے ہنسیوں سے مانی کے جھٹکے تیوروں کو دیکھ
 کر مدغم آواز میں کہنا شروع کیا تو مانی نے اسے دیکھا
 تو اس نے اپنی بات پوری کرنے سے پہلے ہی لب
 بلیجھ لیے۔

”میں جانتا ہوں کہ ہر انسان میں سیکھنے کی
 صلاحیت مختلف ہوتی ہے۔ کوئی جلدی سیکھ لیتا ہے۔
 کسی کو وقت درکار ہوتا ہے۔ تم جلدی سیکھ سکتی ہو۔ تم
 میں، میں نے وہ شوق دیکھا ہے۔ تم صرف اس
 سنجیدگی سے سیکھنے کی کوشش نہیں کر رہی ہو۔“ مانی اس
 قدر سے نرم انداز میں اس سے مخاطب تھا۔

”لیکن میں نے آپ کو دل سنگھاسن پر مشافہ
 ہے۔ وہاں آپ کی حکمرانی چاہتی ہوں۔۔۔۔۔
 دھڑکن کو آپ کا تابع ہوتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس
 شاہراہ محبت کو آپ کے نام کی پہچان دینا چاہتی ہوں
 ہر کونے میں آپ کے نام کی راہداری چاہتی ہوں۔
 آپ کی بادشاہت چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ محبت گونجا کر
 تو ہر طرف ہمارے چرچے ہوں۔ میں ایسا چاہتی
 ہوں۔۔۔۔۔ اور چاہتی ہوں کہ آپ بھی ایسا ہی
 چاہیں۔“

”دل آویز۔۔۔۔۔“ مانی کی پکار پر وہ خیالوں کی
 دنیا سے باہر نکل۔

”کیا ہم دوست بن سکتے ہیں؟“ دل آویز نے
 اس کی طرف دیکھا۔

”صرف دوست۔۔۔۔۔“ اس کی خاموش نظروں
 میں ابھرتے سوالوں کو درگزر کرتے ہوئے وہ مزید
 بولی۔

”مطلب تم اگر کچھ سیکھ نہ سکو تو کم از کم میرے
 ضائع نہ ہوں۔ وقت کی خیر ہے، بے شک ضائع ہو
 جائے۔“ مانی نے نیم رضامندی سے مسکرا کر کہا۔

”افف یہ مسکراہٹ۔۔۔۔۔ آپ مسکرایا نہ کرو۔۔۔۔۔
 یہ مسکراہٹ ہی تو ہے جو میری محبت کو جلا جاتی ہے۔
 وہ ایک بار پھر اس کی مسکان میں کھونے لگی تھی۔ لیکن
 چند لمحوں میں ہی حواسوں میں لوٹ آئی۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ دل آویز کا وعدہ
 ہے کہ اس دوستی کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاؤں گی۔“
 اگلے پل وہ وعدہ کر رہی تھی۔ لیکن یہ بھی جانتی تھی
 کہ وہ ان وعدوں کی پابند نہ رہ سکے گی۔۔۔۔۔ جانتی تھی
 کہ اپنے جذبوں کے سامنے وہ کس قدر بے بسی سے

خبر پار رہی ہے، جانتی تھی کہ مانی کے ہمراہ وہ اپنے
 دواؤں پر کیسے بند باندھتی تھی۔ جانتی تھی کہ اس کی
 ایک مسکراہٹ۔۔۔۔۔ ہلکی سی ایک مسکراہٹ اس کی
 دھڑکنوں کو کس قدر باغی کر دیتی تھی اور اس کو کون کن
 زنجیروں سے ان کو جکڑنا پڑتا تھا۔ وہ سب جانتی
 تھی۔۔۔۔۔ لیکن پھر بھی وعدہ کر رہی تھی۔

”اوکے شکایت کا مروجہ دیا تو سزا بھی ملے گی
 اور جرمانہ بھی بھرنا پڑے گا۔“ مانی نے دوستی کے لیے
 رضامندی ظاہر کر دی۔ تو اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا
 تھا۔

”وعدہ کیا ہے تو پوری کوشش کر دوں گی کہ آپ کو
 شکایت نہ ہو۔ آئی ایم شیور اگر آپ ہنجر نہیں ایک
 دوست بن کر سکھائیں گے تو میں جلدی سیکھ جاؤں
 گی۔ ایسے ایک ڈر سارہتا ہے۔ میں سچ سیکھ نہیں
 پاتی۔ پھر آپ کو غصہ آتا ہے اور۔۔۔۔۔ مجھے پیار۔“ دل
 آویز نے آخر دو لفظ ہی دل میں ادا کیے تھے۔

”ہاہاہاہاہ۔۔۔۔۔ مانی کا گونبنا قہقہہ اس کو نظریں
 سے اٹھنے پر مجبور کر گیا۔ لیکن ایک دوستی کی ابتدا ہو چکی
 تھی۔

☆☆☆

”میں۔۔۔۔۔ میں مجھے دیر ہو رہی ہے تو اب جانا
 ہے۔ لیکن میں اپنی گاڑی لانی ہوں اس لیے
 آپ کو زحمت کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس کے یوں
 ایک دم دروازہ کھول دینے پر اپنی بوکھلاہٹ پر قابو
 پانے کی کوشش میں اس کا لٹھ مار سا انداز زمین کی
 ناعیت سے نکرایا تو وہ بے ساختہ مسکرا دیے۔ عفاف
 نے اسے دیکھا اور رخ موڑ کر قدم باہر کی جانب بڑھا
 لیے۔

”آپ اور عروش چلیں میں چابیاں لے کر آتا
 ہوں۔“ مبین نے پیچھے سے کہا۔

”لیکن مجھے صبح گاڑی کی ضرورت پڑتی
 ہے۔“ عفاف نے چلتے چلتے پھر احتجاج کیا۔

”آپ اپنی گاڑی کی چابیاں مجھے دیں۔ صبح
 آپ کی گاڑی آپ کے اپارٹمنٹ میں پہنچ جائے

گی۔“ مبین نیازی نے ہاتھ بڑھایا تو طوطا کرہا
 عفاف کو چابیاں اس کو دینی پڑیں۔ اور پھر نہ چاہتے
 ہوئے بھی عفاف کو مبین اور عروش کے ہمراہ واپس آنا
 پڑا تھا۔۔۔۔۔ مبین نے اس کے احتجاج کو اہمیت نہ دی
 تھی۔ عروش خوش تھی۔ مبین کے تاثرات وہ جانتے
 سے قاصر تھی۔ کیونکہ وہ اس کی طرف ایک نظر بھی نہ
 ڈال پا رہی تھی۔ جبکہ عفاف مسلسل پہلو بدل رہی تھی۔
 ”نجانے کب دو سال گزریں گے۔۔۔۔۔“ اس
 کے چہرے سے اس کی بے زاری انتہائی واضح تھی۔
 اور مبین کی نظریں بیک ویو پر رہے اس پر وقتاً فوقتاً پڑ
 رہی تھیں۔ وہ زیر لب بڑبڑاتی تھی۔۔۔۔۔ اور پھر اس کا
 اپارٹمنٹ آتے ہی وہ جلد از جلد گاڑی سے نکل گئی
 تھی۔

”لالہ کیا بات ہے آپ بہت مختلف لگ رہے
 ہیں آج۔۔۔۔۔“ واپسی پر عروش نے کب سے اپنے اندر
 چھپنے سوال کو بالآخر الفاظ ڈھال ہی دیا۔

”مختلف کیسے؟“ مبین نے ایک نظر اسے دیکھ
 کر دوبارہ اپنی توجہ روڈ کی جانب مرکوز کی تھی۔

”بہت عرصے کے بعد میں نے آپ کو ایسے
 بے ساختہ ہنسنے دیکھا ہے۔“ عروش نے مبین کو
 گہری نظروں سے دیکھا تھا۔

”آپ ایسے ہنسنے ہوئے ہی ایسے لگتے ہیں۔
 پہلے بھی آپ ایسے ہی تھے۔ مہما اور بابا کے بعد بھی
 آپ ہنسا کرتے تھے، ہماری دوستی بھی تھی۔ لیکن پچھلے
 تین چار سال سے نجانے آپ کو کیا ہوا ہے نہ ہماری
 دوستی ویسی رہی، نہ آپ کی ہنسی۔۔۔۔۔ درحقیقت آپ
 بہت مغرور بھی ہو گئے ہیں۔“ عروش نے مبین کو کہا تو
 اس نے لب بلیجھ کر اسے دیکھا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس بزنس کا پریشر
 ہے اس وجہ سے بانی طرف زیادہ دھیان نہیں دے پا
 رہا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ اب کے کوئی شکایت نہ
 ہو۔“ مبین کے لہجے میں ایک شرمندگی درآئی تھی اور
 افسوس بھی ہوا تھا کہ اپنی ناکامی پر اس نے اپنی میلی کو
 سزا دی ہے۔

”اچھا لالہ! آپ خفا نہ ہوں تو ایک اور بات پوچھوں؟“ عروش نے قدرے جھجکتے ہوئے اسے دیکھ کر کہا۔ تو اس نے استغناء سے نظروں سے اسے دیکھا اور دھیسے سے مسکرائے۔

”عفاف کیسی لگی آپ کو.....؟“

”ہا ہا ہا.....“ مبین نیازی کا بے ساختہ قہقہہ عروش کو شرمندہ کر گیا۔

”کیا ہوا.....؟“

”جانتا تھا یہی پوچھنے والی ہو..... ایک ملاقات سے کسی کے بارے میں کیسے کوئی رائے قائم ہو سکتی ہے؟“ مبین نیازی نے سرسری نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں یہ بھی ہے.....“ عروش خواہ مخواہ ہی شرمندہ ہوئی۔

”اچھا لالہ! گڈ ٹائٹ.....“ باقی کا پانچ دس منٹ کا سفر خاموشی سے گنا تھا۔ گاڑی پور بچ میں دھکتے ہی عروش اس کو گڈ ٹائٹ کہہ کر اندر بڑھ گئی تھی۔ جبکہ مبین نیازی تھی وہ تھک و ہیں بیٹھا رہا..... اور اپنے رویے کے بارے میں غور کرتا رہا..... اور پھر گاڑی لاک کر کے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

پچھلے ایک گھنٹے سے وہ احسن ندیم کو مسلسل کال کیے جا رہی تھی لیکن ان کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہو رہا تھا۔

”بابا جانی پلیز فون اٹھالیں.....“ عفاف اب جھنجھلائی تھی۔ اوپر سے ستم یہ تھا کہ عدی کا موبائل مسلسل بڑی مل رہا تھا۔

”سوری سوری بیٹا.....“ وہ ایک بار پھر ڈائل کرنے لگی تھی کہ احسن ندیم کی کال آ گئی۔

”بابا جانی ٹائٹ فیر۔ جان نکال دی میری..... آپ سب ٹھیک تو ہیں ناں؟“ عفاف جو چند لمحے پہلے انتہائی منتظر انداز میں دعائیں مانگے جا رہی تھی اب غصے سے کہنے لگی۔

”سوری بیٹا وہ دراصل تمہارے پیارے سے

بابا جانی کے ساتھ بہت بڑی ٹریجنڈی ہو گئی تھی۔ احسن ندیم نے اسے بتایا۔

”اللہ خیر کرے۔ کیا ہوا بابا جانی آپ ٹھیک؟“

”ہاں ناں؟“ وہ تو ٹھیک ہیں ناں؟“ ایک دم عفاف ایک بار پھر بے حد پریشان ہوئی۔

”بیٹا آج کے زمانے میں سب سے بڑی ٹریجنڈی یہی ہے کہ موبائل کا گلا گھونٹا ہوا ہو، مطلب سائنکٹ پر ہوا وہ مل نہ رہا ہو.....“ احسن ندیم قہقہہ لگا کر بیٹھے۔

”بابا جانی.....“ وہ دانت پیس کر انتہائی غصے سے فقط اتنا ہی کہہ سکی جبکہ وہ مسلسل قہقہے لگا رہے تھے۔

”تم عدی کو کال کر لیتیں ناں۔“ وہ ہنسنے لگی اپنی ہنسی روک کر بولے۔

”کیا تھا ناں، اس دفتر کا موبائل مسلسل بڑی تھا۔“ عفاف زروٹھے لہجے میں ان کو بتانے لگی تھی۔

”اور ایسی کیا ایرجنسی آ گئی تھی؟“ احسن ندیم نے اب اس کی جھنجھلاہٹ نوٹ کی تھی۔

”بابا جانی وہ میری دوست سے نا عروش..... وہ مل کے جا رہی ہے اس کو لنڈن یونیورسٹی میں ایڈمیشن ملا ہے۔ اس کی رہائش کا مسئلہ ہو رہا تھا تو میں نے کہہ دیا کہ وہ ہمارے گھر رہ سکتی ہے۔“ عفاف نے احسن ندیم کو اپنی کال کی وجہ بتائی۔

”ہاں تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ احسن ندیم نے تحمل انداز میں کہا۔

”پریشانی کی بات تو نہیں لیکن آپ کو انفارم تو کرنا تھا ناں۔“ عفاف مدہم آواز میں ساری تفصیل انہیں بتائی۔

”بے فکر ہو جاؤ۔ بیٹا یہ تمہارا گھر ہے، تمہاری سہیلیاں جب چاہیں آ سکتی ہیں۔“ احسن ندیم نے فراخ دلائی انداز میں کہا تو عفاف مسکرانے لگی۔

”بیٹا عروش کے ساتھ تم بھی آ جاؤ ناں۔“ احسن ندیم اتنا ہی انداز میں کہا۔

”بہت دل کر رہا ہے تم سے ملنے کا۔ تمہیں بھی

ایک مل جائے گی۔“ اس کی خاموشی پر احسن ندیم ایک بار پھر بولے۔

”بابا جانی میں نے آنا تھا۔ آپ سب سے ملنے کا بہت دل کر رہا ہے۔ لیکن ایک مسئلہ کی وجہ سے نہیں آ سکتی۔“

”کیا مسئلہ بیٹا؟“ جاب میں کوئی براہم ہے لیا؟“ احسن ندیم منتظرانہ انداز میں پوچھنے لگے۔

”نہیں بابا جانی جاب تو بہت اچھی ہے لیکن عروش کے انشٹیوٹ میں عروش کی جگہ انچارج سنبھالنا ہے۔ اس لیے فی الحال آنا ممکن نہیں ہے۔“ عفاف نے انہیں بتایا۔

”یہ کیا بات ہوئی بیٹا۔ وہ انشٹیوٹ کے لیے کوئی اور انتظام کرے ناں۔“ احسن ندیم نے قدرے روٹھے لہجے میں منہ بسور کر کہا۔

”ایسی بات نہیں ہے بابا جان۔ دیکھ بھال کی ادوار ہے۔ لیکن یوں سمجھیں گے ایک بھر دسے کو لیا ہوا ہے۔ بس آپ کی دعائیں چاہیے ہوں گی۔“ عفاف مسکرا کر بولی۔

”تم جیسی بیٹی کے لیے تو ماں باپ ہر وقت امیں کرتے نہیں جھکتے بیٹا۔ تم تو ہمارا فرخ ہو۔ اللہ تعالیٰ مزید کامیابیاں عطا کرے گا۔ بھروسے کو نیک بنی سے آگے بڑھاؤ گی تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ نوٹ ملے۔“ احسن ندیم نے ہمیشہ کی طرح اس کو اپنی ہونٹوں کو پاکیزہ رکھنے کا سبق دیا۔

”ان شاء اللہ بابا جانی۔“ عفاف مسکرائی۔

”عدی کہاں ہے۔“ دوسرے پل عفاف نے عدی کا پوچھا۔

”گھر ہی ہے۔ بات کرنی ہے؟“

”ہاں کروادیں۔“ اس کے کہتے ہی احسن ندیم دی کے کمرے کی جانب بڑھ گئے تھے۔

”ہائے اپو، واٹس اپ.....؟“ موبائل کان پر لگاتے ہی عدی پر جوش آواز میں بولا تو احسن ندیم نے شکیں نظروں سے اسے دیکھا۔

”سلام دینے کی روایات کیا اب ختم ہو چکی

ہے؟“ احسن ندیم بڑبڑائے عدی نے انہیں دیکھا اور کھینا سا سنس دیا۔

”السلام علیکم ایسا جان۔ کیسی ہو؟“ عدی نے جھکنے کے سے انداز میں کہا اور احسن ندیم کی طرف دیکھ کر اشارے سے ”اب ٹھیک ہے“ پوچھا تو وہ بے اختیار ہنسنے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر ہر نقل گئے۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ عفاف اس کے دل پر وہ بدلنے پر حیرت سے گویا ہوئی۔

”بابا جانی کا پچھ.....“ عدی نے اسے بتایا۔

”تو کیسے یاد آئی.....؟“ عدی نے پھر پوچھا۔

”عروش یو کے آر رہی ہے۔ اس کا لنڈن یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا ہے اور اس کی رہائش ہمارے گھر ہوگی۔ بابا جانی کو انفارم کر دیا ہے۔ لیکن تمہیں وارن کر رہی ہوں۔ عروش دس لڑکی نہیں ہے۔ اس لیے اگر تمہارے دل میں کوئی ایسی بات ہے تو فکر نہ کرو۔ میں ایک اچھے طریقے کو اپنا کر جو چاہو کرو.....“ عفاف نے بڑی بہن کا فریضہ بخوبی سمجھایا۔ عدی ہونٹوں کی طرح اس کی بات سے جا رہا تھا۔

”کتنی تو جین آ میرا اور منتظر رہا ہے، میں آپ کے اس اختار سے بہت ناراض ہوں۔“ عدی انتہائی سنجیدگی سے کہنے لگا تھا۔

”سوری، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ دوسرے پل عفاف کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

”کیا میں ایسا لگتا ہوں آپ کو؟“ وہ اچھا خاصا برا مانا چکا تھا۔

”نہیں میں تمہیں ایسا قطعاً نہیں سمجھتی۔ لیکن جس خواہش کا تم نے اظہار کیا تھا۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ کوئی غلط انداز سے سامنے آئے اور بات سننے کے بجائے بگڑ جائے۔“ عفاف اس کو تفصیل بتانے لگی۔

”او کے آپ بے فکر ہو۔ عروش کی صرف آواز پسند آتی تھی۔ ایسا کوئی غش نہیں ہوا مجھے۔ اگر می اور بابا جانی کو پسند آئی تو آگے کے مراحل طے ہو جائیں گے۔“ عدی سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”ہاں میرے خیال میں بھی یہی بہتر ہوگا۔ اس کو ایئر پورٹ سے یک کرنا پڑے گا اور ہو سکتا ہے اسے تھماری مدد کی ضرورت پڑتی رہا کرے تو ذرا خیال رکھنا۔“ عفاف کی ہدایت پر عدی نے گہرا سانس لیا۔

”اوکے..... مدد کر دیا کروں گا جب جب اسے ضرورت پڑی۔“ عدی کے حامی بھرنے پر عفاف نے مسکرا کر سانس خارج کیا۔

”شکر یہ..... عروس کے بھائی نے بابا جانی سے بات کرنی ہوگی۔ میں ان کا نمبر فارورڈ کر دوں گی تو بابا جانی سے کہنا کے کال کر لیں ان کو۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ اور کوئی حکم.....؟“

”ہاں بس اتنا ہی کافی ہے.....“ عفاف ہنس کر بولی۔

”بائے داوے..... سالے صاحب کا نام کیا ہے۔“ عدی توجہ لگاتے ہوئے پوچھنے لگا تو عفاف کو بھی اپنی ہنسی روکنا محال ہو گیا۔

”بہت بدتمیز ہو تم..... مبین نیازی۔“ اس کو تنبیہ کرتے ہوئے عفاف نے اسے نام بتایا۔

”ڈونٹ وری ایسا امپریس کریں گے کہ خود ہی اپنی بہن کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں گے۔“ عدی نے کار بھانڈ کر کہا۔

”زیادہ شوخیاں نہ مارو۔ اچھا میں اب فون رکھتی ہوں..... عروس کی سیٹ کنفرم کر کے ساری تفصیلات متج کر دوں گی۔“

”اوکے اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ.....“ عفاف نے بھی اللہ حافظ بول کر فون بند کر دیا اور دوسرے پل بجانے لگی سوچ میں گم ہو گئی۔ اب وہ مسلسل مبین نیازی کے رویے کے بارے میں سوچے جا رہی تھی..... اور ایک بار پھر اٹھ چکی تھی۔

☆☆☆☆

”تعلی کو ہاتھ پر رکھ کر مٹھی بند کر لینے سے ہاتھ تو رتھیں ہو جاتے ہیں لیکن تعلی مر جاتی ہے..... اور اگر

مٹھی بند نہ کی جائے تو تعلی اڑ جاتی ہے۔ پھر دونوں صورتوں میں اعتدال کا ہونا ضروری ہوتا ہے، کوئی بھی چیز جب اپنی حدیں چھلانگ لگتی ہے تو وہ ہستی کی جانب قدم بڑھا دیتی ہے۔“

”ہاں لیکن محبت کی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔“

پرزور لہجہ ایک ضد لیے ہوئے تھا۔

”کوئی بھی جذبہ ضرورت سے کم یا زیادہ ہو جب وہ حدود تجاوز کرنے لگے تو نقصان دہ ثابت ہوتا ہے پھر چاہے وہ جذبہ ”محبت“ ہی کیوں نہ ہو۔“

”نہرے مضبوط لہجے میں ایک لالچ نمایاں تھی۔

”آئی انجینٹ پور اوئر..... محبت میں کسی حدیں؟ محبت میں کون سی پابندیاں؟ محبت میں محاسن اس کو کڑواہٹ میں کیسے بدل سکتی ہے؟“ م۔

ج۔ ب۔ ت۔ ”محض چار حروف کو باہم کرنے سے محبت کا وجود نہیں بنتا۔ یہ حروف اپنے اندر پوری کائنات سمیٹے ہوئے ہیں۔ جب آپ اس چار حرفی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو وہاں سے واپسی کے سارے دروازے خود بخود بند ہو جاتے ہیں۔“

”پھر وہاں حدیں کیسی؟ پابندیاں کیسی؟ محبت جب ہو جاتی ہے آپ کے دل میں اتر جاتی ہے پھر وہ بھی ختم نہیں ہوتی۔ اس کی راہ کسی ہی پر خراب ہو، ان پگڈنڈیوں پر چلتے پاؤں لہو لہان ہو جائیں، کڑکٹی دھوپ میں چلنا پڑے یا صحراؤں کی تپتی ریت پر، ان جذبول کی تعلی نہ مرنی ہے نہ اڑتی ہے.....“ اس کا جوش قابل دید تھا۔

”جذبہ کی تعلی کو دیوبچ لینے سے وہ مر جاتی ہے۔ اور تعلی کھلی رکھنے سے بھی دامن مقدر بن جاتے ہیں۔“ ایک مخصوص ٹھہرا ہوا، فسوں خیز انداز اس کی سماعت سے ٹکرایا۔

”نہیں ایسا نہیں ہوتا۔“ وہ زیر لب بولی۔

”جذبے بھی حد بندی کے محتاج ہوتے ہیں۔ وہاں بھی..... جذبول کی دنیا میں بھی حدود کا نظام چلتا ہے..... جہاں پر بندنوں کا سمجھو سمجھو کچھ بہہ گیا۔“

”لیکن..... محبت میں واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا.....“ اس کے انداز میں اب ایک جھنجھلاہٹ

آئی تھی۔

”جب جذبے اپنی حدیں پار کرنے لگتے ہیں تو ان کے حصے میں سوائے خسارے کے اور کچھ نہیں آتا..... کوئی بھی جذبہ ضرورت سے کم ہو یا حد سے زیادہ، وہ ڈمگمانے لگتا ہے۔ پھر چاہے وہ جذبہ محبت ہو، بھگائی..... یا پھر نفرت یا لالچ..... جب اس کا توازن کھو جائے تو جذبول کی تعلی پھڑ پھڑا کر دم توڑ دیتی ہے یا پھر اڑ جاتی ہے اور ہاتھ آتے ہیں تو خسارے..... پچھتاوے اور..... رت چلے۔“ وہی دلکش انداز، وہی دلربا لہجہ وہ چاہنے کے باوجود کسی بات سے اختلاف نہ کر سکی۔

”ایسا نہیں ہو سکتا..... نہیں ہونا چاہیے.....“ وہ پھر متنہائی۔

”دل آویز..... تم بہت جذباتی ہو۔ اس لیے تمہیں لگتا ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن حقیقت یہی ہے۔ آگے راؤنڈ ہاؤٹ ہے تو ذرا دھیان رکھنا۔“

”مائی اب ایک ڈرائیونگ انسٹرکٹر نہیں، ایک دوست کی طرح اس کے ساتھ تھا۔ اور زیر بحث محبت تھی۔ جذبے تھے۔ دل آویز کی اپنی دلیلیں، مائی کی اپنی سوچ..... جس سے دل آویز کو اختلاف تھا۔ لیکن اس کا انداز، اس کے الفاظ، اس کا لہجہ ایسا سحر انگیز تھا کہ دل آویز اس کی کبھی ہر اک بات، ہر اک دلیل سے اختلاف رکھنے کے باوجود خاموش ہو گئی۔ اور اب دھیان ڈرائیونگ کی طرف تھا۔

”روڈ سائن اس لیے ہوتے ہیں تاکہ ان کو پڑھا جائے، ان پر لکھی گئی ہدایات ہمارے لیے ہوتی ہیں کہ ہم راستہ نہ بھول جائیں، ایک سائن مں ہو گیا تو میلوں کے فاصلے درمیان میں آ جاتے ہیں۔“

گھبراہٹ میں دل آویز نے غلط طرف گاڑی موڑ دی تھی۔ اور اب جو رستہ پانچ منٹ میں طے ہونا تھا وہ گھٹنے میں ہوتا۔ اب اس کو واپسی کے لیے ایک دوسرے روٹ کا سہارا لینا تھا۔ مائی ایک بار پھر گاڑی کا سارا کنٹرول سنبھالنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اور دل آویز ایک بار پھر اس کی قربت میں خود کو سنبھالنے میں

لگی تھی۔

”ویسے تم نے آج ڈرائیونگ اچھی کی ہے۔“

بالا خروہ نارل ڈرائیونگ میں لوٹ آئی تھی اور اب وہ سیدھے رستے پر عمل اپنے بل بوتے پر ڈرائیونگ کر رہی تھی۔

”آپ ایک دوست بن کر سکھائیں گے تو میں جلدی سیکھ جاؤں گی۔“ دل آویز اپنی مخصوص چٹکتی آواز میں بولی۔

”اب تمہیں زیادہ پریکٹس راؤنڈ ہاؤٹ میں کرنی ہے۔ مینورز بھی تقریباً سارے کور ہو چکے ہیں۔ لیکن پھر بھی اور پریکٹس کی ضرورت ہے۔“ مائی نے ایک بار پھر کہا۔ اب دل آویز مکمل خاموش تھی۔

ایک دو بار مائی کو بریک پڈل پریس کرنا پڑا تھا۔ لیکن بولا کچھ نہیں..... دل آویز کچھ دیر پہلے محبت کی حدود کی ویلیوں کو فراموش کیے نہ صرف گاڑی کو آگے بڑھا رہی تھی بلکہ مائی کے لیے اپنے دل میں محبت کے گہرے کو بھی ہائی لیول پر لے کر جا رہی تھی۔

”لیکن محبت تو محبت ہے نا؟ اس میں حدیں کیسی؟ عمروں کا حساب کیا؟“ وہ زیر لب بڑبڑاتی..... اور مسکراتی نظروں سے مائی کو دیکھا۔ وہ متوجہ نہ تھا لیکن سب خبر بھی اسے۔

”اسپیڈ پر دھیان دو..... آگے ٹریفک لائنس ہیں۔“ اس کی طرف دیکھے بنا وہ جانتا تھا کہ اس کا دھیان کہاں ہے۔

”اوکے باس.....“ وہ ایک بار پھر کھلکھلائی..... تو مائی بھی مسکرا دیا..... بے اختیار..... بلا ارادہ۔

”کیا محبت عمروں کے فرق کی پابند ہوتی ہے؟“

”تم ہمیشہ محبت پر کیوں بات کرتی ہو.....؟“ مائی نے اس کے پر جوش انداز کو دیکھ کر پوچھا۔

”سوال کے جواب میں سوال کرنا اصولاً جرم ہے اور اس کی سزا بھی ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ ہماری غٹی غٹی دوستی ہے اس لیے یہ پہلا جرم معاف.....“ اس کے انداز میں شوخیاں چھیں۔ شرارت تھی اور شاید بے پناہ

محبت بھی۔ مانی نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرایا تھا۔

”واہ! تم تو بہت ہی محبتی ہو۔“

”ایسی دلیکی..... ایسی تو آپ مجھے جانتے ہی کہاں ہو.....“ دل آویز، شاہانہ انداز میں گیسر بدلتے ہوئے بولی۔

”دھیان سے، دھیان سے..... سائیکل سوار ہے۔“ دل آویز ہوا نہ ڈانٹ گاڑی کو سائیکل لائن کی طرف لے گئی تھی۔ اس نے بائیں طرف کا شیشہ نہیں دیکھا۔ اور یک لخت آگے والی گاڑی نے پریک لگائی تو اسے بھی ایمر جیسی پریک لگائی پڑی جس کی وجہ سے سائیکل سوار لڑکھڑا کر بمشکل سنبھلا تھا۔

مانی نے تیزی سے کہا۔ تو دل آویز جو پچھلے چالیس منٹس سے آرام سے ڈرائیو کر رہی تھی ایک بار پھر مانی کے بل بوتے ہوئی۔ دل آویز کی ایک کمزوری تھی۔ اگر اس کو ایک غلطی پر توجہ کی جاتی تو وہ پھر غلطیوں پر غلطیاں کیے ہی جاتی ہے۔ ٹوک دینا اور وہ بھی قدرے سخت تلخ ہے میں اس کے اعتماد کو صفر پر لے جاتا تھا۔ اور مانی اس کی اس کمزوری سے واقف تھا۔ اگر اس بل مانی ٹوکنا نہ تو نہ سائیکل سوار لڑکھڑاتا نہ دل آویز کا اعتماد ڈگمگاتا۔ لیکن اس لئے یہ ضروری تھا۔ محبت سے بچنا ضروری تھا۔ اس کے سوال کو یوں ہی درگزر کرنا ممکن نہ تھا..... تو ایک چال تو چلتی ہی تھی..... اور وہ بے جنگ میں تو سب جائز ہوتا ہے ناں..... مانی نے دل آویز کے گھبرائے تاثرات کو دیکھ کر لب بھینچ کر مسکراہٹ روکی اور اب وہ اس کو حوصلہ دے رہا تھا۔ اس کا اعتماد بحال کر رہا تھا..... اپنے مخصوص انداز میں اپنے دلکش و دلنشین لب و لہجے میں..... اور دل آویز..... محبت تو محبت ہے، محبت میں حساب کیسا؟ عمروں کا تضاد کیسا؟ محبت تو محبت ہے..... کی رٹ لگاتے اس سے ”ڈرائیونگ“ سیکھنے لگی تھی۔

☆☆☆

”پلیز اسٹاپ دس نان سینس..... میں انٹر سٹڈ نہیں ہوں۔“

”میں کوئی آوارہ قسم کا لڑکا نہیں ہوں۔ اچھے

خاندان سے ہوں، دہلی ایجوکیٹڈ ہوں۔ محبت کوئی جرم نہیں ہے۔ اور کسی کا اچھا لگ جانا اپنے اختیار میں نہیں ہوتا.....“ وقتاً فوقتاً میجر کے بعد آج وہ ایک بار پھر اس کے سامنے تھی۔

”لیکن کسی کو محبت کے لیے مجبور کرنا، زچ کرنا ایک جرم ہے۔“ وہ جھجھلائی تھی۔ ایک تو پہلے ہی اس کے وقت بے وقت میجر سے ٹک تھی۔ اب یک دم محبت.....

”محبت کے بدلے محبت کی خواہش کرنا جرم نہیں ہے۔“ وہ اپنی بات پر ڈٹ چکا تھا۔ جو بات وہ پہلے ڈھکے چھپے الفاظ میں کہتا رہا تھا اب دو ٹوک انداز میں کہہ رہا تھا۔

”لیکن اگر دوسرے کے دل میں ایسی خواہش نہ ہو تو اس کو مجبور کرنا ٹک کرنا جرم ہے۔ پلیز ڈونٹ فالو می..... یہاں مت آیا کریں۔ محبت یک طرفہ فیصلہ نہیں ہوتا۔ ایک عہد ہوتا ہے جو دو دلوں کو باندھتا ہے۔ ایک اقرار ہوتا ہے جو ہاتھ بٹھایا جاتا ہے۔ دو دلوں کی دھڑکنوں کو ملانے کا نام محبت ہوتا ہے..... محبت زبردستی کے سودے نہیں ہوتے مسٹر سین۔ پلیز! آپ یہ راگ الاپنا بند کر دیں۔“ دل آویز کا لہجہ انتہائی ترش تھا، انداز میں ایک کاٹ تھی۔ لیکن مبین نیازی میں ایک اور گن بھی تھا کہ وہ جب تک ہار نہیں مانتا تھا جب تک امید کی ساری شمعیں بجھ نہ جائیں۔

”محبت میرے لیے کمپلری سبجیکٹ کبھی بھی نہیں رہی۔ میں نے ہمیشہ انڈر سٹینڈنگ کو اہمیت دی ہے اور پہلی نظر ایک طرفہ محبت..... مبین نیازی کا انداز نہیں تھا..... بھینکتی شام میں میری زندگی میں تمہاری آمد نے میرے سارے اصول توڑ دیے۔ میں محبت میں کبھی بھی جلد بازی کا قائل نہیں تھا۔ لیکن دل آویز تم نے محو میں فیصلہ کروا دیا..... کہ مبین نیازی کو پہلی نظر میں جو ہوا ہے..... وہ محبت ہے۔“ مبین نیازی نے ایک نظر اس کو دیکھ کر انتہائی گھبرائے لہجے میں ایک وار کیا تھا۔ دل آویز نے حیرانی سے اسے

دیکھا۔ ایک پل میں اس نے ”آپ سے تم“ کا فاصلہ منہ دیا تھا۔ جوں آویز کو انتہائی ناگوار گزر رہا تھا۔

”نان سینس.....“ دل آویز نے رخ موڑ کر زیر لب کہا۔

”کیا میرے چہرے سے لگتا ہے کہ میں محبت کے نام پر فراڈ کروں گا؟“ مبین نیازی اس کے مقابل آکھڑا ہوا تھا۔

”مجھے چہرے پر عین نہیں آتے.....“ دل آویز نے اسکا ہٹ بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”محبت پر یقین نہ رکھنے کے باوجود میں ایک بات پورے دھوکے سے کہہ سکتا ہوں دل آویز کہ مجھے تم سے محبت ہے۔“ مبین نیازی کا یوں سر راہ دو ٹوک اقرار، دل آویز کو انتہائی ناگوار گزر رہا تھا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔

”مسٹر مبین..... مجھے آپ کی اس بے یقین محبت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ پلیز آپ میرے راستے میں نہ آیا کریں۔“ دل آویز اب بیچ معنوں میں عاجز آ چکی تھی۔ اور اس لئے کو کوس رہی تھی جب اس سے لفٹ لی تھی۔ جب انتہائی بے اختیاری میں اس کو اپنا نمبر دے دیا تھا۔ مبین نیازی نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔

”میری محبت بے یقینی کی پلیٹ میں نہیں ہے۔ اگر مجھے دلی بھر بھی شک ہوتا تو اس بل یہاں نہ ہوتا..... خیر میرے لیے اپنے جذباتوں پر بھروسہ اور صداقت میرے نزدیک محبت کا اصول ہے۔ محبت غیر مشروط ہوتی ہے..... اور میں محبت میں سودے بازی کا قائل ہوں بھی نہیں۔ میں محبت کے بدلے محبت کا قائل نہیں محبت میں سچائی میری اولین ترجیح ہے۔“

”آئی ایم سوری مسٹر مبین..... شاید آپ کی محبت میرے لیے نہیں ہے۔ مجھے دل توڑنے سے ڈر لگتا ہے..... نوٹے دل کی آد سے خوف آتا ہے..... اگر میرے بس میں ہوتا تو میں.....“

”میں محبت میں سودے بازی کا قائل نہیں ہوں۔“ اس کی آواز میں کچھ ایسا تاثر ضرور تھا کہ مبین اپنے الفاظ دہرانے پر مجبور ہو گیا۔

”نہ میرا دل ٹوٹا ہے نہ کوئی آہ نکلی ہے۔“ مبین مزید گویا ہوا تو دل آویز نے متغیر نظروں سے اس کے پرسکون چہرے کو دیکھا۔

”سی یوسون.....“ مبین نیازی اس کی حیرت کو نظر انداز کرتا وہاں سے ہٹا تھا۔

”مجھے خوش ہوگی اگر آپ دوبارہ میرے رستے میں نہ آئیں تو.....“ اس کے بڑھتے قدم بل بھر رکے۔ ایک نظر اسے دیکھا اور گہری مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا اور وہ دوبارہ پلٹ گیا۔

”شکر ہے جان چھوٹی.....“ دل آویز بڑبڑائی اور چلتی ہوئی اپنے گھر کی جانب بڑھ گئی۔

”یہ وعدہ میں نہیں کر سکتا..... دل آویز..... یہ محبت..... میرے بس میں نہیں۔“ مبین نیازی نے پلٹ کر دیکھا تو وہ جا چکی تھی۔

☆☆☆

”اسلام علیکم..... مبین نیازی بات کر رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے کال ریسو کر کے ہی مبین نے انتہائی محتاط اور پرہیزی سے اپنا تعارف کروایا۔

”علیکم السلام..... میں عدی بول رہا ہوں۔ کیسے ہیں مبین بھائی۔“ عدی نے بھی اپنے مخصوص دوستانہ انداز میں اپنا تعارف کروایا اور ساتھ ہی اس کا حال بھی پوچھا۔

”الحمد للہ..... کرم ہے اللہ کا۔ آپ لوگ سب کیسے ہیں۔ سوری کچھ مصروفیت کی وجہ سے کال کس ہو گئی تھی۔“

”کوئی بات نہیں۔ آپ نے آپ کی کال کا بتایا تھا تو بابا جانی کہنے لگے کہ وہ خود ہی کال کر کے آپ کی ابھن دور کر دیں گے۔ اس لیے آپ کے ٹائم کا اندازہ نہ تھا لیکن..... اسٹ ڈنٹ مسٹر مبین بھائی۔ ہم نے آپ کی معذرت قبول کر لی ہے اب آپ بھی سب بھول بھال کر ہمیں خدمت کا موقع دیں۔“ عدی نے ہنستے ہوئے کہا تو مبین بھی مسکرانے لگا۔

”واہ یا تم تو ہم مزاح لگتے ہو.....“ مبین نے

مکراتے لہجے میں کہا۔

”ہم مزاج؟ آپ کا.....؟“ عذی نے انتہائی حیرت سے اس سے استفسار کیا۔

”کیا تمہیں میری خوش مزاجی پر شک ہے؟“

”میں پھر گویا ہوا۔“

”آپ نے کہا تھا آپ بہت..... سنجیدہ مزاج انسان ہیں.....“ عذی کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ

میں کو یقین نہ آیا۔

”اچھا، اپنے بابا جانی سے بات کرو دادو..... لیکن پہلے نام بتاؤ ان کا۔“ میں نیازی کے دل ہی دل میں عفاف کو حتمی نظروں سے دیکھا تھا۔

”اسن ندیم..... اور یہ کیس بات کریں۔“

”اسلام علیکم بیٹا! کیسے ہیں؟“ اسن ندیم نے

موبائل کان سے لگاتے ہی پر جوش لہجے میں کہا۔

”وعلیکم اسلام، الحمد للہ آپ سنائیں کیسے ہیں؟“ میں نیازی اب مکمل طور پر سنجیدہ روپ

دھار چکا تھا۔

”جی بیٹا میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ سناؤ عروش بیٹی کیسی ہے اور میری عفاف کیسی ہے؟“

اسن ندیم نے عروش اور عفاف دونوں کا ایک ساتھ

پوچھا۔

”جی انکل دونوں ٹھیک ہیں۔“ میں نیازی نے گہرا سانس لیا۔

”بیٹا عفاف نے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ عروش کی رہائش کے لیے بالکل بھی فکر مند نہ ہو۔ یہ اس کا اپنا گھر ہے اور اب بالکل بے فکر ہو کر اسے

تھیجو۔ ان شاء اللہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“ اسن ندیم نے ایک ذمہ دار انسان کا فرض بخوبی ادا کیا۔

”بہت شکریہ انکل۔ یہی دفعہ اگلی جارہی ہے اس لیے ذرا فکر ہو رہی ہے۔“ میں نیازی ان سے

امپر لیں ہوئے تھے۔ ان کا اخلاق، لب و لہجہ واقعی

پر خلوص تھا۔

”بیٹا! بالکل فکر نہ کرو۔ ہم یہی سمجھیں گے بلکہ

جج بھی یہی ہے عفاف کی کمی پوری ہو جائے گی۔“

اسن ندیم کے لہجے سے صاف چا چل رہا تھا کہ وہ عفاف کو کتنا یاد کر رہے ہیں۔

”بہت شکریہ انکل۔ آپ نے میری آدمی ٹینشن دور کر دی ہے۔ عروش کی ٹکٹ آج کفرم ہو

جائے گی تو آپ کو اطلاع دے دوں گا۔ تھوڑی نادان ہے اور لاڈلی بھی اگر کوئی کوتاہی سرزد ہو جائے اس

سے تو درگزر کر دیجیے گا۔“ میں نے لہجے میں بہن کے لیے فکر اور پیار نے اسن ندیم کو اس کا گرویدہ کر دیا۔

”بیٹا! میں نے کہا تھا یہ اس کا اپنا گھر ہے اور بیٹیاں باپ کے گھر کو تباہیاں نہیں کریں گی

تو کہاں کریں گی؟ بے فکر ہو.....“ اسن ندیم دیسے بھی نہایت شفیق انسان تھے اور پھر عفاف کی وجہ سے

بھی ان کو ہر پہلو کا دھیان رکھنا تھا۔

”آپ کا بڑا بھائی ہے انکل۔ ان شاء اللہ اب رابطہ رہے گا۔“ میں حج معنوں میں ان کی خلوص نیت

سے قائل ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے بیٹا! عفاف کو بھی کہا ہے کہ آجائے لیکن..... بہر حال بیٹا..... اپنا خیال رکھنا اور

بے فکر ہو کر عروش کو بھیجو.....“ اسن ندیم کچھ کہتے کہتے

رکے تو میں ٹھیک کر رہ گیا۔

”اللہ حافظ.....“

”اللہ نگہبان بیٹا.....“ ریکی کلمات کے بعد فون

بند ہو گیا لیکن میں کسی سوچ میں کم ہو گیا۔

☆☆☆

”دادو کہاں ہیں آپ؟“ عروش نے سفینہ کے کمرے میں جھانکا لیکن وہ اس کو کہیں دکھائی نہ دیں تو

ان کو آواز دے کر وہ پوچھنے لگی۔

”ہاں بیٹا میں یہاں ہی ہوں۔“ سفینہ اپنے کمرے میں بے اسٹور روم سے مخاطب ہوئیں۔ تو

عروش اب اندر بڑھ گئی۔

”کیا بات ہے؟“ سفینہ ہاتھ میں کپڑوں کا

ڈھیر اٹھا آگے بڑھتے اس سے پوچھنے لگی۔

”دادو لالہ نے بتایا تھا کہ میری سیٹ کفرم ہو

گئی ہے۔ اب دل کو کچھ ہورہا ہے۔“ عروش ان کے

پاس آکھڑی ہوئی اور منہ بسور کر بولی۔

”چڑا جتنا دل ہے لیکن خواہش، باز کی پرواز کی۔“

سفینہ نے محبت باش نظروں سے اسے دیکھا۔

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے دادو..... مجھے تو آپ اور لالہ کی فکر ہو رہی ہے۔“ عروش دلا رے ان سے

لپٹتے ہوئے بولی۔

”کیوں ہم کوئی دودھ پیتے پیتے ہیں کیا؟“

سفینہ نے معنوی خطی سے اسے گھورا۔

”آپ دودھ پیتے پیتے نہیں لیکن میں تو ہوں ناں.....“ عروش نے جھپٹے ہوئے کہا۔

”اچھا دادو ایک بات میرے ذہن میں کافی عرصے سے پھل چا رہی ہے لیکن میں نے ہمیشہ دبا

کے رکھی۔“ عروش نے تمہید باندھی تو سفینہ نے قدرے جراتی سے آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھا۔

”کیا آپ کو کہیں لگتا کہ“ میں مینشن“ کو ایک

بہو کی ضرورت ہے۔“ عروش نے پر جوش انداز میں

کہا۔

”آپ بھی اب بوڑھی ہو چکی ہیں اور میں بھی آج تو پڑھیں جارہی ہوں کل کلاں کو پیادیں بھی جانا

پڑ سکتا ہے تو کون ہوگا جو سنبھالے گا یہ سب.....؟“

عروش نے ان کو پھینٹے ہوئے کہا۔

”پہلی بات کے بڑھی ہو گی تیری دادی..... میں تو ابھی جوان ہوں.....“ سفینہ نے

ایک خاص ادا سے کہا تو عروش ہلکھلا کر ہنس دی۔

”ہاں بہو کی تو شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ لیکن تمہارا لالہ، بہو کے ذکر پر ایسے بدکتا ہے جیسے خدا

نا خواست اس کے کل کے منصوبے بنانے کی بات کی ہو۔“ سفینہ نے منہ بنا کر اسے بتایا۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ لالہ کی تو

عادت ہی ایسی ہے۔ لیکن اب ہمیں کوئی قدم اٹھانا ہو

گا۔“ عروش نے سفینہ کی طرف دیکھ کر زمین کی طرف

داری بھی کی اور اپنا ارادہ بھی ظاہر کیا۔

”دادو آپ کی نظر میں کوئی لڑکی ہے کیا؟“

عروش نے سفینہ سے پوچھا۔

”نظر میں تو نہیں لیکن ایک لڑکی مجھے اچھی ضرور لگی ہے۔“ سفینہ نے جھپٹتے ہوئے کہا۔

”کون؟“ عروش نے ایرود چکا کر انہیں دیکھا۔

”عفاف.....“ سفینہ نے مدھم آواز میں کہا۔

”واہ..... واہ، دادو..... زبردست دل کی بات اور منہ کے الفاظ جھین لیے آپ نے..... میرا بھی یہی

ارادہ ہے کہ عفاف کو اپنی بھابھی بنالوں۔“

”ہاں لیکن میں راضی ہو، تب ناں..... اور عفاف؟ کیا وہ راضی ہوگی؟ کہیں اس کا رشتہ کہیں طے

نہ ہو چکا ہو۔“

”ویل اس کی ٹینشن مت لیں۔ اس کا رشتہ طے ہوا ہی نہیں ابھی اور اگر ہو بھی گیا ہوتا تو تر واد پیتے۔“

عروش آنکھ دبا کر شریر انداز میں بولی۔

”ہائے ہائے باولی ہوئی ہو کیا۔ میرے مبین کو

کیا رشتوں کی کمی ہے جو کسی کا رشتہ توڑا کر کرے..... تو

پہلے عفاف سے کفرم کر، اسے راضی کر دو پھر مبین سے

بات کرتے ہیں۔“ سفینہ نے اسے ڈپٹتے ہوئے کہا۔

”ہاں ایسے ٹھیک رہے گا۔“ عروش نے حامی

بھری۔

”اچھی ملنسار لڑکی ہے اور خوش اخلاق ہے خواہ

تو وہ کاخ نہ نہیں تو مبین کے ساتھ اچھی رہے گی۔ لڑکی

میں مبر وکل اور برداشت کافی زیادہ مقدار میں ہونا

چاہیے۔ تاکہ جب بھی ضرورت پڑے تو وہ با آسانی

استعمال کر سکے۔ یوں ہی دلوں کو جیتا جاتا ہے۔ مبر

سے اور برداشت سے۔“ سفینہ نے عفاف کی تعریف

کرتے ہوئے اسے بھی ہنست کی۔

”دادو میں تو یوں کے جارہی ہوں ناں۔ پلان

یوں ہے کہ آپ عفاف کو زیادہ سے زیادہ توجہ دیں اس

کو یہاں بلانی رہیں اور پھر موع دیکھتے ہی اس سے

بات کر لیں۔ لالہ کو راضی کرنا میرا کام..... ان کو کسی

طرح سے بلیک میل کر کے راضی کرنا پڑے گا کیونکہ وہ

ذرا میز بھی شے ہیں تو ہمیں بھی انکی میز بھی کر کے کھی

ٹکانا پڑے گا.....“ عروش نے راز ورانہ انداز میں

سفینہ کو اپنی پلاننگ سے آگاہ کیا۔ تو انہوں نے زمت

نظروں سے اسے دیکھا اور پھر ہنسنے لگیں۔
 ”دادو بی سرلیں.....“ عروش نے جیسی نظروں سے انہیں دیکھا۔
 ”زبردست پلاننگ کی ہے لیکن پکڑی گئی تو میرا نام نہ لینا۔“ مبین کیا سوچے گا کہ دادو نے اس کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔“ سفینہ اپنی ہنسی کنٹرول کرتے ہوئے مصنوعی آنسوؤں کے ساتھ بولیں۔
 ”او کم دادو! محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے..... اور آپ فکر نہ کریں ہم کبھی بھی پکڑے نہیں جائیں گے۔“ عروش نے مسکرا کر کہا اور کارل جہاز کو شوقی بگھاری اور ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اور ہاں.....“ وہ کچھ یاد آنے پر جاتے جاتے پلٹی تو سفینہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
 ”کل عفاف آرہی ہے۔ میں نے انوائٹ کیا ہے۔ میری پیکنگ میں بھی مدد کر دے گی اور ہم کھانا بھی ساتھ کھائیں گے۔“ عروش نے سفینہ کو عفاف کے آنے کا بتایا..... تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور عروش باہر نکل گئی۔

☆☆☆

اس میں جانے کیسی کشش تھی کہ اس کی طرف بڑھنے کا کھیاؤ کم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔
 ”تم ایک جھوٹے انسان ہو مبین نیازی.....“ اپنے سارے دعوؤں کو بھلا دیا۔ سارے اصول توڑ دیے..... یہاں تک کہ اپنی ”مردانگی“ بھی داؤ پر لگا دی مبین نیازی۔ وہ بھی صرف ایک لڑکی کی خاطر؟ مبین نیازی..... ابھی بھی وقت ہے یہ جی عمر والی بے وقوفیاں چھوڑ دو۔“

”بابا بابا.....“ سچی عمر کی محبت، سچی عمر کی بے وقوفیاں..... محبت چھوڑی نہیں جاسکتی اور محبت۔ سچی عمر کی بے وقوفی نہیں ہوتی۔ میری محبت سچی عمر کی پختہ محبت ہے۔“ مبین نیازی اپنے انداز میں بازو پھیلا کر فخریہ انداز میں بولا۔
 ”پختہ نہیں یک طرفہ.....“ مستحضرانہ قہقہہ نہایت پر زور تھا۔

”محبت میں پختگی ہو تو یک طرفہ محبت، دوطرفہ محبت میں بدل ہی جاتی ہے..... دیر، سویر تو ہوتی ہی رہتی ہے۔“ مبین نیازی اتر آیا تھا۔
 ”وہ جانتی ہے کہ یہ محبت میرے بس میں نہیں۔ یہ بے قراریاں..... میری پختگی سے دور ہیں۔“ وہ لب بھینچ کر شریر مسکراہٹ چہرے پر سجا کر بولا۔
 ”گھانے کا سودا ہے۔“ ایک آواز پھر ابھری۔
 ”محبت کا سودا کبھی گھانے کا سودا نہیں ہوتا۔“
 ”تو تم نے اب سودا کرنے کی ٹھان لی؟“
 حاضر جوانی پر مبین نیازی چونکا تھا۔
 ”نہیں میں..... خیر..... آئی ایم گیٹنگ لیٹ.....“ مبین نیازی نے آخری نظر اپنے سراپا پر ڈالی اور مطمئن انداز میں دیکھا۔ ڈیپ گرین کارل شرٹ، بلیک جینز، بکھرے بال، بڑی شیوہ، الجھی سبھی یہ لک مبین نیازی کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ اسی آدمی احووری تیاری کے ساتھ وہ ایک بار پھر محبت کی تلاش میں رخت سفر باندھ رہا تھا۔
 ”دل میسر اور موجود سے بہلتا نہیں کوئی تو ہو جو میری دسترس سے باہر ہو“
 وہ زیر لب بڑبڑایا اور گرین ٹینڈر گلاسز اٹھا کر پکین لی۔ جو اس لمحے اس کی پرستاشی کو مزید نکھار رہی تھیں۔
 ”مبین نیازی ایک بار پھر سوچ لو..... وہ تمہیں ٹھکرا چکی ہے۔“ ایک آواز پر اس کے قدم رک گئے۔
 ”اب سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہو چکی ہیں۔“ وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بولتا باہر نکل گیا۔
 ”سہانہ سفر اور یہ موسم..... کاش کہ حسین ہو جائے۔“ ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے گہرے بادلوں کو دیکھا اور پھر ایک خیال..... خیال محبت کے سحر میں گرفتار ہونے لگا۔ اور پھر گاڑی اٹلی روڈ کی طرف موڑ دی۔
 ”کاش ایک حسین اتفاق ہو جائے۔“ سی ڈی پلیر آن کر کے سیٹ کو ریملکس کر کے وہ سوچنے لگا۔
 ”تیری امید، تیرا انتظار کرتے ہیں

اے صنم صنم تو صرف تم سے پیار کرتے ہیں۔“
 ”ڈیوانہ.....“ وہ زیر لب بولا اور پھر اپنی اس ”ٹین اچ“ حرکت پر خود ہی ہنس دیا۔ ان ہی سوچوں میں گم وہ کارڈ رائٹر کر رہا تھا ایک بس اس کے آگے جا رہی تھی بس اسٹاپ پر رکی۔
 بس سے سواریاں اتریں اور مبین اپنی گاڑی میں بیٹھا بس کے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔
 ”حسین اتفاق.....؟ اومانی گاڈ۔“ جیسے ہی اس نے رائٹ انڈیکسٹر آن کیا اور گاڑی موڑ کرنے لگا اسی لمحے وہ بس سے باہر نکلی۔ ایک لمحہ، ایک نظر..... مبین نیازی کو زندگی کی نوید دے گیا۔ وہ امید، وہ انتظار..... ایک بل میں ہی قیمتی ہو گئے۔ اس نے انڈیکسٹر آف کر کے بس کے جانے کا انتظار کیا۔ لیکن نظریں اسی پر جمی تھیں۔
 ”ایکسیکوزی دل.....“ وہ فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔ کہ اس نے گاڑی کو روڈ کے درمیان روک کر شیشہ نیچے کر کے اس کو پکارا۔ دل آویز نے چونک کر دیکھا اور اگلے لمحے انتہائی ناگواری سے رخ موڑ کر پھر چلنے لگی۔
 ”ایکسیکوزی، ایکسیکوزی.....“ کچھ دیر میں مبین گاڑی بارک کر کے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا اور چہرے پر جھیلی دلنشین مسکراہٹ کو مزید گہرا کر کے اس کو مخاطب کرنے لگا۔ دل آویز نے اسے دیکھا۔ تو اس کی آنکھوں میں چھائی ناگواری مبین نیازی سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔
 ”میں نے کہا تھا میرے پیچھے نہ آنا۔“ وہ اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولی۔
 ”یہ محبت میرے بس میں نہیں ہے۔“ مبین نیازی کے لب و لہجے میں ایک بے بسی جھلک رہی تھی۔
 ”افف او..... نو..... ناٹ اگین۔“ دل آویز نے اسکا کر کہا۔
 ”پلیز اسٹاپ دس۔ مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آپ کی اس بے بسی محبت میں۔“ دل آویز کا دل کسی

طرح بھی نہ پہنچا۔
 ”یہ محبت بے بس نہیں ہے۔ تم ایک بار اس کے متعلق سوچو۔“ مبین نیازی کے لہجے میں ایک التجا تھی۔
 ”مجھے نہیں سوچنا.....“ وہ ایک بار پھر گھڑ کر بولی۔
 ”کیوں؟“ وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔
 ”دیکھیں مسٹر مبین۔ یہ صحیح طریقہ نہیں ہے۔ یوں سربراہ لڑکی کو روک کر اس سے اظہار محبت کرنا اور یہ توقع رکھنا کہ وہ آپ کی حوصلہ افزائی کرے۔ کیا آپ اسے صحیح سمجھ رہے ہیں؟ کیا آپ کو لگتا ہے کہ یوں میرا رستہ روک کر آپ میرے دل میں اپنے لیے کسی قسم کی کوئی احساس جگا سکتے ہیں۔“
 ”مجھے بھی آپ کی طرح یہ سب پسند نہیں ہے۔ دل میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ مبین نیازی نے تو وہ کہہ دیا جس کا اس نے خود بھی ابھی سوچا نہ تھا۔ اپنی بات ختم کر کے وہ خود بھی حیران رہ گیا۔
 ”واٹ؟ مسٹر مبین..... آپ ہوش میں ہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ اور ٹیکسٹ ٹائم اگر آپ نے میرا پیچھا کیا تو میں پولیس کو کال کروں گی۔ دیکھنے میں آپ جتنے ڈسینٹ لگتے ہیں اس سے کہیں زیادہ چھپچھوری حرکتیں ہیں آپ کی..... آج کے بعد سو فٹ کے فاصلے پر ہونا ورنہ..... ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔“
 دل آویز کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ اور مبین نیازی صحیح معنوں میں شرمسار تھا۔ وہ بنا سوچے سمجھے بولا تھا۔ اور اب خود کو، اپنی محبت کو اس کی جھنجھلاہٹ اور نفرت سے بچانا اسے انتہائی تکلیف لگ رہا تھا۔
 ”آئی ایم سوری..... دل میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ مجھے واقعی آپ اچھی لگتی ہیں۔ محبت کرتا ہوں میں آپ سے..... میں سچ کہہ رہا ہوں دل میں نے.....“

نہیں تھا۔ آپ کو دیکھتے ہی میں.....

”میں نے دل“ کہنے کا حق نہیں دیا اور اب بہتر یہی ہے کہ جاؤ یہاں سے..... دیکھ لی آپ کی محبت اور کر لیا یقین..... فارگا ڈسک۔ اب جاؤ یہاں سے اور دوبارہ نظر نہ آنا.....“ دل آویز نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ہاتھ چوڑ کر انتہائی ترش لہجے میں کہا اور اس کو یوں ہی جبرانی، تنگی کے ساتھ چھوڑ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ مبین نیازی کو پہلی نظر کی پہلی محبت کی پہلی چوٹ نے ایک دم ہی بے حال کر دیا تھا۔

”یہ محبت میرے بس میں نہیں ہے دل..... میں راستے میں نہیں آؤں گا۔ لیکن میں..... مبین نیازی اپنی محبت کی صداقت کی قسم کھاتا ہوں۔ کے انہی راستوں پر ایک دن تم میرے ہم قدم ہو گی دل..... میرے ہاتھ میں تمہارا ہاتھ ہو گا اور تمہاری دھڑکنیں میرے نام کی مالا جنیں گی۔ ہاں میں اب تمہارے سامنے نہیں آؤں گا دل لیکن تمہیں دیکھنا چھوڑ دوں یہ میرے اختیار میں نہیں..... تمہیں مانگوں نہ، میں ایسی محبت نہیں کرتا..... میں نے تمہیں ”دل“ کہا ہے دل۔ تو تمہارے بغیر جی لوں..... میں یہ ہو نہیں سکتا..... رب را کھا.....“ مبین نیازی گاڑی میں بیٹھا اس کوچنگ سینٹر کرنے لگا تھا۔

”اور ایک بات اور دل..... آخری بات..... تم میرا نمبر بلاک نہیں کر دو گی۔“ منیج بھیجنے کے بعد مبین نیازی نے ایک تاکید کرنا ضروری سمجھا اور وہاں سے چلا گیا..... وہ نہیں جانتا تھا کہ دل آویز کا کیا رد عمل تھا کیونکہ اس نے کوئی جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا..... کتنے دن یوں ہی گزر گئے..... اور پھر دن گزرتے چلے گئے..... مبین نیازی انہی راستوں پر ڈرائیو کرتا رہتا..... کبھی وہ نظر آ جاتی تو کبھی یوں ہی..... خواری مقدور ہو جاتی۔

☆☆☆

”یعنی کے حدی ہو گئی ہے۔ اب اس دن نے بھی آتا تھا۔ ایسی خواری بھی قسمت میں لکھی ہوئی تھی۔“ وہ مسلسل کوفت کا شکار تھا۔ زندگی میں پہلی بار

وہ یوں کسی کے نام کا بورڈ اٹھائے ایئر پورٹ پر کھڑا انتظار کر رہا تھا اور ”کسی“ بھی جب ایک لڑکی ہو تو عدی جیسے الیز اور بے چین روح کے مالک لڑکے کے لیے جھنجھلا باقتیاد ایک لازمی امر تھا۔ عفاف نے اس کو تنگ کرنے کے لیے عروش کی تصویر بھیجنے سے انکار کر دیا تھا۔

”بیٹا آرام سے، ذرا حوصلے سے۔“ مبین نے اس کو یوں توریوں پر چھاتے دیکھ کر بار بار صبر کی تلقین کر رہی تھیں۔

”کی اٹس رڈ کیس اسکتے ہی جانے والے ہیں جنہوں نے مجھے دیکھا ہے۔“ عدی اب غصے میں تھا۔ فلائٹ دیر سے آئی تھی اور عدی اور مبین ایئر پورٹ پر عروش کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اور یہ انتظار عدی کے لیے شرمندگی لیے ہوئے تھا۔

”کہا جی تھا آپنی سے کہ مجھے اس کی تصویر بھیج دو۔“

”بیٹا صبر سے کام لو اب۔ ابھی دس منٹ تک فلائٹ آ جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ عفاف نے عروش کو تمہاری تصویر دکھا دی ہو۔“ مبین نے اس کے جھنجھلائے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اگر ایسی ہی شرمندگی ہو رہی ہے تو وہ مجھے یہ بورڈ میں پکڑ لیتی ہوں۔“ مبین نے اس کو خاموش دیکھ کر ہاتھ بڑھایا۔

”نہیں کوئی بات نہیں اب..... اور لگتا ہے کہ فلائٹ آ چکی ہے۔“ عدی نے اناؤنس منٹ اسکرین کی طرف دیکھا جہاں پنی آئی اسے کے ساتھ اب لینڈ ڈکھا ہوا تھا۔

اگلے دس منٹ تک مسافر آنا شروع ہو گئے تھے اور اپنے اپنے پیاروں کو دیکھ کر دور سے ہاتھ ہلا رہے تھے۔ مبین نے عدی کو دیکھا جواب عروش کے نام کا بورڈ اٹھا کر تھوڑا آگے بڑھا تھا۔ مبین بھی آگے بڑھیں۔

”مبین آئی.....؟“ کچھ دیر بعد ایک لڑکی نے عدی کے ہاتھ میں پکڑے بورڈ کو نظر انداز کر کے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی اسکرین پر سے نظریں ہٹا کر مبین

کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

”عروش.....؟“ مبین نے دیکھا اور سوالیہ نظریں اس پر جمائیں۔

”جی آئی عروش نیازی۔“ عروش نے مبین کی تصویر ان کے سامنے کی۔ جو عفاف نے اسے دی تھی کہ اس کو پہچاننے میں آسانی ہوگی۔ اس ساری پہچان کے دوران عدی کا پاراہانی ہو چکا تھا۔ جو پچھلے ایک گھنٹے سے اس کے نام کا بورڈ اٹھائے کھڑا تھا لیکن اس نے تو اس کو مکمل نظر انداز کر دیا تھا۔ عدی نے دوسرے پل کا بورڈ کو پھاڑ دیا۔ تو عروش متوجہ ہوئی..... مبین نے شرمیلیں نظروں سے اسے دیکھا۔

”بیٹا یہ عدی ہے۔ عفاف کا بھائی.....“ مبین نے پھولے منہ والے عدی کا تعارف کر دیا۔ عروش نے دیکھا وہ اس لیے منہ بڑے ایک معصوم سالک کا لگا۔ عروش کے چہرے پر بڑی بے ساختہ مسکراہٹ ابھری۔ تو یک دم ہی عدی نے منہ موڑ کر گویا ناراضی کا بھرپور اظہار کیا۔

”بیٹا تم نے عدی کے ہاتھ میں بورڈ نہیں دیکھا ناں۔ بہت سے جاننے والے اس سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کس کے نام کا بورڈ اٹھا کر کھوم رہے ہو۔“ عدی مکمل خاموش تھا۔ مبین نے گاڑی میں بیٹھ کر عروش کو عدی کے خاموش رویے کی وضاحت دی۔

”اس لیے اس کا موٹی آف ہے۔“ مبین نے ہنس کر کہا تو عدی خواہ تو وہ ہی نکل ہو گیا۔

”آئی ایم سوری مبینم بوائے..... اکیچہ بائی عفی نے آئی کی تصویر دی تھی۔ میں ان کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی اس لیے اپنے نام کا بورڈ دیکھ ہی نہیں سکی۔“ عروش ہنستے ہوئے بولی۔ تو عدی نے بیک ویو مرر سے اس کو دیکھا۔ اور اگلے لمحے مکمل خاموش کر بیٹھا کہ وہ اس وقت ڈرائیونگ کر رہا ہے۔

”عدی.....“ مبین کی فلک کھاف چیخ نے پیچھے بیٹھی عروش کو کبھی لرزادیا تھا۔

☆☆☆

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں.....؟“ ہلکی سی

دستک کے بعد دروازہ کھول کر انہوں نے جھانکا تو اپنے کام میں مشغول عفاف نے چونک کر دیکھا۔

”کیا کم اتنا.....“ عالیہ اور امینہ کو انشینیوٹ میں ایڑ اے نیو پتھر جانے کے لیے بلایا تھا اور اب مبین نیازی کی طرف سے اپروکرتا تھا۔

”اسلام علیکم.....“ مبین نیازی آگے بڑھا تو با آواز بلند سلام دیا۔ عالیہ اور امینہ نے پلٹ کر دیکھا۔ تک سک سے تیار ہوا اپنے مخصوص دلربا انداز میں وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ عالیہ اور امینہ نے سٹائش بھری نظروں سے اسے دیکھ کر عفاف نے قہر آلود نظروں سے عالیہ اور امینہ کی چٹکی آنکھوں کی طرف دیکھا جن میں مبین نیازی کی محرکیز شخصیت سے متاثر ہونے کی چمک انتہائی واضح تھی۔

”گڈ آفٹرنون لیڈیز.....“ مبین نیازی عفاف کے سامنے والی جیئر کے قریب آ رکھا تھا۔ عفاف نے دل ہی دل میں دانت پیسے۔ جبکہ عالیہ اور امینہ نے مسکرا کر اس کا خیر مقدم کیا۔

”پلیز سر ہو اے سیٹ.....“ عفاف نے سیٹ انداز میں کہا تو مبین مسکرا کر جیئر کو پیچھے کھینچ کر اس پر بیٹھا اور نظریں عفاف پر جمائیں۔

”مسٹر نیازی۔ یہ عالیہ ہیں اور یہ امینہ.....“ عفاف نے تعارف کر دیا۔ تو مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا۔

”یہ دونوں میرے ساتھ روشنی فاؤنڈیشن میں کام کرتی ہیں۔“ عفاف نے مبین کی نظروں کو نظر انداز کر کے اسے بتایا تو مبین نے عالیہ اور امینہ کو باری باری دیکھا۔

”عروش انشینیوٹ کے لیے ہمیں کم از کم تین لیچرز کی ضرورت ہوگی۔ جو ایوننگ کلاسز کو ہینڈل کریں۔ تو عالیہ اور امینہ اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتی ہیں۔ یہ میننگ ان دونوں سے آپ کا تعارف کروانے کے لیے رکھی ہے۔“ عفاف نے بات ختم کی۔

”اوہو..... تو یہ میننگ ہے۔“ مبین نیازی مسکراتے لہجے میں اس سے استفسار کرنے لگا۔

”جی.....“ عفاف غلط انتہائی کہہ سکی۔

”لیکن میں تو میٹنگ کے لیے تیار کر کے آیا ہوں، میں تو سمجھا تھا کہ آپ نے مجھے چائے پر بلایا ہے۔“ مبین نیازی کی مسکراتی آنکھیں عفاف کو حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ اس نے شیشا کر پہلے مبین اور پھر عالیہ اور امینہ کو دیکھا۔ جن کے چہروں پر ابھری مسکراہٹ ظاہر کر رہی تھی کہ ان دونوں نے مبین نیازی کے اس بے تکلفی کو انجوائے کیا ہے۔

”آپ غلط سمجھے ہیں مسٹر نیازی..... اور ویسے بھی یہ کوئی ایسی میٹنگ نہیں ہے جس کے لیے آپ کو باقاعدہ نوٹس بنانے پڑتے۔“ عفاف نے تیوریاں چڑھا کر اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھا تھا۔

”پھر جی آپ کو مجھے مطلع تو کرنا چاہیے تھا۔“ وہ بھی کہاں ہار ماننے والا تھا۔ عفاف نے کن انکھیں سے اسے دیکھا اور پھر عالیہ اور امینہ کو۔ جن کی مسکراہٹ اور چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ دونوں اس کے انداز اور لب و لہجے سے بہت متاثر ہو رہی ہیں۔

”آپ دونوں مسٹر نیازی کو ساری ڈیٹیل بتا دیں۔ تاکہ ان کو بھی معلوم ہو سکے کہ کن کو جواب کے لیے منتخب کیا جائے گا۔“ اگلے لمحے عفاف اس کو نظر انداز کر کے عالیہ اور امینہ سے مخاطب ہوئی..... تو امینہ نے اپنے سامنے رکھی فائل کو مبین نیازی کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے گہرا سانس لیا اور اب سنجیدگی سے اس معاملے کو دیکھنے لگی۔

”ہاں صحیح ہے۔ ان سب کو انٹرویو کے لیے کال کر لیں۔“ مبین نیازی نے فائل میں رکھی سی وی ڈسک سے چند سی ڈسک کا انتخاب کیا اور ان تینوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ عالیہ نے منتخب شدہ سی ڈسک کو اٹھا کر الگ کیا اور فائل عفاف کی طرف بڑھادی۔

”آپ پلیز اپنی ٹائمنگ بتا دیں تاکہ انٹرویو کے لیے آسانی ہو۔“ امینہ نے مکمل پیشہ ورانہ طریقہ کار بتایا تھا۔ عفاف نے اس فائل میں رکھی سی ڈسک کو دیکھنے کی تھی۔

”آپ ایسا کریں..... جو ٹائم آپ کے لیے مناسب ہے اس میں انٹرویو ٹائم رکھ دیں۔ مجھے انفارم کر دیجیے گا۔“ مبین نیازی پر سوچ لہجے میں بولا تو عفاف نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”انٹرویو پیشل میں کون کون ہوگا۔“ عالیہ جس پر عفاف نے یہ ذمہ داری لگائی تھی۔ اس نے مبین سے پوچھا۔

”میں اور مس عفاف.....“ مبین نیازی نے عفاف کی طرف دیکھے بغیر کہا تھا۔ اس نے حیرت سے مبین کی طرف دیکھا۔ تو نہ جانے کیوں اسے لگا کہ اس کی طرف متوجہ نہ ہونے کے باوجود مبین کو معلوم ہے کہ عفاف اس پل حیرت میں ہے۔ عالیہ خاصی بد مزہ ہوئی تھی۔ امینہ نے بھی سر آدھا بھری۔

”میرے خیال میں تو آپ کا چائے پانی پوچھنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس لیے مجھے اب چلنا ہی چاہیے۔ بہت سے احوال سے کام چھوڑ کر آیا تھا۔“ انداز سراسر احسان جتانے کا سا تھا۔ عفاف کچکا کر رہ گئی۔

”جی بالکل آپ ٹھیک سمجھے.....“ عفاف بلا مروت بولی۔ تو مبین کا تہقید بلند ہوا جو عفاف کے ساتھ ساتھ امینہ اور عالیہ کو بھی چونکا گیا۔

”اوکے آپ مجھے ساری تفصیل ای میل کر دینا تو پھر ملاقات ہوگی۔“ دوسرے پل وہ کہتے ہوئے بلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا آفس سے باہر نکل گیا اور عفاف جانے کیوں اندر ہی اندر تپتا کر رہ گئی۔ جبکہ امینہ اور عالیہ ابھی تک ہونقوں کی طرف بیٹھی تھیں۔

”تم دونوں کو کیا سانپ سونگھ گیا ہے؟“ عفاف نے امینہ اور عالیہ کو گم صدمہ سمجھے دیکھا تو قدرے سنجی سے گویا ہوئی۔

”ایمنہ نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا ہائی دی۔“ ہاں اور مجھے یوں لگا وہ میرا دل چرا کر فرار ہوا ہے۔“ عالیہ نے دونوں بازو پھیل کر اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ کر یوں پوز بنایا جیسے واقعی بے جان ہو گئی ہو۔

”دفعہ دور.....“ عفاف نے دانت چیس کر کہا۔

”جد سے بے شری کی..... یوں کرو دونوں انگلیوں میں جو انگوٹھیاں پہنی ہیں اتار دو۔ دونوں اور ”سہیلیاں“ بن کر رہو..... ویسے بھی دل دماغ سے تاپید خالی وجود کو علی بھائی اور سوچ بھائی کیا کریں گے.....“ عفاف کے لہجے میں انتہائی کڑواہٹ تھی جس پر بجائے ناراض ہونے کے عالیہ اور امینہ کے قہقہے بلند ہوئے..... تو عفاف نے کئی نظروں سے انہیں دیکھا۔

”سوری یار ہم تو ایسے مذاق کر رہی تھیں۔“ امینہ نے گہرا سانس لے کر کہا۔

”ویسے تمہیں کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ.....“ عالیہ نے تفتیشی نظروں سے اسے دیکھا۔

”مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے یار۔ تم تو جانتی ہو ناں مجھے خواہ مخواہ لوگوں سے فری ہونے کا شوق نہیں ہوتا..... اور نہ ہی میں کسی کو اس بات کی اجازت دیتی ہوں کہ اپنی فضول شوخیاں مجھ پر آزمائے۔“ عفاف نے سامنے بھرے پیپر کی ترتیب سے رکھتے ہوئے کہا۔

”ویسے لگتا تو نہیں کہ خواہ مخواہ فری ہونے والا بندہ ہے۔“ عالیہ نے ایک اور کمنٹ پاس کیا۔

”کسی کے ہاتھ پر نہیں لکھا ہوتا کہ وہ کیسا ہے اور بہتر ہی ہے کہ کسی کو سوچ ہی نہ دیا جائے۔ اگر عروش کی محبت آڑے نہ آتی تو میں سمجھی بھی اس بندے کے ساتھ کسی پارٹنر شپ کی حامی نہ بھرتی۔“ عفاف سارے پیپر زرد زار میں رکھتے ہوئے بولی۔

”خیر..... تم دونوں ان سی ڈسک کو سنبھالو اور انٹرویو کے لیے کال کرو..... اور پھر مجھے ساری ڈیٹیل بتا دینا۔“ اس سے پہلے کے عالیہ یا امینہ میں سے کوئی

مزید کوئی سوال پوچھتیں عفاف نے موضوع ہی بدل دیا۔ تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا امینہ نے سی وی ڈسک اٹھائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اوکے ٹھیک ہے پھر۔“ انٹرویو کے لیے ٹائم اور ڈیٹ فائل کر کے بتائی ہوں۔“ امینہ نے فائل بیگ میں ڈال کر کہا۔

”ٹھیک یو سوچ یار۔ تم دونوں کی مدد کے بغیر میں یہ نہیں کر سکتی تھی۔“ عفاف نے تفکر آمیز نظروں سے دونوں کو دیکھا۔

”لو جی..... یہ ہوتی ہے دوستی اور ہم تو دوستی میں جان قربان کرنے والوں میں سے ہیں۔ یہ تو چیونٹی جتنا کام تھا۔ سوسیشن ٹاٹ مائی ڈیئر.....“ عالیہ کا انداز شاہانہ تھا، امینہ نے بھی مسکرا کر اس کی بات پر ”میشن ٹاٹ“ پر مہر ثبت کر دی۔ تو عفاف کی مسکراہٹ بھی گہری ہوئی۔

”لج ٹائم بھی نزدیک ہے ویسے.....“ وہ دونوں باہر نا جانب بڑھیں تو امینہ نے پلٹ کر عفاف کو دیکھا۔

”نہیں یار ابھی تو بالکل بھی بھوک نہیں ہے۔“ عفاف نے سہولت سے انکار کیا۔ تو امینہ اور عالیہ نے بھی زیادہ اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ دونوں آفس سے نکل گئیں تو عفاف نے بھی چند ضروری فائل کو سیٹ کر کے رکھا۔ تو اب احسن ندیم کو کال کرنے کا سوچ رہی تھی۔ عروش بھی یقیناً پہنچ گئی ہوگی تو وہ ساری تفصیل پوچھنا چاہ رہی تھی۔ ابھی کچھ کام باقی تھا لیکن وہ موبائل ہاتھ میں اٹھائے احسن ندیم کو کال ملانے ہی لگی تھی کہ اس کے موبائل پر رینگل ہونے لگی۔

”انٹرویو کے لیے سب کو انفارم کر دیا ہے۔ بدھ کوچ دس بجے سے چار بجے تک..... میں تمہیں ساری ڈیٹیل میٹج کر رہی ہوں.....“ عالیہ نے کال کی بابت بتایا تو عفاف نے کیلیبڈر دیکھا۔ آج تو جمعہ ہے ابھی چند دن ہیں۔

”ہاں ٹھیک ہے مجھے ساری تفصیل ای میل یا میٹج میں بھیج دو میں مبین نیازی سے کنفرم کر لوں گی۔“



سورة الانفاطار

ترجمہ:-

”جب آسمان پھٹ جائے اور جب ستارے جھڑ جائیں اور جب سمندر ابل پڑیں اور جب قبریں اکھاڑ دی جائیں۔ تب ہر شخص جان لے گا کہ کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑ آیا۔ اے انسان تجھے اپنے رب کریم کے بارے میں کس چیز نے مغرور کر دیا۔ جس نے تجھے پیدا کیا پھر تجھے ٹھیک کیا پھر تجھے برابر کیا۔ جس صورت میں چاہا تیرے اعضا کو جوڑ دیا۔ نہیں نہیں بلکہ تم جزا کو نہیں مانتے اور بے شک تم پر محافظ ہیں۔ عزت والے، اعمال لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔ بے شک نیک لوگ نعمت میں ہوں گے اور بے شک نافرمان دوزخ میں ہوں گے۔ انصاف کے دن اس میں داخل ہوں گے اور وہ اس سے کہیں جانے نہ پائیں گے اور تجھے کیا معلوم انصاف کا دن کیا ہے۔ پھر تجھے کیا معلوم کہ انصاف کا دن کیا ہے۔ جس دن کوئی کسی کے لیے کچھ بھی نہ کر سکے گا اور اس دن اللہ ہی کا حکم ہوگا۔ (آیت ۱ سے ۱۹)

عظیم خیانت

حضرت ابو مالک اشجعی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ عظیم خیانت زمین کے گز میں خیانت ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ دو آدمی ایک زمین یا ایک گھر میں پڑوسی ہیں لیکن پھر بھی ان میں سے ایک اپنے ساتھی کے جھسے

میں سے ایک گز ظلم لے لیتا ہے، ایسا کرنے والے کو قیامت کے دن ساتویں زمینوں سے اس حصہ کا طوق بنا کر گلے میں پہنایا گا۔“ 23283 (مسند احمد بن حنبل)

نجات حاصل کرنے کا گھر

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ.....
”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نجات حاصل کرنے کا گھر کیا ہے؟“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
”اپنی زبان پر قابو رکھو اور اپنے گناہوں پر اللہ کے حضور میں رویا کرو۔“ (جامع ترمذی)

سعد یہ وحید سعدی..... اسلام آباد

بات تیز سے اور اعتراض دلیل سے کرو کیونکہ زبان تو حیوانوں کے منہ میں بھی ہوتی ہے مگر وہ علم اور سلیقے سے محروم ہوتے ہیں۔
دنیا میں رہنے کے لیے دو گناہیں سب سے زیادہ بہترین ہیں۔ کسی کے دل میں یا کسی کی دعاؤں میں۔
اپنوں کو ہمیشہ اپنے ہونے کا احساس دلاؤ ورنہ وقت آپ کے اپنوں کو آپ کے بنا جینا سکھادے گا۔

مجھے بہت سے ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے جو میرے مرنے پر رونے کو تیار ہوں۔ مجھے صرف ایک شخص کی ضرورت ہے جو میرے رونے پر میرے کو تیار ہو۔
نورِ شریعت، ہانیہ عمران..... سحرات

نفس کی اصلاح

ایک دن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیٹے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس آئے۔

بالوں میں کنگھی کی ہوئی تھی اور عمدہ پوشاک زیب تن تھا۔ لعش پسندی دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے بیٹے کو ڈرہ سے اتار مارا کہ وہ رونے لگے۔
حضرت حصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا کہ ”آپ نے اسے کیوں مارا؟“

آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں نے اس کو دیکھا کہ یہ خود پسندی میں مبتلا ہے، اس لیے میں نے چاہا کہ اس کے نفس کو اس کے سامنے تھپے بناؤں۔“

(لن تلقی مثل عمر ۲/۲۱۱)
عائشہ ضیاء..... منٹولی

سلطان نور الدین زنگی

یہ ہماری بد نصیبی ہے کہ غدار ہماری قوم کا لازمی حصہ بن گئے ہیں اور قوم ان سے بھی پاک نہیں ہوگی۔ مجھے صاف نظر آ رہا ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ جب غدار، قوم پر باقاعدہ حکومت کریں گے۔ دشمن کے خلاف باہمی کریں گے، بلند دعوے کریں گے۔ دشمن کو چیل دینے کے نعرے لگائیں گے مگر قوم جان نہیں سکے گی کہ ان کے حکمران دراصل ان کے اور ان کے دین کے دشمن کے ساتھ درپردہ دوستی کر چکے ہیں۔ دشمن ان ہی کو ڈھال اور ان ہی کو تکیہ بنائے گا اور ان ہی کے ہاتھوں قوم کو مروائے گا۔

ملکشن چوہدری کل..... سحرات

لیڈری

ہم لوگ زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں دلوں کی بھیک لینے جب وہ چل کے آتے ہیں دے دے کے ووٹ ہم انہیں ممبر بناتے ہیں کرسی پر بیٹھ کے وہ ہمیں بھول جاتے ہیں پھر دور ہی سے جلوہ دکھائی ہے لیڈری صدف سحرا..... کراچی

قائد اعظم کے اصول

۳۸ جب ۱۹۲۰ء میں قائد اعظم محمد علی جناح کی شادی ہوئی تو انہوں نے غسل خانہ کی تعمیر میں اس وقت کے پچاس ہزار روپے خرچ کیے مگر آپ گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے تو قائد اعظم ڈیڑھ روپے کا موزہ لینے سے انکار کر دیتے کہ مسلمان ملک کے گورنر کو اتنی ہتھی چیز نہیں پہننی چاہیے۔

۳۹ ایک دفعہ آپ گاڑی میں بیٹھیں جارہے تھے تو ایک جگہ ریوے ٹریک بند ہو گیا۔ آپ کا ڈرائیور اتر کے وہاں موجود شخص سے کہنے لگا کہ ”گورنر جنرل آئے ہیں، ٹریک کھولو۔“ مگر ہمارے عظیم لیڈر اور بانی پاکستان نے فرمایا کہ ”نہیں، اسے بند رہنے دو میں ایسی مثال قائم نہیں کرنا چاہتا جو پردو کو ل پر مبنی ہو۔“

نہلے پہ دھالا
ریٹورنٹ کے اندر ایک ٹرک ڈرائیور اکیلا بیٹھا صبح کے ناشتے میں سری پائے، چھو لے تان، جلوہ پوری اور میٹھی سی سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ تین موٹر سائیکل سوار شہری بابو اندر آ گئے اور آ کر اس سے اٹھیلیاں کرنے لگ گئے۔ ایک نے سری پائے کا پیالہ اٹھایا اور منہ سے لگا لیا۔ دوسرے نے کسی پی کی اٹلے ہاتھ سے خیالی مونچھ صاف کی۔ تیسرے نے جلوے کو ایک پوری بکے اور ڈالا اور اس کو پیٹ کر کھالیا۔ ٹرک ڈرائیور یہ سب کچھ دیکھتا رہا لیکن کچھ نہ بولا۔ اس نے آرام سے اٹھ کر کاؤنٹر پر جا کے پیسے ادا کیے اور باہر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد ویزان تین لڑکوں کے لیے چائے کے گگ دیتے میز پر گیا تو انہوں نے ویٹر سے کہا۔
”دیکھئے میں تو وہ بہت جی دار لگ رہا تھا لیکن آگے سے کچھ بولا ہی نہیں۔ بس ایویں سا کوئی مرد ہے، مہرا نہیں آیا۔“

ویٹر بولا۔ ”ڈرائیور بھی وہ بس ایویں سا ہے، ابھی

اصل اہمیت اس کے ایمان، اس کی تہذیب اور اس

☆☆

+

ام کے سلاں سے سجا کر پیس کریں۔

ڈال دیں



رُبابِ راجپوت، کی ڈائری میں تحریر
ایک خوبصورت نظم

گزرے لمحوں میں
وفاؤں کا پاس رکھیں گے
مستے ہوئے بھی
تیری ہی بیاس رکھیں گے
تیرے کو تڑپ پہ بھجاؤ دردی ہے
اپنی جوانی کی راحتیں
اپنی مشکلوں کی باتیں
سب جذلوں کی ساتیں
تیرا وجود میرا وجود ہے
تیرا قیام ہی میرا قیام ہے
تو ہے تو میرا نام ہے
پتی دیہریں غلستان ہے
تو میرا پاکستان ہے
میری داست کی بچان ہے
تو میرا پاکستان ہے

کنول شاہین، کی ڈائری میں تحریر
احمد اسلام امجد کی نظم
میرا تمام فن، میری کاوشیں، میرا ریاض
اک نا تمام گیت کے مصرعے ہیں جن کے بیچ
معنی کا ربط ہے نہ کسی قافیے کا میل
انجام جس کلمے نہ ہوا ہو، اک ایسا کلیل
میری مستاع، بس یہی جادو ہے عشق کا

سیکھ رہے ہیں کو میں نے بڑی مشکلوں کے ساتھ
لیکن یہ سحر عشق کا تحفہ عجیب ہے
کھلتا نہیں ہے مجھ کو حقیقت میں کیا ہے یہ
تقدیر کی عطا ہے یا کوئی سزا ہے یہ
کس سے کہیں اسے جاں کر یہ قصہ عجیب ہے
کہنے کو یوں تو عشق کا جادو ہے میرے پاس
پر میرے دل کے واسطے اتنا ہے اس کا پورچہ
ہے چاک بہاؤ سا، بٹا نہیں ہے یہ
لیکن آخر کے باب میں ملکا ہے اس قدر
تجھ پر اگر چلاؤں تو ملتا نہیں ہے یہ

نور العین، کی ڈائری میں تحریر
محمد صفیر پوری کی غزل
مجھے خرد رہتا ہے تیری آشنائی کا
مگر ساتھ غم بھی ہے تیری جدائی کا

بمیر میں اکیلے بن کا احساس ہوتا ہے
تیرے بن یہ حال ہے میری تنہائی کا
تمہی نے ہماری کوئی خبر نہ لی جاننا
وردن ہمیں دعویٰ تھا تیری دلربائی کا
اپنے پیار کی قید سے تم آزاد نہ کرنا
میرا بھی ارادہ نہیں رہائی کا

اصغر کو کیوں طعنہ دیتے ہو بے وفائی کا
جب تم خود سامنا نہیں کر سکتے سچائی کا

فوزیہ ثمریٹ، کی ڈائری میں تحریر

بشر مدنی کی غزل
کبھی یوں بھی آسری آنکھ میں کہ میری نظر کو خبر نہ ہو
مجھے ایک رات فواز دے کر اس کے بعد سحر نہ ہو
وہ بڑا دھیم و کریم ہے مجھے یہ صفت بھی عطا کرے
مجھے جو لے لے کی دعا کر دے وہ فاضل میری اثر نہ ہو
کبھی دن کی دھوپ میں چول کے کبھی شے کے پھول کو غم کے
راہی ساتھ ساتھ جین مدامی ختم اپنا سفر نہ ہو
میرے پاس میرے صیب آ ذرا اور دل کے قریب آ
تجھے دھڑکنوں میں بساؤں میں کہ پھرنے کا کبھی ڈرن نہ ہو

گریشا شاہ، کی ڈائری میں تحریر

ساحر لدھیانوی کی غزل
میں زندگی کا ساتھ نبھاتا چلا گیا
ہر فکر کو دھوئیں میں اڑاتا چلا گیا
بر باد یوں کا سوگ منانا فضول تھا
بر باد یوں کا جشمن منانا چلا گیا
جو مل گیا اسی کو مقدمہ سمجھ لیا
جو کھو گیا میں اس کو بھلا تا چلا گیا
غم اور خوشی میں فرق نہ محسوس ہو چلا
میں دل کو اس مقام پہ لا تا چلا گیا

عائشہ جہانگیر مرالی، کی ڈائری میں تحریر
نوشی گیلانی کی غزل
تجھ سے اب ادب محبت نہیں کی جاسکتی
خود کو اتنی بھی اذیت نہیں دی جاسکتی

جاننے ہیں کہ یقین ٹوٹ رہا ہے دل پر
پھر بھی اب ترک یہ وصفت نہیں کی جاسکتی
جس کا شہر ہے اداس میں کسی بھی موت
سانس لینے کی سہولت نہیں دی جاسکتی
روشنی کے لیے دھواڑہ کھلا رکھنا ہے
شب سے اب کوئی اجازت نہیں لی جاسکتی
عشق نے بھر کا آزار تو دے دکھا ہے
اس سے بعد کہ تو رعایت نہیں دی جاسکتی

نمرہ عاقب، کی ڈائری میں تحریر

فہم علی کی غزل
لاموشی میں غم، ستائشوں سے نوازا کبھی نہیں
اس لیے سب کچھ دیا لیکن کیا کچھ بھی نہیں
تجھ کو کیا معلوم اسے جان جہاں تیرے پیر
میرا جیون کٹ گیا اور میں جیا کچھ بھی نہیں
علم ہے ہم کو ملا اس کے سوا کچھ مانگیں
اتھکے دستِ دعا لب پہ دُعا کچھ بھی نہیں
تیری خاطر عمر بھر کا رست چکا ہم کو قبول
چاہتوں میں ایک شب کا جاگنا کچھ بھی نہیں
پیارے دکھ مجھے اب بھی ملے اس سے غلیل
دل دھڑک اٹھا میرا لیکن ہوا کچھ بھی نہیں



بشیر حسین
ابھی تک پاؤں سے چھٹی ہیں زنجیریں غلامی کی
دن آجائے آزادی کا، آزادی سہیہ آتی
بہنی خاور
میں اپنے رب سے ہوں اس بات کا سوالی
ہو قائم میرے ملک میں امن و خوش حالی
مدہ
خدا کرے کہ مری ارض پاک پہ آئے
وہ فصل گل سے اندیشہ ڈال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے، وہ کھلا رہے مریوں
یہاں خزاں کو بھی گزرنے کی مجال نہ ہو
اسی ناصر
دل سے نکلے گی نہ مر کر بھی وطن کی آغوش
میری مٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئے گی
ناظم نور
ہماری آنکھ میں جو خواب ہیں وہ سب وطن کے ہیں
یہاں جو گھر بنایا ہے وہ سب وطن کے ہیں
وطن کی آن پر قربان کرتے ہیں دل و جان بھی
ہمارے پاس جو اسباب ہیں وہ سب وطن کے ہیں
شہداء شہزاد
یہ دل یہ جان وارد و مرا وطن سوار دو
حیات جس کا نام ہے یہاں ملک کا جام ہے
یہ جام جوم کریمو، جوم تو ہے دھڑک جوم
یہ دل یہ جان وارد و مرا وطن سوار دو
سوہتم حمزہ
کاسکس کہ میرے خوابوں کو تعمیر مل جائے
جاگتی آنکھوں میں اس کی تصویر مل جائے مجھے
جو شخص مقتدر ہیں نہیں ہے میرے
وہ شخص بنا تقدیر کے مل جائے مجھے

عائشہ جاگیر مرالی
کوئی دن ایسا نہیں جس میں تو یاد نہ آیا ہو
سچ کہوں مری ہر سانس غلام ہے تیری
فرزانہ مغل
رہے گی یاد ہمیں اس کی خوش مزاجی میں
ملا جب قبی وہ خوش نہیں وہ دن گلیا
شاہزادہ گلزار
کہتے کہتے کچھ بدل دیتا ہے کیوں باقی کا رخ
کیوں خود اپنے آپ کے کبھی ساتھ وہ بچا نہیں
رسمنا اعجاز
دفا تجھ سے اسے دفا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں
صائمہ عمر
سنگ راہوں میں دھیر دھیر کہہ کر مری پر جیاں نہیں ہے
وہ آگ دل میں لگی ہے جس میں پیش ہے لیکن دھل نہیں
تہا رہے تم نے سکھادیا ہے مجھے ہر اک غم سے بیکر کرنا
غم جہاں بھی، یقین جانو، مزاں دل پر گراں نہیں ہے
عذرا ناصر
جاہوں کو بھی نہ مٹا پاؤں گا تیرا نام دل سے
مٹائے وہ لفظ جلتے ہیں، جو غلطی سے نکلے جاتے ہیں
اقطی ناصر
یوں تو نکلتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا
یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہاں میں کیا
گرشاہ
اجی تو محبت کی ہیں اتنی کہانی ہے
نوئی ہوئی کتنی ہے عہرا ہوا بانی ہے
ایک پھول کتابوں میں دم توڑ گیا ہے
کچھ یاد نہیں آتا یہ جس کی نشانی ہے

ایمان حمید
اب اندھروں میں جو ہم خوفزدہ بیٹھے ہیں
بس کیا کریں خود ہی چراغوں کو بجھائیے ہیں
نظارا طارق
مہربان ہو کے جلاو مجھے جا ہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر نہ آ سکوں
عائشہ، تحریم
دھوپ میں نکلو گھاٹوں میں شہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں کو ہشاکر دیکھو
فرحین اختر
ہوئے مذقون دیوار پر دیا تیرے والے
طلبے موج کے کھاتے تھے تو ہیں کہ گھر نکلے
نادیہ یاسر
تم بھول کر بھی یاد نہیں کرتے ہو کبھی
ہم تو تمہاری یاد میں سب کچھ بھول دیتے ہیں
اقرا
جو ملی ہے زندگی اسے گھونٹ گھونٹ بی ہیں
کبھی مری بھی لیں گے اسے دل امی اور عورتا قی نہیں
فوزیہ شریٹ
آداسیوں کی خام اندھا دلوں کا یہ سہاں
ایسی آنکھوں پر ستارے ہرگز نہ لائیں گے
رکنا سنبھال کے تم چند خوشیاں سہیہ
میں ٹوٹ کر آؤں گا پھر میری منائیں گے
لاریب انعم
باہمی رہنمائی قبول کر آ علو
توڑ ڈالو سب ہی یثریاں عید پر
انوش البند
عید کی ہر بہار دیکھو تم
عیش لیل و نہار دیکھو تم
ایک اس عید پر کیا موقوف
ایسی عیدیں ہزار دیکھو تم
کرن، ینش
جس کے ملنے کا آسہا بھی نہیں
عید ان کا خیل لائی ہے

بشیر یوسف
نہ جالے میرا تصور مٹا یا فریب نظر
ہلال عید میں بھی تم مجھے نظر کٹے
کنول شاہین
آؤ مل کر مانگیں دعا میں ہم عید کے دن
باقی رہے نہ کوئی بھی غم عید کے دن
ہر اک گن میں خوشیوں بھرا سورج ابھرے
اند بکرا تار ہے ہر اک گن عید کے دن
عظلی ولی محمد
خوب تم نے کہا حشر میں مل جائیں گے
اس قدر بھیر میں ہوتی ہے ملاقات بھلا
افضل سمیع
موسم کی مثال دوں یا تمہاری
کوئی پوچھ بیٹھا ہے بدلنا کس کو کبھوں
صدیق عمران
آئیں جو آسمانے تو محبت کا گراں ہو
نظر دل کو کھٹکے تو شکایت سی لگے ہو
ماہدینم
ایسی راہ میں کئی مرز ہیں کوئی آئے گا توئی ہالہ کا
نہیں جس نے دل سے جلا دیا ہے ہر اک لڑکلا
حاکم
محبت کا دھڑکنا ہے ہر اک لڑکلا
کہ اپنی قدر سے ہر اک لڑکلا
وہ مجھے آپ سے جدا کر لے گا
اندک اس گھر سے دگ گتا ہے
نقد نور
دوسل کو کیسے معتبر کہیں
جبر کا خوف دل پر طاری ہے
آج تو دل کی بات کہنے دو
آج کی شام تو ہماری ہے
غزوہ، اقرا
نہیں عید کو شکایت اب کسی سے
بس اپنے آپ سے دھما ہوا ہوں
بظاہر خوش ہوں لیکن سچ بتاؤں
میں اندر سے بہت ٹوٹا ہوا ہوں

بے بسی

شوہر نے پہلی بار اپنی بیوی کو بلی دہن کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا شروع کیا تو پہلے ہی نوالے سے حالت خراب ہو گئی۔ نوالہ اس کے منہ سے باہر آ گیا اور اسے الٹی آتے آتے رو گئی۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”بیگم! میں یہ کھانا ہرگز نہیں کھا سکتا۔“ مروت کے مارے، اس نے بیوی کو یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ کھانا کس قدر بد ذائقہ ہے۔

بیوی اطمینان سے بولی۔ ”کوئی بات نہیں، میں نے کھانے پکانے والی کتابوں میں یہ بھی پڑھا ہے کہ بچے ہوئے اور باسی کھانوں سے ڈشیں کیسے تیار کی جاتی ہیں۔“

یہ سن کر شوہر خوف زدہ انداز میں بے بسی سے کھانے کی طرف دوبارہ ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں..... نہیں..... ٹھیک ہے، میں یہی کھانا کھا لیتا ہوں۔“

سرت طارق..... مظفر آباد

نسخہ شادمانی

بیوی دیکھو نا! ہمارے پڑوسی نے پچاس انچ کا ایل سی ڈی، ٹی وی خریدا ہے، آپ بھی خرید لایے نا۔“

شوہر: ”ارے ڈارلنگ! جس کے پاس تمہارے جیسی خوب صورت بیوی ہو وہ کیونکر فالتو کا وقت ٹی وی دیکھنے میں برباد کرے۔“

بیوی: ”اوہ آپ بھی نا..... میں ابھی آپ کے

لیے پکوڑے بنا کر لاتی ہوں۔“

☆.....☆

بیوی: ”آپ میری سالگرہ کا دن کیسے بھول گئے؟“

شوہر: ”بھلا تمہاری سالگرہ کا دن کوئی کیسے یاد رکھے، تمہیں دیکھ کر ذرا بھی نہیں لگتا کہ تمہاری عمر بڑھ رہی ہے۔“

بیوی: آنسو صاف کرتے ہوئے..... ”رکیں، ابھی آپ کے لیے کھیر لے کر آتی ہوں۔“
حالتِ تحریم..... موجدہ

ایک سے بڑھ کر ایک

موسم بہار کا خوش گوار ترین دن تھا۔ ایک ہائی اسکول کی چار طالبات سہیلیوں نے سوچا کہ تھوڑا سا وقت سیر و تفریح میں گزارا جائے۔ سچ کے بعد وہ چاروں اسکول پہنچیں اور انہوں نے اپنی ٹیچر کو بتایا کہ اسکول آتے ہوئے ان کی کار کا ٹائر پھڑپھڑا رہا تھا جس کی وجہ سے وہ لیٹ ہو گئیں۔

”لو کیوں۔“ ٹیچر نے کہا۔ ”آج صبح پوری کلاس کا ٹیسٹ لیا گیا لیکن تم لوگ شریک نہ تھیں۔ اب تم چاروں اپنی اپنی کاپیاں اور پین نکالو اور الگ الگ بیٹھ جاؤ۔“

چاروں لڑکیاں ایک دوسرے سے دور دور بیٹھ گئیں تو ٹیچر نے کہا۔ ”اب اپنی اپنی کاپیاں سو الگ جواب لکھو کہ کار کے کس ٹائر میں پھڑپھڑا ہوا تھا۔“
ارم طاہرہ..... شندو اکرم

بیوی ہو تو ایسی

ایک صاحب کی آفس سے چھٹی ہوئی تو ان کی ملاقات ایک پرانے جگری دوست سے ہو گئی۔ چائے پینے کی غرض سے وہ دونوں ایک ریستورنٹ میں بیٹھ گئے تو باتوں میں ایسے منہمک ہوئے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہو۔

رات دس بجے جب موصوف گھر پہنچے تو بیوی کھانے کی میز پر ان کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ صاحب ”بھوک نہیں ہے“ کہہ کر گھر کے اندر چلے گئے اور اپنے بستر پر جا کر آرام سے سو گئے۔

رات ساڑھے تین بجے الارم کی آواز پر ان کی آنکھ کھل گئی، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور گھڑی دیکھی تو غصے سے آگے سے باہر ہو گئے۔ بیوی کو بھیج کر اٹھایا اور پوچھا۔ ”یہ کیا حرکت تھی؟“

”ہوں.....“ بیوی نے انتہائی سکون اور اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں نے سوچا کہ دفتر سے آنے میں آپ کو پانچ گھنٹے لگ سکتے ہیں تو اتنا ہی وقت جانے میں بھی لگے گا، اس لیے میں نے ساڑھے تین بجے کا الارم لگا دیا تاکہ آپ وقت پر آفس پہنچ جائیں۔“

منیب شمشاد..... آزاد کشمیر

بس اور رکشا

ایک لڑکے نے لڑکی کو پھیلے ہاتھ کہا۔ ”بس اور لڑکی ایک جیسی ہوتی ہے۔ ایک جالی ہے تو دوسری آ جاتی ہے۔“

”رکشا اور لڑکے ایک جیسے ہوتے ہیں، ایک کو بلاؤ تو چار چلے آتے ہیں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔
نوشاہہ اسد..... بھکرات

معیار حماقت

لندن کے نواح میں ایک نوجوان جوڑا کار میں تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ ایک جش آف پیس نے انہیں روک لیا اور موقع پر ہی ایک سو پونڈ کا جرمانہ کر دیا۔

نوجوان بولا۔ ”جناب والا! ہم تو آپ کے

پاس ہی آرہے تھے تاکہ آپ ہماری شادی کا فریضہ انجام دے دیں۔“

”پھر تو جرمانہ دو سو پونڈ ہوگا۔“ جج صاحب نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”تم تو اس سے بھی زیادہ احمق ہو، جتنا میں نے پہلے سمجھا تھا۔“

شازیہ گلزار..... بمبئی

اعتراض

ایک بچہ کافی دیر سے رو رہا تھا۔ ماں کے بار بار چپ کرانے پر بھی چپ نہ ہوا تو شوہر نے کہا۔ ”اری او ٹیک بجٹ اٹم اسے لوری دے کر سلا کیوں نہیں دیتیں؟“

بیوی نے کہا۔ ”میں نے پوری لوری سنا لی تھی، مگر پڑوس سے آواز آئی کہ اس سے بہتر ہے بچے کو رونے دو؟“

حور بن سنب

حاضر دماغی

بیوی: ”امی! میں نے ۱۱۹۲۲ سے ۱۱۹۲۱ تک ۱۱۹۲۱ دیا۔ میرا اٹھ گھنٹہ ۱۱۹۲۱ ہے۔“
شوہر نے فوراً جواب دیا۔ ”۱۱۹۲۱ سے ۱۱۹۲۰ تک ۱۱۹۲۰ کرو۔“

ایک ایسا ہاتھ اٹھ گیا کہ لڑکے کو ہاتھ پکڑ لیا۔ ”مہا۔ دیر پہلے ہی اس نے ہاتھ اٹھا کہ ساتھ ساتھ لڑکی ہتھال پکڑا ہوا ہاتھ اٹھا، اس میں دوسرا ہاتھ لگا گیا۔ لڑکی ہوتی ہی ہتھ پکڑے ہوئے ہاتھ میں لگی تھی۔

دیر صحت سے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ”دوسرے ہاتھوں کو سی این جی لگی ہوئی ہے، تیسرے کو کیوں نہیں لگائی؟“

ڈاکٹر نے سر سے بے کراؤں تک وزیر کو دیکھا اور پھر ڈرپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”سر یہ مریض پیٹرول پر چل رہا ہے۔“
کنول شاہین قصیر..... تلہ گنگ

کچھ موقوفی چہنہ ہیں

اداک

بھید

ہر دکھ، ہر عذاب کے بعد زندگی آدی پر اپنا ایک راز کھول دیتی ہے۔ بودھ گیا کی چھاؤں تلے بدھ بھی ایک دکھ بھری تپسیا سے گزرے تھے جب پیٹ پیٹھ سے لگ گیا، آنکھیں کنوئیں کی تہ میں بے نور ہوئیں اور ہڈیوں کی مالا میں بس سانس کی ڈوری اٹکی رہ گئی تو گوتم بدھ پر بھی ایک بھید کھلا تھا۔ جیسا اوز بھتا اور جس کارن آدی دکھ بھوگتا ہے ویسا ہی بھید اس پر کھلتا ہے۔ نردوان ڈھونڈنے والے کو نردوان مل جاتا ہے اور جو دنیا کی خاطر کشت اٹھاتا ہے تو دنیا اس کو راستہ دیتی چلی جاتی ہے۔ (مشتاق احمد یوسفی..... آب گم) فوزیہ شریٹ، ہانیہ عمران..... ہجرات

کڑیاں، چڑیاں

عورتیں ایک تسلسل ہیں، ایک رابطہ ہیں..... حیات اور کائنات کا، زمین اور آسمان کی اندر..... جیسے ہر دم چوں چوں کا ساز بجانے والی چڑیاں..... فقط ایک کھونسلے کے لیے ہر دم جگہ ڈھونڈتی رہتی ہیں اور اکثر غلط جگہ پر گھونسلہ بنا لیتی ہیں..... بچائیں تو بھی چلائی ہیں..... نہ بچائیں تو بھی شور مچائی ہیں۔ (بشری رحمن..... چپ)

صائمہ سحر..... فیصل آباد

برتر

برتر وہی ہے جو بے وقوف ہے جتنا بے وقوف اتنا ہی برتر! پہلے مرد عورت پر حکومت کرتا تھا۔ طاقت سے۔ اب بے وقوف یعنی برتر بنا کر حکومت کرتا ہے۔ برتر بنا کر حکومت کرنے میں اسے دیر افاکہ ہے۔ یعنی عورت پر ہری ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ وہ خود انہیں اپنے دوش بدوش کام کرنے کا موقع دیتا ہے۔ وہ

گئے چار دیواریوں والے فرائض تو عورتیں انہیں عادات انجام دیتی ہیں۔ یعنی مرد عورتوں کے دوش بدوش بچوں کو دودھ نہیں پلاتا۔ عورتوں کے دوش بدوش باورچی خانے میں جھک نہیں مارتا۔ عورتوں کے دوش بدوش گھر کی صفائی نہیں کرتا۔ بچوں کے کپڑے نہیں دھوتا۔ اس وقت وہ چنگ برائٹ کر چیمن کی ہنسی بجاتا ہے بادوستوں کو سیٹ کرتا سٹھیلنے لگتا ہے۔ عورت اسی لیے مرد سے برتر ہے کہ اس نے دہری ذمہ داریاں سمیٹ رکھی ہیں۔ (ابن صفی..... اسٹی دروازہ)

افشاں سیح..... کراچی

تباہی کی وجہ

انسانوں کی طرح ملک اور قومیں بھی ہمیشہ اپنی کمزوریوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی خوبیوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتی ہیں۔ خوبی وہ چیز ہے جس پر انسان اعتماد کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ اس کی ذات پہ اعتماد کرتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کی یہ خوبی اس کی اصلی اچھائیوں کو کھانے لگتی ہیں۔ اسی خوبی کی وجہ سے اس میں تکبر پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر اس خوبی کے باعث وہ انسانیت سے گرتے لگتا ہے۔ فرد، ملک، قومیں سب اپنی خوبی کی وجہ سے تباہ ہوتی ہے۔ (بانو قدسیہ..... راجہ گدھ)

سحر تبسم سحری..... منگل پورہ

زبان کے گھاؤ

کون کہتا ہے، انسان نے اس جدید دور میں میزائل بم اور ڈرون ایجاد کر کے جانی پھیلانی ہے۔ جتنا گہرا گھاؤ انسان کی زبان کسی انسان کے دل میں لگا سکتی ہے۔ اس کی کاٹ اور زخم کا مقابلہ، یہ نئے دور کے ہتھیار کسی صورت نہیں کر سکتے کبھی بھی میں سوچتا کہ ایلم بیٹم کے موجد کو شاید زبان کے زہر کا ٹھیک طرح سے ادراک نہیں ہوگا، ورنہ اسے دنیا برباد کرنے کے لیے ہے اتنی محنت نہ کرنا پڑتی۔ (ہاشم ندیم..... پری زاد)

فضلہ نور..... روہڑی

شاء شہزاد..... کراچی

سرور قی بن ٹھیک لگا۔ سب سے پہلے ادارہ اور ”حمہ وفت“ کو بڑھنے کا شرف بخشا۔ رخ چوہدری کا ناول ”شب نم کی سحر“ کچھ زیادہ متاثر نہیں کر رہا اب بعد میں جا کر پتا چلے گا کہانی کیسی ہوگی۔ نگہت عبد اللہ کا ”ہوا میں رخ بدل گئی“ بہت اچھا جا رہا ہے۔ خزینہ ابھی تو خوشیوں کے پنڈولے میں جھولا جھول رہی ہے مگر بعد میں غزنی اس کا پچھراہ کو دے گا تب احساس ہوگا۔ تنزیلہ ریاض کا ناول بہت بہت جا رہا ہے۔ نظیر فاطمہ نے ”سورما“ بہت اچھا لکھا۔ نادیہ احمد کا ”چھوٹی سی خطا“ پسند آیا۔ صائمہ قریشی کا ”لذت تم عشق“ ابھی نہیں پڑھا دو تین اقساط ہو جائیں پھر پڑھوں گی۔ ”الباہی، میں اور تم“ ام ایمان نے بہت شان دار لکھا اچھا سبق دیا ایسے مردوں کو جنہیں بیٹھ کر کھانے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ افسانے اس بار جھٹتے اور سب ہی تقریباً اچھے لگے ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی سبق موجود ہوتا ہے بس سمجھنے والا ہونا چاہیے۔ رائٹرز ہم تک جو بات پہنچانا چاہتی ہیں وہ ہم سمجھ جائیں تو ان کی محنت وصول ہو جاتی ہے۔ سلسلے تمام بے مثال تھے مجھ کی طور پر پورا کرنا پسند آیا۔

ع: پیاری شاعر! کرن کی ہند کی کاہ ہے۔
آپ اپنی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے بھگتے ہو۔
سے کرن کی عقل میں شریک نہ ہو۔ اللہ آپ کو
تندرستی دے آمین۔

منگل پورہ

ناٹل سو سوتا۔ ”ہوا میں رخ بدل گئی“ ناول تو ٹھیک ہے ”شب نم کی سحر“ اپنی جگہ نہیں بنایا رہا ہے۔ منگل ناول دووں ایسے دن تھے صائمہ قریشی اور ام ایمان ویل ڈن۔ ناول ”مٹم ہے یا خوشی ہے تو“ انش کا کردار میرا لیورٹ ہے۔ ویل ڈن تنزیلہ اور واپس آنے کا شکر ہے۔ ”چھوٹی سی خطا“ نادیہ کی تحریر اس دفعہ متاثر نہ کر سکی۔ ”سورما“ نظیر فاطمہ ویل ڈن۔ منگل رضا کرن میں لکھنے کا بہت شکر ہے میں آپ کی بڑی شین ہوں۔

افسانوں میں ”تیری جاہت۔ برسوں بعد۔ لغزش“ بس ٹھیک ٹھاک تھے۔ جبکہ ”ذخول سہانے۔“ تینیں تقسیم کرنی ہیں۔ ”اسے دن تھے۔“ مشکل سلسلے کرن کے تو کافی شان دار ہیں۔

میسرین



ع: پیاری سحر! ان شاء اللہ ”شب نم کی سحر“ آگے جا کر اپنی جگہ بنا لے گا۔ کرن کتاب میں پیغامات کے ذریعے اپنے چاہنے والوں تک اپنی آواز پہنچانی ہے ”مقابل ہے آئینہ“ میں آپ کے جوابات ان شاء اللہ شائع کر دیے جائیں گے۔

تبسم بشر حسین..... ذنگہ

میری ان کی مکمل صحت کے لیے دعا کریں۔ ناٹل اسے دن تھا۔ ادارہ میں آپ کے الفاظ آپ کی محبتوں کا پتا دے رہے تھے۔ حمد وفت سے روح کو ہر شار کیا تو راستے میں رمشا خان کی ان سے بیلو ہائے ہوئی۔ ”میری بھی ہے“ میں وہاں علی کی کافی عادتیں مجھ سے ملتی ملتی ہیں۔ ”مقابل ہے آئینہ“ میں صائمہ نے ایک صدی کی یاد اور پیاری کی ”شب نم کی سحر“ میں نادیہ کی اور ام سے ایک ملک کی ”ہوا میں رخ بدل گئی“ میں اس ویل ڈن کا۔

اللہ آپ کو تندرستی دے آمین۔
ع: پیاری شاعر! کرن کی ہند کی کاہ ہے۔
آپ اپنی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے بھگتے ہو۔
سے کرن کی عقل میں شریک نہ ہو۔ اللہ آپ کو
تندرستی دے آمین۔

فضلہ نور..... روہڑی

مارچ، اپریل، مئی، جون اور پھر جولائی ان پانچ مہینوں میں میرا ہر خط اللہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ گلے، شکایات بہت سے زبان یہ آئے لیکن جب کسی نہ کسی سلسلے میں اپنی شمولیت دیکھتی تو چپ

ٹاپک تھا۔ ٹائٹل ایمل جی۔ فرح بھٹو کا ”اک تیری چاہت“ اپنے نام کی طرح..... یعنی اپنے نام کی ہی عکاسی کر رہا تھا۔ اور آخر میں بات کروں گی رضوانہ اسحاق کے افسانہ ”برسوں بعد“ منفرد ٹاپک کی بنا پر بہت اچھا لگا..... مگر شکر ہے رضوانہ جی نے دونوں کو اینڈ پتہ ملا دیا.....! اور ایک افسانہ جو مجھے اچھا نہیں لگا..... مجھے شدید اختلاف ہوا اس افسانے سے وہ تھا عمارہ امداد کا ”لغزش“ ٹھیک ہے بہت اچھا موضوع تھا..... بہت اچھا لکھا مگر..... میں اتنا ضرور کہوں گی کہ جو انسان اپنے ماضی کو بھول کر..... اس پر نام اور شرمندہ ہو کر اپنی حال کی زندگی کو اچھا جی رہا ہو تو اس کے ماضی کے باعث اسے یا اس کی اولاد کو برا نہیں کہنا چاہیے.....!

ج: پیاری صاحبہ! ہمیں خوشی ہوئی کہ آپ نے اپنی مصروفیت کے باوجود کرن کے لیے وقت نکالا۔ اور اپنی رائے کا اظہار کیا۔

کرن عمران احمد..... ساہیوال

جولائی کے شمارے میں اپنا خط نہ پا کر مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں بہت ناراض ہوں۔ کرن میں ہر نئے لکھنے والے کو جگہ دی جاتی ہے۔ میں نے بہت سے خطوط اور اپنی تحاریر بھی بھیجیں مگر کوئی پذیرائی نہیں ہوئی۔ مجھے تو ایگزیکٹو ملٹی یہ بھی نہیں پتا کہ یہ آپ کو ملے بھی ہیں یا نہیں۔

ج: پیاری کرن! ہمیں آپ کا یہ پہلا خط ملا ہے اس سے پہلے کوئی خط اور تحریروں ہمیں موصول نہیں ہوئی ہے۔

نوزیہ شمر بٹ ہانیہ عمران..... گجرات

ٹائٹل پرفیکٹ لگا۔ ماڈل بے شاید آرٹیفشل تھلی ڈالی ہوئی تھی۔ لگ پیاری رہی تھی۔ کرن کے پہلے دو تین صفحے میرے فیورٹ ہیں۔ شاہین جی! بن کہے ”رمشا خان“ کا انٹرویو کر کے دل خوش کر دیا..... ”میری سنے“ میں بھی اچھی پرسنٹی سے ملاقات کروائی۔ ”آواز کی دنیا“ کو پڑھا۔ رائے یہی قائم ہوئی کہ بندہ اگر کچھ کرنا چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔ دیے ایک بات شیئر کرتی ہے کہ قسمت کا بھی گڈ لکنگ ہونا چاہیے۔ سلوٹ ایسے پرسن کو.....

سب سے پہلے ”شب نم“ کو پڑھا۔ چوتھی قسط تک تو ابھی کرداروں سے تعارف ان کی عبادات کے بارے میں پتا چل رہا ہے دیے رائٹر صلاح نے خوب پنن پکایا ہے مطلب ہر قسم کی زبان یوز کی ہے۔ انگریزی پنجابی۔ اور خالص اردو لہجہ جی

پڑھتے ہوئے بھی منہ کا جغرافیہ بہت میز ہائیز ہا ہونے لگتا ہے۔ ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ سوری خاص متاثر نہیں کر سکا۔ شاید کچھ اور آگے جا کر بہتری ہو جائے اب تک تو کوئی سرچر نہیں نظر آ رہا۔ ”لذت غم عشق میں“ ہم ابھی گوٹے گوٹے ڈوبے ہوئے (کہ آئندہ ماہ) نے سارہ مزا کر کر دیا۔

شکر ہے۔ اس ماہ کچھ مزاحیہ تحریروں بھی شامل تھیں۔ ”ابا جی میں اور تم“ بڑی خوب صورتی سے رائٹر نے اپنوں کے چہروں سے نقاب اتارنے۔ ابا جی کا کردار سائلڈ تھا۔ ناولٹ ”غم ہے یا خوشی ہے تو“ واہ کیا سین تھا۔ اب التمش کو بھی عقل آئے گی جب میڈم جی رشتے سے انکار کرے گی۔ مجھے تو غصہ ہی بہت ہے جو حرکت التمش نے کی سونیا سے کوئی ایسے بھی بے عزت کرتا ہے۔ لوجی ماسٹر جی۔ تو کنویں سے پانی پینے چلے گئے ہیں ہمیں انتظار کالالی پاپ پکڑا کر۔

”چھوٹی سی خطا“ یہ بھی ناولٹ ہلکا پھلکا رہا۔ ہاں مزاحیہ فقرے ہنسنے پر مجبور کرتے رہے۔ خاص کر پاکستانی اپیشل آئٹم (چھتر) کیا خوب کہی۔

”سورما“ بھی بیسٹ تحریر رہی۔ سوہنی جٹ کے ساتھ تو اس سے بھی برا ہونا چاہیے۔ بات ہو جائے افسانوں کی تو جناب سب اے دن تھے۔ خاص کر ”گھر وندہ“ پڑھ کر دلی دکھ ہوا۔ دل ٹوٹا کون دیکھتا ہے، زندگی تو گزر رہی جاتی ہے، پر اک بے سکونی کے ساتھ۔ مجھے تو ہیر و کا کہیں نام نظر نہیں آیا۔

”تیری چاہت“ بھی بیسٹ رہا۔ حقیقت یہی ہے جو اللہ کی رضا میں خود کو ڈھال لیتے ہیں وہی کامیاب رہتے ہیں دنیا میں اور آخرت میں بھی۔ ”لغزش“ بھی سبق آموز رہا۔ ازل سے دنیا کا یہی دستور رہا ہے، کسی کی بھول کو معاف نہیں کرتی۔ یہ لغزش حد تک چھچھا نہیں چھوڑتی۔

”برسوں بعد“ بھی دل میں چھبھی گئی۔ چلو جی برسوں بعد ہی سہی رضوانہ اسحاق نے کہانی کا اینڈ اچھا کر کے دل خوش کر دیا۔

”مجتبیٰ تقسیم کرتی ہیں“ کیا زندگی کا فلسفہ یہاں کیا گیا ہے۔ ج: نوزیہ جی! ماشاء اللہ آپ کرن کی پرانی قاری ہیں۔ اور کم و بیش ہر ماہ کرن کے سلسلوں میں شامل ہوتی ہیں اور آپ کی یہی بات ہمارے لیے فخر کا باعث ہے کہ آپ نہ صرف کرن پڑھتی بلکہ اسے بہتر سے بہتر کرنے میں اپنا حصہ بھی ڈالتی ہیں۔